تفسیر القرآن الکریم

جزء

تبارک ۲۹ و عمّ ۳۰

تالیف

فضیلۃ الاستاذ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

تفسیر القرآن الکریم

جزء تبارک ۲۹ و عمّ ۳۰

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ
قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی
اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰہَ
یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ أَقْوَامًا وَ
یَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ

(صحیح مسلم/۸۱۷)

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ساتھ بہت سی اقوام کو بلندیاں عطا فرماتا ہے اور اس کی وجہ سے کچھ دوسری اقوام کو پستیوں میں دھکیل دیتا ہے۔''

مکتبہ دارالاندلس
مرکز ام القری طیبہ روڈ، جی ٹی روڈ گوجرانوالہ
Ph:055-4277700, 4000382

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب

تفسیر القرآن الکریم

جزء

تبارک ۲۹ و عمّ ۳۰

تالیف

فضیلۃ الشیخ حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

تعداد .... ایک ہزار

ناشر .... دار الاندلس

قیمت ....

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

دار الاندلس ®

اسلام کی نشر و اشاعت کا عالمی مرکز

۴۔ لیک روڈ، چوبرجی لاہور، پاکستان

Ph: 92-42-7230549 Fax: 92-42-7242639 www.dar-ul-andlus.com

بسم الله الرحمن الرحيم

تفسیر القرآن الکریم

نمبرشمار	نمبرسورہ	نام	صفحہ
....		عرض ناشر	9
1	67	الملک	15
2	68	القلم	33
3	69	الحاقۃ	57
4	70	المعارج	77
5	71	نوح	91
6	72	الجن	105
7	73	المزمل	123
8	74	المدثر	143
9	75	القیامہ	165
10	76	الدھر	181
11	77	المرسلات	203
12	78	النبا	213
13	79	النازعات	223
14	80	عبس	233
15	81	التکویر	243

16	82	الانفطار	253
17	83	المطففين	257
18	84	الانشقاق	267
19	85	البروج	275
20	86	الطارق	283
21	87	الاعلىٰ	289
22	88	الغاشيه	295
23	89	الفجر	299
24	90	البلد	307
25	91	الشمس	313
26	92	الليل	317
27	93	الضحٰى	323
28	94	الانشراح	327
26	95	التين	331
30	96	العلق	335
31	97	القدر	341
32	98	البينه	345
33	99	الزلزال	349
34	100	العاديات	353
35	101	القارعه	357
36	102	التكاثر	361
37	103	العصر	365
38	104	الهمزه	369

39	105	الفيل	373
40	106	قريش	377
41	107	الماعون	381
42	108	الكوثر	385
43	109	الكافرون	391
44	110	النصر	395
45	111	اللهب	399
46	112	الاخلاص	403
47	113	الفلق	415
48	114	الناس	423

عرض ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ

أَمَّا بَعْدُ !

اللہ تعالیٰ نے اپنی بابرکت کتاب کے متعلق فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴾ (القمر : ٤٠)

’’اور کوئی شک نہیں کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا، تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟‘‘

قرآن مجید کے معانی ومفاہیم کو مزید عام فہم بنانے کے لیے ہر دور میں تفاسیر لکھی گئیں۔ ان تفاسیر میں رائج الوقت الفاظ ومحاورات، تعبیرات اور اصطلاحات کا استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے فتنوں اور باطل نظریات، تحریفات اور تاویلات کا قرآن وحدیث کی روشنی میں رد بھی کیا گیا۔ زیادہ تر تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد فارسی زبان اور دیگر زبانوں میں تراجم اور حواشی کا دور آیا۔ بعد ازاں اردو زبان میں تراجم وتفاسیر تحریر کی گئیں۔ برصغیر کے علماء نے اس میدان میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے مفصل تفاسیر بھی لکھیں اور مختصر وجامع بھی۔

ان میں سے بعض نے قدیم عربی لغات، بعض نے فقہاء کی آراء اور بعض نے عقل و

درایت کو بنیاد بنا کر قرآن مجید کی تفاسیر لکھیں اور بہت کم مفسرین ایسے تھے جنھوں نے تفسیر بالقرآن والحدیث پر کام کیا۔ اردو زبان میں وہ تفاسیر جن میں قرآن وحدیث اور منہج سلف کو مدنظر رکھا گیا، ان میں احسن التفاسیر از مولانا احمد حسن رحمہ اللہ، تفسیر ستاریہ از مولانا عبدالقہار دہلوی رحمہ اللہ، اشرف الحواشی از مولانا محمد عبدہٗ الفلاح رحمہ اللہ اور احسن البیان از حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ شامل ہیں۔

''تفسیر القرآن الکریم'' (جزء تبارک وجزء عم) جسے محترم الشیخ حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ، استاذ جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ نے تحریر کیا ہے، بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موصوف ۱۹۴۶ء میں ضلع اوکاڑہ کے ایک گاؤں ''بھٹہ محبت'' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی اور عصری تعلیم اپنے والد ماجد حافظ محمد ابوالقاسم رحمہ اللہ اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ محمدیہ اوکاڑہ، مدرسہ دارالحدیث اوکاڑہ اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے تعلیمی مراحل طے کیے۔ تحصیل علم اور تکمیل فنون کے بعد تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ تقریباً ستائیس (۲۷) سال تک جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ گوجرانوالہ اور اس دوران ایک سال ''تدریس القرآن والحدیث'' راولپنڈی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ عرصہ پندرہ سال سے ان کی سرپرستی میں جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ اور اب تیس (۳۰) دیگر مدارس شب و روز ہزاروں طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ موصوف ایک کامیاب مدرس اور بہترین مربی ہیں۔

محترم حافظ صاحب نے ''تفسیر القرآن الکریم'' کو اپنے سینتیس (۳۷) سال سے زائد عرصہ پر محیط تدریسی تجربے اور گہرے مطالعہ کی روشنی میں قلمبند کیا ہے، قدیم الفاظ، محاورات اور اصطلاحات کے استعمال سے گریز کیا ہے اور ترجمہ کرتے وقت ہر لفظ کے ترجمے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ مشکل اور نازک مرحلہ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے طے کیا ہے اور بڑے آسان پیرائے میں یہ خدمت انجام دی ہے۔ قرآن فہمی اور مشکل الفاظ کی وضاحت کے لیے اختصار اور جامعیت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس لیے ان کی یہ تفسیر قرآن سمجھنے میں جہاں عام

قارئین کے لیے ممد ومعاون ثابت ہوگی، وہاں اساتذہ اور طلبہ بھی اس سے استفادہ کرسکیں گے۔(ان شاء اللہ)

اس تفسیر میں الفاظ کے معانی، مفاہیم اورتعبیرات بیان کرنے میں قرآن وحدیث اور منہج سلف کو بنیاد بنایا گیا ہے۔عقیدۂ توحید اور سنت رسول کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔قدیم و جدید باطل نظریات،شرک، بدعات اور خرافات کا بڑے مدلل انداز میں جواب دیا گیا ہے۔

دارالاندلس کی طرف سے تفسیر قران کے حوالے سے یہ پہلی پیش کش ہے، جس میں قرآن کے دو اجزاء، جزء تبارک (۲۹) اور جزء عم (۳۰) قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔ یہ تفسیر پہلے بھی کئی دفعہ شائع ہوئی۔ اس میں کچھ اغلاط تھیں۔محترم حافظ صاحب نے ان مقامات کی اصلاح فرمادی ہے۔قرآنی آیات کی کتابت نے کتاب کے حسن میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ملک بھر میں جماعۃ الدعوۃ کے کارکنان نے اسے ترجمۃ القرآن کی کلاسز کے لیے منتخب کیا ہے۔اللہ تعالیٰ شرف قبولیت عطا فرمائے۔آمین!

یہ مختصر اور جامع تفسیر راہ حق کے متلاشی احباب کے لیے ایک بہترین اور انمول تحفہ ثابت ہوگی۔ان شاء اللہ!

محمد سیف اللہ خالد
مدیر ''دارالاندلس''
۱۷ ربیع الثانی ۱٤۲۷ھ
بمطابق ۱٦ مئی ۲۰۰٦ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کچھ عرصہ پہلے جماعۃ الدعوۃ کے بھائیوں کی ایک مجلس میں قرآن مجید کے ایک نئے ترجمے اور تفسیر کی ضرورت پر گفتگو ہوئی۔ محترم حافظ محمد سعید حفظہ اللہ (امیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان) نے یہ خدمت میرے ذمے لگائی۔ الحمد للہ انتیسویں (۲۹) اور تیسویں (۳۰) پارے کا ترجمہ اور تفسیر حاضر ہے۔

میں نے ترجمہ میں لفظ اور محاورہ دونوں کا خیال رکھا ہے اور آسان سے آسان الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ہر مفسر کی تفسیر اس کے حسن انتخاب کی آئینہ دار ہوتی ہے، حدیث وتفسیر کی کتب سے معانی ومطالب کا یہ گلدستہ میرا انتخاب ہے، جس میں میں نے اختصار اور جامعیت دونوں کو ملحوظ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے اور تمام بھائیوں کے لیے نافع بنائے اور مجھے پورے قرآن کا ترجمہ وتفسیر مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

عبدالسلام بن محمد
جامعۃ الدعوۃ الاسلامیۃ
مرکز طیبۃ مریدکے
۴۔ شعبان ۱۴۲۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں کئی روایات آتی ہیں، جن میں سے چند صحیح یا حسن احادیث ہیں۔

۱۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کی ایک سورت نے، جس کی تیس آیات ہیں، ایک آدمی کے لیے سفارش کی یہاں تک کہ اسے بخش دیا گیا وہ سورہ ﴿ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ ہے۔ (ترمذی، فضائل القرآن، باب (۹) حدیث : ۲۸۹۱ و ابو داؤد حدیث : ۱٤۰۰و حسنه الالبانی)

۲۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کی ایک سورہ نے جس کی صرف تیس آیات ہیں اپنے پڑھنے والے کی طرف سے جھگڑا کیا یہاں تک کہ اسے جنت میں داخل کروایا۔ (المعجم الصغیر للطبرانی، ص :۱۷٦، ح: ٤۹۰) وصححه الالبانی) دیکھیے صحیح الجامع الصغیر حدیث : ۳٦٤٤)

۳۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ ﴿ الٓمّٓ ۚ تَنْزِيلُ ﴾ اور ﴿ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ پڑھتے۔ (سلسلة الاحادیث الصحیحة ، ح : ۱۱٤۰)

٤۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ الم تنزیل اور تبارک الذی بیدہ الملک پڑھتے۔ (ترمذی، فضائل القرآن،باب (۹) ح : ۲۸۹۲ وصححه الالبانی)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌۨ ۙ

بہت برکت والا ہے وہ کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔①

تفسیر سورۃ الملک

آیت ① فائدہ ① ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ برکۃ سے باب تفاعل ہے۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے ترجمہ بہت برکت والا کیا گیا ہے۔ برکۃ کا معنی ہے زیادہ ہونا، بڑھا ہونا۔ ''تَبٰرَكَ''، یعنی وہ خیر اور بھلائی میں ساری کائنات سے بے انتہا بڑھا ہوا ہے۔ بلندی، بڑائی، احسان غرض ہر لحاظ سے اس کی ذات بے حد وحساب خوبیوں اور بھلائیوں کی جامع ہے۔

فائدہ ② ﴿ بِيَدِهِ ﴾ پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ ''صرف اس کے ہاتھ میں ہے'' کیا گیا ہے۔

فائدہ ③ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں بادشاہ تو بہت ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرما دیا کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے؟ جواب یہ ہے کہ دنیا کا سارا نظام ایک دوسرے کی محتاجی پر چل رہا ہے۔ رعایا اپنی ضروریات مثلاً جان، مال، آبرو اور دین وایمان کی حفاظت کے لیے بادشاہ کی محتاج ہے اور بادشاہ اپنے کام چلانے کے لیے رعایا کا محتاج ہے اگر وہ اس کا ساتھ نہ دیں، اسے ٹیکس نہ دیں تو وہ ایک لمحہ کے لیے بادشاہ نہیں رہ سکتا۔ سورہ زخرف کی آیت :۳۲ ﴿ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ ''تاکہ وہ ایک دوسرے کو تابع بنالیں۔'' میں یہی نکتہ بیان فرمایا گیا ہے۔ ایک شاعر نے دنیوی بادشاہوں کی محتاجی کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے......

مانگنے والا گدا ہے ، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

اس کے علاوہ دنیا میں کوئی بادشاہ ہے یا محکوم، ایک دوسرے کے محتاج ہونے کے باوجود دونوں میں سے کسی کے ہاتھ میں فی الحقیقت کچھ بھی نہیں، ان کی اپنی دولت وفقر، صحت و بیماری،

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ

عزت و ذلت، فتح و شکست، جوانی و بڑھاپا، نفع و نقصان، زندگی اور موت غرض سب کچھ اللہ مالک الملک کے ہاتھ میں ہے تو پھر یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ تمام بادشاہی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، دوسرا کوئی بادشاہ ہے بھی تو نام کا ہے۔ حقیقت میں بادشاہ ایک ہی ہے۔ باقی سب گدا ہیں: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (فاطر: ۱۵) ''اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو۔''

فائدہ 4 ﴿ شَيْءٍ ﴾ شَاءَ يَشَاءُ مصدر ہے، بمعنیٰ اسم مفعول۔ ''چاہت''، یعنی وہ اپنی ہر چاہت پر قادر ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں کہ جن کی بے شمار چاہتیں پوری ہونے کی بجائے حسرتیں بن کر ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتی ہیں۔

آیت ۲ فائدہ 1 یہاں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی چند چیزوں کا ذکر فرمایا جو مخلوق کی قدرت سے باہر ہیں تاکہ انسان کے دل میں اللہ کی قدرت کا پورا یقین جم جائے۔ اس مقام پر اپنی قدرتوں میں سے پہلی چیز موت و حیات ذکر فرمائی کیونکہ موت اور زندگی میں انسان کے تمام احوال پورے پورے آجاتے ہیں۔

فائدہ 2 اللہ تعالیٰ نے انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے کی حالت کو موت قرار دیا اور دنیا میں آنے کے بعد یہاں سے جانے کو بھی موت قرار دیا، اسی طرح دنیا میں آنے کو زندگی قرار دیا پھر موت کے بعد اٹھنے کو زندگی قرار دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (البقرہ: ۲۸) ''تم کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں زندگی بخشی پھر تمھیں موت دے گا پھر تمھیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

یہاں فرمایا کہ اللہ نے موت و حیات کو پیدا فرمایا۔ معلوم ہوا موت بھی ایک مخلوق ہے یہ

عدم محض (بالکل نہ ہونے) کا نام نہیں کیونکہ دنیا میں آنے سے پہلے بھی انسان اللہ کے علم اور اس کی تقدیر میں موجود تھا اور اس کے دنیا میں آنے کا وقت مقرر تھا مگر روح وجسم کا اتصال نہیں تھا اسے موت قرار دیا پھر دنیا میں آنے کے بعد روح جسم سے جدا ہوئی تو اسے موت قرار دیا۔ قیامت کے دن موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''موت کو ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا پھر ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا: اے اہل جنت! وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ کہے گا: اسے پہچانتے ہو؟ کہیں گے ہاں! یہ موت ہے اور سب نے اسے دیکھا ہے پھر وہ اعلان کرے گا: اے اہل نار! وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ کہے گا: اسے پہچانتے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں یہ موت ہے اور سب نے اسے دیکھا ہے تو اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر کہے گا، اے اہل جنت! (تمھارے لیے) ہمیشہ زندہ رہنا ہے موت نہیں اور اے اہل نار! (تمھارے لیے بھی) ہمیشہ رہنا ہے، موت نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (مریم : ٣٩) ''اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب ہر کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ سراسر غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لا رہے۔'' (صحیح بخاری، تفسیر سورہ کھیعص)

فائدہ 3 زندگی اور موت دونوں اس امتحان کے لیے پیدا کی گئی ہیں کہ انسانوں میں سے اچھے عمل کون کرتا ہے؟ اگر موت اور موت کے بعد والی زندگی نہ ہوتی تو آدمی اچھے اعمال کے لیے جدوجہد اور برے اعمال سے پرہیز کیوں کرتا؟ اور موت اور حیات بعد الموت نہ ہوتی تو اچھے اور برے اعمال کا بدلہ کہاں ملتا اور اگر دنیا میں انسان کو زندگی نہ ملتی نہ عمل کا موقع ملتا تو جزا سزا کس چیز پر ہوتی؟

فائدہ 4 وہ عزیز ہے، ایسا زبردست ہے کہ اعمال کی جزا وسزا پر پورا اختیار رکھتا ہے اور ایسا

ہے؟ اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے۔ ②

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ

غالب کہ کوئی اس پر غالب نہیں مگر اتنی قوت وعزت کے باوجود ظالم یا سخت گیر نہیں بلکہ غفور ہے اور ایسا غفور کہ کوئی توبہ کرے تو جتنے گناہ بھی کیے ہوں، بخش دیتا ہے۔ توبہ کے بغیر بھی اگر اس کے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو جسے چاہے گا بخش دے گا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ (النساء: ١١٦) ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے جسے چاہے گا بخش دے گا۔“ اور شرک اس لیے معاف نہیں کرے گا کہ یہ اس کے عزیز ہونے کے خلاف ہے۔

آیت ③ فائدہ ① طباقاً یعنی تہہ بر تہہ اوپر نیچے بنایا مفاعلہ کا مصدر ہے۔ حدیث معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آسمان ایک دوسرے سے جدا ہے، چنانچہ ہر آسمان میں رسول اللہ ﷺ کی ملاقات کسی نہ کسی رسول سے ہوئی۔ (دیکھیے، بخاری، الصلاۃ، باب(١) حدیث : ٣٤٩)

فائدہ ② رحمان کے (آسمانوں کو) پیدا کرنے میں تم کوئی تفاوت نہیں دیکھو گے، جب آسمانوں جیسی عظیم الشان مخلوق میں کوئی تفاوت نہیں نکال سکتے تو دوسری مخلوق جو اس سے کہیں چھوٹی ہے اس میں تم کس طرح تفاوت نکال سکو گے؟ تفاوت کا معنی ہے کہ تم اتنے بڑے آسمان یا کسی بھی مخلوق کی کوئی چیز دوسری چیز سے بے جوڑ یا بے ترتیب نہیں پاؤ گے، بلکہ سب میں ایک توازن وترتیب اور یکسانی پاؤ گے جس سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی خالق کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ ﴿ مِنْ تَفٰوُتٍ ﴾ کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم کسی چیز میں کوئی عیب یا کمی نہیں پاؤ گے کہ کہہ سکو کہ اگر اس طرح ہوتا تو بہتر تھا۔ (قاموس) ﴿ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ ﴾ کے لفظ سے توجہ دلائی کہ اتنا عظیم الشان آسمان اور دوسری ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان کا نتیجہ ہے۔

۲۹

الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۝

جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا فرمائے۔ رحمان کے پیدا کیے ہوئے میں تو کوئی کمی بیشی نہیں دیکھے گا پس نگاہ کو لوٹا، کیا تجھے کوئی کئی پھٹی جگہ نظر آتی ہے؟ ③

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۝ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ۝

فائدہ ③ ﴿فُطُوْرٍ﴾ **فَطر** کی جمع ہے جیسے **فلس** کی جمع **فلوس** ہے۔ پھٹی ہوئی جگہ' دراڑ' شگاف یعنی پہلی دفعہ اگر تمھیں رحمان کے پیدا کیے ہوئے آسمان میں کوئی عیب یا کمی بیشی نظر نہیں آئی تو دوبارہ نظر دوڑا کر دیکھ لو کیا کوئی دراڑ یا پھٹی ہوئی جگہ نظر آتی ہے؟ مطلب یہ کہ پوری کائنات میں ذروں سے لے کر آسمانوں تک اور ستاروں سے لے کر بڑی بڑی کہکشاؤں تک ہر چیز مستحکم اور مربوط ہے جتنا چاہو تلاش کر لو تمھیں ایک رخنہ بھی نہیں ملے گا۔

آیت ④ ﴿كَرَّتَيْنِ﴾ کا لفظی معنیٰ دو مرتبہ ہے مگر یہاں مراد صرف دو مرتبہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ (دوبارہ غور کرنے سے بھی کوئی خلل نہ ملے تو) بار بار دیکھ! جیسا کہ **لبیک** لفظ تثنیہ ہے مگر اس کا معنیٰ یہ نہیں کہ ''میں دو دفعہ حاضر ہوں'' بلکہ یہ ہے کہ میں بار بار حاضر ہوں۔ ﴿خَاسِئًا﴾ کسی چیز کو طلب کرنے والا جو اس سے دور ہٹا دیا جائے۔ ﴿حَسِيْرٌ﴾ جو تھک کر عاجز رہ جائے۔ بار بار دیکھنے کا حکم ان کی بے بسی واضح کرنے کے لیے ہے۔

آیت ⑤ ''السَّمَآءَ الدُّنْيَا'' دنیا ''دَنَا يَدْنُوْ'' میں سے ادنیٰ کی مونث ہے (سب سے قریب) اگرچہ سات آسمانوں میں سے ہر آسمان خالق کی کاریگری کا عظیم الشان نمونہ ہے مگر زمین کے سب سے قریب آسمان کی زینت وحفاظت کا جو اہتمام ہم نے کیا ہے وہ تو کچھ کچھ تمھیں بھی نظر آرہا ہے۔ اس کے لیے تو کسی خاص آلے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ستاروں کے تین فائدے بیان فرمائے ہیں۔ پہلا فائدہ زینت ہے۔ رات کو چھوٹے

پھر بار بار نگاہ لوٹا، نظر ناکام ہو کر تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔④ اور بے شک ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی اور انھیں شیطانوں کو مارنے کے آلے بنایا اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔⑤

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا

بڑے لاتعداد ستاروں کے ساتھ آسمان جس قدر مزین ہوتا ہے اور حسین وجمیل نظر آتا ہے اگر ستارے نہ ہوتے تو اتنا ہی ڈراؤنا دکھائی دیتا اور بے زیب ہوتا۔ دوسرا فائدہ ہے روشنی، جو مصابیح (چراغوں) کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے اگر یہ چراغ نہ ہوتے تو رات جس قدر تاریک ہوتی اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ تیسرا فائدہ یہ کہ ان ستاروں کے ذریعے ان شیطانوں کو مار بھگایا جاتا ہے جو فرشتوں کی باتیں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو غیب دانی کے دعویٰ سے گمراہ کر سکیں (تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ والصافات آیت :١٠٦ کی تفسیر) چوتھا فائدہ دوسری جگہ بیان فرمایا: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ (النحل:١٦) یعنی ستارے بحر و بر میں راستہ اور سمت معلوم کرنے کے کام آتے ہیں۔ان کے علاوہ ستاروں میں کوئی اور فائدہ مثلاً سعادت یا نحوست سمجھنا یا کسی اختیار کا مالک سمجھنا شرک ہے۔

آیت ⑥ پہلی پانچ آیات میں اللہ تعالیٰ توحید اور قیامت کے دلائل بیان فرماتے ہیں۔ اب ان لوگوں کا انجام ذکر ہو رہا ہے جنھوں نے اکیلے اللہ کو اپنا رب نہیں مانا، کہ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔

آیت ⑦ ﴿شَهِيْقًا﴾ گدھے کے ہینگنے کے آخر کی آواز۔ **زفیر** شروع کی آواز (قاموس) سورہ فرقان :١٢ میں فرمایا کہ جہنم جب انھیں دور سے دیکھے گی تو وہ جہنم کے سخت غصے کی اور گدھے کی طرح چلانے کی آوازیں سنیں گے۔ ساتھ ہی جہنمیوں کی چیخنے چلانے کی جو آوازیں آ رہی ہوں گی وہ بھی گدھے کی آوازوں جیسی ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ﴾ (هود:١٠٦) ”تو وہ لوگ جو بدبخت

لَهَا شَهِيقًا وَّهِيَ تَفُورُ ۝

اور خاص ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (٦) جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے' اس کے لیے گدھے کے زور سے چیخنے جیسی آواز سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہو گی۔ (٧)

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝
قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

ہوئے سو وہ آگ میں ہوں گے، ان کے لیے گدھے کی طرح آواز کھینچنا اور نکالنا ہے۔

آیت (٨)، (٩) ''قریب ہے کہ غصے سے پھٹ جائے۔'' اس سے آگ کا صاحب شعور ہونا اور کفار پر سخت غصے ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ جہنم کے اس وقت کے سخت غصے اور جوش و خروش کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا۔

جہنم میں جب بھی کسی نئے گروہ کے لوگ پھینکے جائیں گے، جہنم کے نگران فرشتے ان سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ یہ سوال ہر گروہ سے ہوگا اور اس لیے نہیں ہوگا کہ فرشتوں کو معلوم نہیں کہ ان کے پاس ڈرانے والے آئے تھے یا نہیں؟ بلکہ ایک تو تعجب کے اظہار کے لیے ہوگا کہ اللہ کی طرف سے پیغمبروں اور دین کی دعوت دینے والوں کے ڈرانے کے باوجود تم ایمان نہ لائے اور جان بوجھ کر جہنم کا ایندھن بنے، دوسرا ان پر حجت تمام کرنے کے لیے اور خود ان کے منہ سے نکلوانے کے لیے کہ انھیں نہ تو بے خبری میں جہنم میں پھینکا جا رہا ہے اور نہ بلا جرم بلکہ وہ فی الواقع اس کے حقدار ہیں، چنانچہ وہ خود کہیں گے: کیوں نہیں، ہمارے پاس ڈرانے والے آئے اور اللہ کی اتاری ہوئی پوری تعلیم بھی ہم تک پہنچائی مگر ہم نے انھیں جھٹلا دیا اور اس بات سے سرے سے انکار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل کی ہے بلکہ الٹا انھی کو بڑی گمراہی میں مبتلا قرار دیا۔

قریب ہو گی کہ غصے سے پھٹ جائے۔ جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا اس کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ ⑧

وہ کہیں گے کیوں نہیں؟ یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ ⑨ اور کہیں گے اگر ہم

آیت ⑩ اب وہ حسرت وافسوس سے کہیں گے کہ ہم جس گمراہی میں مبتلا رہے، اس سے نکلنے کی دو ہی صورتیں تھیں، پہلی یہ کہ ہم رسولوں اور اہل ایمان کی باتیں سن لیا کرتے تو ایمان کی نعمت مل جاتی، دوسری یہ کہ خود کچھ عقل سے کام لیا کرتے تو توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔ دونوں صورتوں میں آج جہنمیوں میں شامل نہ ہوتے مگر ہم اپنی مرضی اور آباؤ اجداد کے طریقے کے خلاف کوئی بات نہ سنا کرتے تھے اور نہ سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے (رسولوں کی بات دلیل سمعی ہے، سمجھنا دلیل عقلی اور اپنی مرضی پر چلنا یا آباؤ اجداد کی تقلید نہ دلیل سمعی ہے اور نہ دلیل عقلی، بلکہ دلیل ہے ہی نہیں)

آیت ⑪ وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے' یہ نہیں فرمایا کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے کیونکہ ان کو جہنم میں لے جانے والا اصل گناہ ایک ہی تھا یعنی رسولوں کو جان بوجھ کر جھٹلا دینا مگر ایسے اقرار کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ جانتے بوجھتے جہنمی بننے والوں کو یہی کہا جائے گا کہ جہنمی اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں۔

﴿سُحْقًا﴾ سحق (س و ک) کا مصدر ہے، معنیٰ دور ہونا۔ سحیق بعید

آیت ⑫ پچھلی آیات میں جہنمیوں کا ذکر تھا جو نہ اپنے رب سے ڈرتے تھے نہ انھیں قیامت کا یا اپنی بد اعمالیوں کی سزا کا خوف تھا کیونکہ نہ وہ ان دیکھی چیزوں پر ایمان لانے پر تیار تھے اور نہ ان سے ڈرنے پر، ان کے مقابلے میں اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو عقل سلیم کے تقاضے اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور برگزیدہ بندوں کے بتانے سے دیکھے بغیر اللہ تعالیٰ پر' اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ ان سے اگر کوئی غلطی ہو بھی گئی تو ان کے بن دیکھے ڈرتے رہنے کے صلے میں

سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔ ﴿١٠﴾

فَاعْتَرَفُوا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١١﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١٢﴾

پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے۔ سو دوری ہے بھڑکتی ہوئی آگ والوں کے لیے۔ ﴿١١﴾
یقیناً جو لوگ اپنے رب سے بغیر دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لیے بخشش اور بڑا اجر ہے۔ ﴿١٢﴾

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٣﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٤﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا

اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا اور اسی خشیت بالغیب کی وجہ سے انھوں نے جو نیکیاں کیں ان کا بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ خشیت کا معنیٰ شدت خوف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نیکی کا اصل ایمان بالغیب اور خشیت بالغیب ہے اور گناہ سے بچنے کا اصل باعث بھی یہی ہے۔

آیت ﴿١٣﴾ شروع سورہ سے اللہ تعالیٰ کی ان قدرتوں کا بیان ہو رہا تھا جو مخلوق کی استطاعت سے باہر ہیں درمیان کی سات آیات میں ان سے کفر کرنے والوں اور ان پر ایمان رکھنے والوں کا انجام ذکر فرمایا، اب دوبارہ اللہ کی قدرتوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ فرمایا تم اپنی بات چھپا کر کرو یا بلند آواز سے کرو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر دلوں کے ارادے اور نیتیں جو زبان پر آ کر قول بننے کی منزل تک نہیں پہنچے، انھیں بھی جانتا ہے۔ مخلوق بے چاری نہ چھپی بات کو جانتی ہے اور نہ ایک وقت میں بہت سے لوگوں کی اونچی آواز سے کی ہوئی باتوں کو جان سکتی ہے، دلوں کی بات جاننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (نیز دیکھیے تفسیر سورۃ الاعلیٰ : ٧)

آیت ﴿١٤﴾ یہ علیم ہونے کی دلیل ہے کہ جو دل کا خالق اور دل میں چھپی ہوئی چیزوں کا خالق ہے، زبان کا اور اس سے ادا ہونے والے اقوال کا خالق ہے، کیا وہ اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اسرار و اقوال نہیں جانے گا؟ ﴿اللطیف﴾ کے مفہوم میں باریک سے باریک چیز جاننے کے ساتھ ساتھ نہایت مہربان ہونا بھی شامل ہے۔ اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کلیات کو جانتا ہے جزئیات کو نہیں جانتا۔

٢٩

وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ

اورتم اپنی بات کو چھپاؤ یا اسے بلند آواز سے کرو (برابر ہے) یقیناً وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے۔ ⑬ کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل

آیت ⑮ ﴿ ذَلُوْلًا ﴾ جو تمھارے تابع ہو جائے، سرکشی نہ کرے، یعنی تم اس پر چل پھر سکتے ہو، اسے کام میں لا سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ کر اسے زلزلوں سے محفوظ کر دیا تا کہ تم سکون سے رہ سکو۔ لوہے کی طرح سخت نہیں بنایا ورنہ نہ اس سے کچھ اگتا، نہ عمارتیں بنتیں، نہ نہریں یا کنوئیں کھودے جاسکتے اور نہ انسان اور جانوروں کے رزق کا انتظام ہوتا' ضرورت سے زیادہ نرم بھی نہیں بنایا ورنہ سب کچھ اس کے اندر دھنس جاتا۔ مشرک اقوام کی کم عقلی دیکھیے اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو انسان کے تابع کیا، انھوں نے اسے دھرتی ماتا کے نام سے اپنا معبود بنا لیا۔ «مناکب» کا لفظی معنیٰ کندھے ہے۔ جس طرح بالکل مطیع جانور پیٹھ کے علاوہ کندھوں پر بھی سواری کر لینے دیتا ہے، زمین بھی تمھارے لیے ایسے ہی مسخر ہے اس پر جہاں چاہو چلو پھرو۔

﴿ وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ﴾ اس کے دیے ہوئے میں سے کھاؤ، مگر آزادی سے نہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ آخر کار تمھیں اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے جو تم سے ایک ایک چیز کا حساب لے گا کہ اسے کن ذرائع سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا؟ (عبدہٗ)

آیت ⑯ حرکت کرنے لگے، یعنی زبردست زلزلے سے لرزنے لگے۔ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا ذکر فرمایا تھا اور اس میں اپنی شان قہاریت کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین اگرچہ تمھارے تابع کر دی گئی ہے کہ تم جیسے چاہو اس میں تصرف کر سکو لیکن یاد رکھو کہ یہ اسی آسمان والے کی ملکیت ہے وہ چاہے تو تمھیں اس کے اندر دھنسا دے (جس طرح قارون کو دھنسا دیا) اور چاہے تو بھونچال سے لرزنے لگے، لہٰذا اس پر سرکش و خود مختار ہو کر نہیں بلکہ تابعداروں کی طرح ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرو۔ (عبدہٗ)

﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ ﴾ اَلسَّمَاءَ سِمُوٌّ سے مشتق ہے، جس کا معنی بلندی ہے۔ ہر

ہے۔⑭ وہی ہے جس نے تمھارے

وہ چیز جو اوپر ہو اسے اَلسَّمَاءُ کہہ لیتے ہیں۔ ان دونوں آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اوپر کی طرف ہے۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر رحمان کا عرش پر ہونا بیان فرمایا ہے۔ معاویہ بن الحکم السلمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی لونڈی کے متعلق پوچھا کہ کیا میں اسے آزاد کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے لاؤ۔ جب وہ آ گئی تو آپ نے پوچھا: ((أَيْنَ اللّٰہُ؟)) ''اللہ کہاں ہے؟ ''اس نے کہا: ((فِي السَّمَاءِ)) آسمان میں ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں کون ہوں؟'' اس نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے آزاد کر دو

یہ مومنہ ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب المساجد، حدیث : ۳۳)

تمام سلف صالحین کا یہی عقیدہ ہے، بعد کے لوگ جو یونانی فلسفے سے متاثر ہو گئے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی علو (اوپر ہونے) کی صفت کا انکار کر دیا، کسی نے کہا وہ لامکان ہے۔ کسی نے کہا وہ ہر جگہ ہے اور قرآن و حدیث کی صاف نصوص کی تاویل کی۔ بعض لوگ تو یہاں تک پہنچ گئے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ سوال ہی کفر ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟

انھوں نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ سوال تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس کے جواب میں بھی اللہ تعالیٰ کے آسمانوں پر ہونے کے عقیدے کو آپ نے ایمان قرار دیا ہے (دیکھیے مسلم، کتاب المساجد، حدیث : ۱۱۹۹) تو کیا نعوذ باللہ یہ فتویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی لگایا جائے گا؟ قرآن مجید: ﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ ﴾ میں اللہ تعالیٰ کا آسمان پر ہونا فرما رہا ہے۔ یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے وہ دعا کرتا ہے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے مگر فلسفے کے مارے ہوئے یہ حضرات کبھی کہتے ہیں کہ اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ وہ آسمانوں پر بیٹھا ہوا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ پھر کیا وہ آسمان میں رہتا ہے؟ اس طرح تو وہ آسمان کا محتاج ہوا جبکہ آسمان و زمین خود اس نے پیدا کیے ہیں۔ حالانکہ سلف صالحین کے عقیدہ کے مطابق وہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال کرنا جائز نہیں جو اس نے خود اپنے متعلق استعمال نہ کیا ہو۔ اب یہ کس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کھڑا ہے یا بیٹھا ہے؟ قرآن و حدیث سے اللہ تعالیٰ کی بلندی کی جانب ہونا اور عرش پر ہونا ثابت ہے، اس کی کیفیت کسی کو معلوم نہیں اور وہ عرش کا یا بلندی

لیے زمین کو تابع بنا دیا، سو اس کے کندھوں پر چلو اور اللہ کے دیے ہوئے میں

سے کھاؤ اور اسی کی طرف (دوبارہ) اٹھ کر جانا ہے۔ ⑮

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝

کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے تو اچانک وہ حرکت کرنے لگے۔ ⑯

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۭ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ۝

کا محتاج نہیں بلکہ اس کے عرش پر ہونے کے باوجود عرش خود اس کا محتاج ہے اور اس نے عرش اور آسمان و زمین کو تھام رکھا ہے۔ مخلوق میں کئی چیزیں ہیں جو اوپر ہیں مگر ان کے نیچے کی چیزیں اپنے قیام میں ان کی محتاج ہیں، اللہ کی مثال تو اس سے بہت بلند ہے۔ مومن جب بھی اللہ تعالیٰ کا تصور کرتا ہے یا اس سے دعا کرتا ہے، اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا پروردگار آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے اور اسے اپنے رب سے تعلق جوڑنے میں کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ تاویلوں کی مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگ یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ ان کا رب کہاں ہے؟ جس کی طرف وہ توجہ کریں۔ وہ لا مکان کے چکر ہی سے نہیں نکل سکتے۔ اسلام کے فطری اور سادہ عقائد کو چھوڑ کر فلسفی بھول بھلیاں اختیار کرنے کا یہی انجام ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، تفسیر سورۃ الفجر آیت : ۲۲)

آیت ⑰ جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ ہوا۔ ﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴾ (القمر: ۳٤) ''بے شک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ایک ہوا بھیجی سوائے لوط کے گھر والوں کے، کہ انھیں صبح سے کچھ پہلے بچا کر نکال لیا۔''

آیت ⑱ تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کے لیے پہلے لوگوں کا حال دیکھ لو۔ عرب میں عاد و ثمود، فرعون، وقارون اور قوم لوط و شعیب کے واقعات معروف تھے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ
صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ؔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ۝

یا کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھراؤ والی آندھی بھیج دے، پھر تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟ ⑰ اور یقیناً ان لوگوں نے (بھی) جھٹلایا جو ان سے

آیت ⑲ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک اور قدرت بیان فرمائی کہ عام مشاہدے میں مادی چیزیں جو وزن رکھتی ہیں نیچے کی طرف میلان رکھتی ہیں مگر پرندے وزن رکھنے کے باوجود فضا میں اڑتے پھرتے ہیں، اڑتے وقت اکثر وہ پر پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، کبھی سکیڑ بھی لیتے ہیں۔ انھیں تھامنے والا اس رحمان (بے حد مہربان) کے علاوہ کوئی نہیں۔

”یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے۔“ فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کو وہی تھامے ہوئے ہے۔ ہوا میں معلق زمین کو گرنے سے بچانے والا وہی ہے، آسمان کو ستونوں کے بغیر ان کی جگہ پر قائم رکھنے والا وہی ہے۔ غرض اس کائنات کی ہر چیز کی مسلسل نگرانی اور دیکھ بھال وہی کر رہا ہے اور وہی اسے تھامے ہوئے ہے، اگر وہ ایک لمحہ کے لیے توجہ ہٹا لے تو سب کچھ فنا ہو جائے:
﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ﴾
(الفاطر: ٤١) ”بے شک اللہ ہی آسمانوں کو اور زمین کو تھامے رکھتا ہے، اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلیں اور اگر فی الواقع وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی نہیں جو انھیں تھام لے گا بے شک وہ ہمیشہ سے نہایت بردبار، بے حد بخشنے والا ہے۔“

آیت ⑳ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اتنی قدرتوں والا رحمان تمھیں پکڑنے پہ آ جائے تو وہ کون ہے جو تمھارا لشکر بن کر اس کے مقابلے میں تمھاری مدد کر سکے؟ کوئی نہیں، بالکل نہیں۔ کافر لوگ جن کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ فلاں ہستی اور فلاں مشکل کشا اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ان کی مدد کریں گے اور زبردستی سفارش کر کے چھڑا لیں گے، محض دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، جس میں انھیں شیطان نے مبتلا کر رکھا ہے۔ ﴿ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ﴾ کا ایک معنیٰ یہ بھی

پہلے تھے، پھر کس طرح تھا میرا سزا دینا۔ ⑱ اور کیا انھوں نے اپنے اوپر
پرندوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ وہ پر پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سکیڑ لیتے ہیں۔
رحمان کے سوا انھیں کوئی تھام نہیں رہا ہوتا۔ یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے۔ ⑲

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ﴿٢٠﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾

بھلا کون ہے وہ جو تمھارا لشکر ہو، تمھاری مدد کرے، رحمان کے مقابلے میں۔ کافر دھوکے کے

ہوسکتا ہے کہ رحمان کے علاوہ وہ کون ہے جو کسی مصیبت میں لشکر بن کر تمھاری مدد کر سکے؟

آیت ㉑ یعنی اگر اللہ تعالیٰ بارش ہی روک لے تو وہ کون ہے جو بارش برسا دے؟ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب قریش مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں نافرمانی کی حد کر دی تو آپ نے ان پر یوسف علیہ السلام جیسی قحط سالی کی بد دعا فرمائی تو ان پر ایسا قحط آیا کہ ہڈیاں تک کھا گئے، خلاصہ یہ ہے کہ وہ قحط اس وقت دور ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الدخان) لات ومنات کے بت بلکہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے جو بت انھوں نے بنائے ہوئے تھے، ان کے کسی کام نہ آسکے۔

آیت ㉒ یہ موحد مومن اور کافر مشرک کی مثال ہے۔ کافر سیدھے راستے پر چلنے کی بجائے گمراہی کے گڑھوں میں پڑ جانے کی وجہ سے منہ کے بل گرتا پڑتا چلا جا رہا ہوتا ہے۔ ایسا شخص منزل مقصود پر کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اس کے برعکس مومن توحید وسنت کی صراط مستقیم پر سیدھا ہو کر چل رہا ہوتا ہے۔ اسے دائیں بائیں اور سامنے ہر طرف سے اپنا راستہ اور اس کا گرد و پیش نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ یقیناً اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا، جو جنت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ کافروں کے متعلق فرمایا: ﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا ۖ مَّأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ﴾ (بنی اسرائیل:۹۷) ''اور قیامت کے دن ہم انھیں ان کے چہروں پر اندھے اور گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت میں ان کے اوندھے منہ اٹھائے جانے کا سبب یہی ہے کہ

علاوہ کسی کھاتے میں نہیں ہیں۔⑳ یا وہ کون ہے کہ اگر اللہ اپنا رزق روک

لے تو وہ تمھیں رزق دے بلکہ وہ سرکشی اور بدکنے ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔㉑

أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٢﴾
قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا
تَشْكُرُونَ ﴿٢٣﴾

دنیا میں بھی وہ الٹے ہی چلتے تھے، سیدھے ہوکر راہ راست پر چلنا انھیں گوارا نہ تھا۔

آیت ㉓ اللہ تعالیٰ ہی نے تمھیں پیدا فرمایا اور تمھیں کان، آنکھیں اور دل عطا فرمایا، اب پیدا کرنے کا شکر تو یہ تھا کہ صرف اسی کی عبادت کرتے۔ اور کان' آنکھیں اور دل عطا فرمانے کا شکر یہ تھا کہ انھیں وہیں استعمال کرتے جہاں یہ نعمتیں دینے والے کی رضا تھی اور ان کے ذریعے اس کی خوشنودی کا راستہ تلاش کرتے، مگر تم نے نہ کانوں سے حق بات سنی نہ آنکھوں سے اللہ کی قدرتیں دیکھ کر عبرت پکڑی نہ دل سے اس کی توحید سمجھنے کی کوشش کی۔ بے شمار نعمتوں میں سے یہ تین نعمتیں اس لیے ذکر فرمائیں کہ یہ تینوں علم کے ذرائع ہیں، انھی کے ذریعے آدمی حق تک پہنچ سکتا ہے۔ اس آیت میں خطاب کفار سے ہے اور ''کم ہی شکر کرتے ہو'' سے مراد یہ ہے کہ تم بالکل شکر ادا نہیں کرتے۔

آیت ㉔ جو تمھیں روئے زمین پر پھیلا سکتا ہے وہ دوبارہ اکٹھا بھی کر سکتا ہے، اور کرے گا۔

آیت ㉕ ان کا یہ پوچھنا معلوم کرنے کے لیے نہیں تھا۔ وہ تو یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں سے ان کا یہ پوچھنا صرف طنز واستہزا کے لیے تھا۔

آیت ㉖ یعنی قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، میں نہ قیامت لانے کا اختیار رکھتا ہوں نہ مجھے اس کے وقت کا علم ہے، میرا کام صرف یہ ہے کہ وقت سے پہلے تمھیں قیامت کے متعلق آگاہ کر دوں اور اس کی ہولناکیوں سے ڈرا دوں سو یہ کام میں نے کر دیا ہے۔ قیامت کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کا آنا یقینی ہے مگر وقت معلوم نہیں، موت ہی کو دیکھ لو، تو

کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل الٹا ہو کر چلتا ہے زیادہ صحیح راہ پر ہے یا جو
سیدھا ہو کر درست راستے پر چلتا ہے؟ ﴿٢٢﴾ کہہ دے وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور
تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم کم ہی شکر کرتے ہو۔ ﴿٢٣﴾

قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٥﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢٦﴾

کہہ دے وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلا دیا اور تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ
گے۔ ﴿٢٤﴾ اور وہ کہتے ہیں اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ ﴿٢٥﴾ کہہ دے یہ علم تو اللہ ہی
کے پاس ہے اور میں تو بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ﴿٢٦﴾

فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سِيئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ

کیا اس لیے قیامت یا موت کی تیاری نہ کی جائے کہ بے شک اس نے آنا ہے مگر اس کا وقت معلوم نہیں؟

آیت ﴿٢٧﴾ اب جس قیامت کو مذاق سمجھ رہے ہیں اور جس کا مطالبہ بڑے دھڑلے سے بار بار کر رہے ہیں جب قریب آتی ہوئی دیکھیں گے تو سب ہنسی مذاق اور شیخی شوخی بھول جائیں گے، خوف اور دہشت سے ان کے چہرے بگڑ جائیں گے اور کہا جائے گا یہی ہے وہ قیامت جس کا تم مطالبہ کیا کرتے تھے۔

آیت ﴿٢٨﴾ کفار مکہ اسلام کے پھیلنے سے پریشان ہو کر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف اپنی تمام کوششوں کا ناکام ہونا دیکھ کر اس امید پر جی رہے تھے کہ کبھی نہ کبھی زمانے کی گردش ان کا کام تمام کر دے گی۔ (الطور: ٣٠) اس پر حکم ہوا کہ ان سے کہو مجھے اور میرے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے، تمھیں اس سے کیا غرض ہے؟ تم اپنی فکر کرو کہ کفر کے نتیجے میں جو عذاب الیم تم پر آنے والا ہے، تمھیں اس سے کون بچائے گا؟

آیت ﴿٢٩﴾ یعنی وہ ہمیں ہلاک کرے یا ہم پر رحم کرے، دونوں صورتوں میں ہماری امیدیں اسی

٢٩
تَدَّعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ
الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ

سے وابستہ ہیں، وہی رحمان ہے، کوئی اور نہیں جو ہم پر رحم کر سکے، ہمارا اس پر ایمان اور اسی پر بھروسا ہے، تم جو اس کے علاوہ بھی کسی سے رحم کے امیدوار اور طلبگار ہو، بہت جلد آنکھیں بند ہوتے ہی جان لوگے کہ ہم میں سے صاف گمراہ کون تھا؟

آیت ⑳ پچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنا رزق روک لے، بارش نہ برسائے تو کون ہے جو تمھیں بارش عطا فرمائے؟ قحط کے وقت اپنے خداؤں کی بے بسی تم دیکھ ہی چکے ہو، اب حکم ہوتا ہے ان سے پوچھو کہ یہی پانی جس پر تمھاری زندگی کا دارو مدار ہے اگر گہرا ہو جائے اور تمھاری دسترس سے باہر ہو جائے تو کون ہے جو بہتا ہوا پانی تمھارے پاس لے آئے؟ ظاہر ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے پاس یہ قوت نہیں ہے۔

رکوعاتھا ۲ (۶۸) سورۃ القلم مکیۃ (۲) آیاتھا ۵۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾

ن۔ قسم ہے قلم کی! اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں۔ ①

تفسیر سورۃ القلم

آیت ① فائدہ ﴿1﴾ ''ن'' حروف تہجی میں سے ایک حرف ہے۔ مختلف سورتوں کی ابتدا میں آنے والے ان حروف سے اصل مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ سب سے قریب بات یہ ہے کہ ان حروف کے ذکر سے تمام دنیا کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ان حروف تہجی ہی میں اتارا ہے، اگر تمھیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو حروف تہجی تمھارے بھی علم اور استعمال میں ہیں تم بھی اس جیسی کوئی سورہ بنا کر لے آؤ۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ عموماً یہ حروف جہاں بھی آتے ہیں ان کے بعد قرآن مجید، کتاب، وحی کا ذکر آیا ہے۔ (واللہ اعلم)

بعض مفسرین نے فرمایا: ''ن'' کا معنیٰ مچھلی ہے اور یہاں اس عظیم مچھلی کی قسم کھائی گئی ہے جس کی پشت پر ساتوں زمینیں رکھی ہوئی ہیں، لیکن یہ بات درست نہیں ایک تو اس لیے کہ کسی صحیح حدیث سے ایسی کسی مچھلی کا وجود ہی ثابت نہیں، دوسرا اس لیے کہ بے شک کلام عرب میں نون کا معنیٰ مچھلی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ (الانبیاء : ۸۷) ''اور مچھلی والے کو جب وہ غصے میں بھرا ہوا چلا گیا۔'' مگر یہاں یہ لفظ ''ن'' کی شکل میں ہے، ''نون'' کی شکل میں نہیں۔ علاوہ ازیں اگر اس سے مراد مچھلی ہوتی تو اس پر رفع نصب یا جر کا اعراب ہونا چاہیے تھا اور آخر میں تنوین آنی چاہیے تھی، جب کہ یہاں اس کے آخر میں وقف

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ

کہ تو اپنے رب کی نعمت سے ہرگز دیوانہ نہیں ہے۔② اور یقیناً تیرے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع ہونے والا نہیں۔③

ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دوسرے مقطعات مثلاً ((الٓمّٓ)) کی طرح حرف تہجی ہی ہے۔ بعض نے ''ن'' کا معنیٰ دوات بتایا ہے مگر یہ لغت میں غیر معروف ہے اور اس پر اعراب اور تنوین نہ ہونے سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔

فائدہ ② ﴿ وَالْقَلَمِ ﴾ قلم سے مراد لوح محفوظ پر لکھنے والا قلم بھی ہوسکتا ہے۔ جس کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى الْقَلَمُ وَاَمَرَهُ اَنْ يَّكْتُبَ كُلَّ شَيْءٍ يَكُوْنُ)) سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی، قلم ہے اور اسے حکم دیا کہ ہر وہ چیز لکھ دے جو آئندہ ہوگی۔ (سلسلة الاحاديث الصحيحة للالبانی :حديث ١٣٣) یہ حدیث ترمذی، تفسیر سورۂ نٓ والقلم، ابو داؤد اور احمد میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور وہ قلم بھی مراد ہوسکتا ہے جن سے لوگ لکھتے ہیں۔ لفظ عام ہے اس لیے اسے کسی ایک قلم کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔

﴿ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴾ میں لوح محفوظ میں لکھے ہوئے آسمانی صحیفے، قرآن مجید اور ابتدائے خلق سے لکھی ہوئی تمام کائنات کی تقدیر بھی شامل ہے اور انسان یا فرشتے جو کچھ لکھتے ہیں وہ سب کچھ بھی شامل ہے۔

آیت ②، ③ اللہ تعالیٰ نے قلم کی اور اس چیز کی قسم کھائی جو لکھنے والے لکھتے ہیں، اس کے جواب میں تین باتیں ارشاد فرمائیں، پہلی یہ کہ آپ اللہ کے فضل سے مجنون (دیوانے) نہیں ہیں، دوسری یہ کہ آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع ہونے والا نہیں، اور تیسرا یہ کہ یقیناً آپ خلق عظیم پر ہیں۔ قسم جواب قسم کی تاکید کے لیے کھائی جاتی ہے اور عام طور پر اس کے لیے شاہد اور دلیل ہوتی ہے، یہاں قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ قلم اور قلم سے لکھنے

والوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کفار کا یہ کہنا غلط ہے کہ آپ دیوانے ہیں۔

قلم تقدیر نے لوح محفوظ میں ہزاروں سال پہلے آپ کی قسمت میں جو صدق و امانت' نبوت و رسالت اور دنیا و آخرت میں کامیابی اور عزت و رفعت لکھ دی ہے، پہلے صحائف میں آپ کے متعلق جو پیشگوئیاں اور فضائل لکھے ہوئے ہیں۔ کراماً کاتبین آپ کے عمل نامہ میں جو کچھ لکھ رہے ہیں اور کسی بھی شخص کے عمل نامہ میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے، قرآن مجید میں جو عقائد، احکام، قصص اور گزشتہ و آئندہ کی خبریں لکھی ہوئی ہیں، جن کا ایک شوشہ نہ غلط ثابت ہوا ہے نہ ہوگا اور جس کی مثل چھوٹی سے چھوٹی سورہ کوئی شخص پیش کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔

آپ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ، آپ کے افعال و احوال اور آپ کا بعض مواقع پر خاموش رہنا، یہ سب کچھ جو یاد کرنے والوں نے یاد کیا اور لکھنے والوں نے لکھا ہے اور قیامت تک یاد کرتے اور لکھتے چلے جائیں گے۔ اگر کوئی ان تمام لکھی ہوئی چیزوں پر غور کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے بڑے بڑے عقلمندوں کی تحریروں کا موازنہ کرے اور سارے جہاں کے دیوانوں' یاوہ گو شاعروں' گپ بازوں اور افسانہ نویسوں کی لکھی ہوئی فضولیات کا بھی جائزہ لے تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ لوح محفوظ میں جس کی قسمت میں اتنی سعادتیں لکھ دی گئی ہیں، جس کی پیشگوئیاں پہلے آسمانی صحائف میں لکھی ہوئی ہیں، جو اُمّی ہونے کے باوجود قرآن جیسی عظیم کتاب لے کر آیا ہے، جس کے اقوال و احوال اور افعال و تقریریات میں سے ہر چیز بے حد محبت وعقیدت سے لکھی گئی ہے اور قیامت تک محفوظ ہے اور تمام جہانوں کے لیے ہدایت کی روشنی مہیا کرتی ہے، اس کے متعلق کفار کا کہنا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِى نُزِّلَ عَلَيْهِ ٱلذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ﴾ (الحجر:٦) کہ آپ دیوانے ہیں، بالکل غلط ہے، آپ اللہ کے فضل سے ہرگز دیوانے نہیں ہیں۔

اور کفار کا یہ کہنا بھی غلط ہے: ''زمانے کی گردش کے ساتھ آپ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔'' (الطور:٣٠) اور یہ کہ ''آپ ابتر ہیں۔'' (الکوثر:٣) اور آپ کے بعد آپ کا نام لینے

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۝

اور بلاشبہ تو ایک بڑے خلق پر ہے۔④

والا بھی کوئی نہ ہو گا۔نہیں بلکہ یقین رکھو کہ آپ کے لیے وہ اجر ہے جو کبھی منقطع نہیں ہو گا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی امت کے اعمال حسنہ بھی آپ کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے رہیں گے کیونکہ وہ آپ کی تعلیم ہی سے کیے گئے ہیں: ((وَمَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ)) (صحیح مسلم) ''جو کسی نیکی کی طرف رہنمائی کرے اسے وہ نیکی کرنے والے کی طرح اجر ملے گا۔''

اور کفار کا آپ کے متعلق یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آپ شاعر ہیں یا کاہن ہیں یا نعوذ باللہ کذاب یا متکبر ہیں۔'' (القمر: ۲۵) نہیں بلکہ آپ خلق عظیم پر ہیں۔ ان تینوں آیات میں مخاطب اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہیں مگر اصل میں یہ باتیں کفار کو سمجھائی جا رہی ہیں۔

آیت④ خلق کا لفظی معنیٰ وہ عادتیں جو پیدائشی طور پر انسان میں پائی جاتی ہیں، وہ خصلتیں جو طبیعت میں پختہ ہو جائیں اور اس طرح عادت بن جائیں کہ بغیر سوچے سمجھے خود بخود سرزد ہوتی رہیں، خلق کہلاتی ہیں۔

عام طور پر خلق سے مراد لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا اور انھیں خندہ پیشانی سے ملنا لیا جاتا ہے اگرچہ خلق کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے مگر یہ خلق کا محدود مفہوم ہے۔

صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خلق عظیم کی تفسیر دین سے کی ہے۔(طبری) اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے خلق کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: ((كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ))(مسلم، المسافرین، جامع صلاۃ اللیل، حدیث : ۱۷۳) یعنی آپ کا خلق قرآن تھا۔

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق دین اسلام کی ہر بات پر آپ کا اس طرح عمل تھا جیسے وہ آپ کی طبعی عادت ہو اور بقول عائشہ رضی اللہ عنہا، قرآن مجید آپ کا خلق یعنی آپ کی طبیعت بن گیا تھا وہ سب کچھ جو قرآن میں ہے آپ سے بلا تکلف خود بخود عمل میں آتا تھا جیسے وہ

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّىكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

پس جلد ہی تو دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔⑤ کہ تم میں سے کون فتنے میں پڑا ہوا ہے۔⑥ یقیناً تیرا رب ہی خوب جانتا ہے اس کو جو اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہی خوب جانتا ہے ان کو جو سیدھی راہ پر ہیں۔⑦

آپ کی طبعی خصلت ہے۔ قرآن میں جو حکم دیا گیا اس پر آپ کا عمل تھا، جس سے منع کیا گیا اس سے مکمل اجتناب تھا، جو خوبیاں اختیار کرنے کی تلقین کی گئی آپ ان سے پوری طرح آراستہ تھے اور جن صفات کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے الغرض آپ میں تمام انسانی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں، مثلاً شرف نسب، کمال عقل، درستی فہم، کثرت علم، شدت حیا، کثرت عبادت، سخاوت، صدق، شجاعت، صبر، شکر، مروت، دوستی و محبت، میانہ روی، زہد، تواضع، شفقت، عدل، عفو، برداشت، صلہ رحمی، حسن معاشرہ، حسن تدبیر، فصاحت لسان، قوت حواس، حسن صورت وغیرہ جیسا کہ آپ کی زندگی کے حالات و واقعات میں مذکور ہے۔

اٰیٰت⑤، ⑥ آپ کے خلق عظیم کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے مجنون کہنے اور دوسری تکلیف دہ باتوں پر صبر کریں۔

جلد ہی سے مراد وہ مواقع ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی مختلف طریقوں سے مدد کی، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ آخر کار آپ کے جانی دشمن فوج در فوج آپ پر ایمان لا کر آپ کے جان نثار دوست بن گئے اور جو مخالف رہے وہ بدر و احد اور خندق و فتح مکہ وغیرہ میں مردار ہوئے یا ذلیل و خوار ہوئے۔ تمام جزیرہ عرب پر اسلام کی حکومت ہو گئی، پھر قیامت تک آپ کی امت کے ہاتھوں ہونے والی فتوحات اور اسلام کی سربلندی سے بھی واضح ہو گیا کہ پاگل کون تھا؟ اس کے علاوہ جلد ہی سے مراد قیامت کا دن بھی ہے جب رسول اللہ ﷺ مقام محمود پر تشریف فرما ہوں گے، آپ کے ہاتھ میں **لواء الحمد** ہو گا اور جب آپ حوض پر

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝

پس تو ان جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان۔⑧ وہ چاہتے ہیں کہ تو نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کریں۔⑨

اپنے امتیوں کو پانی پلا رہے ہوں گے اور آپ کو جھٹلانے والے مجرم جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے تب آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی کہ دیوانہ کون ہے؟

آیت ⑧ اس آیت میں اور آئندہ آنے والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان! اور نہ کسی ایسے شخص کا کہنا مان جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل ہے۔ معلوم ہوا یہ کام کرنے والے اللہ تعالیٰ کی نظر میں اتنے برے ہیں کہ وہ کوئی بات بھی کہیں مسلمان کے لیے ان کے کہنے پر چلنا جائز نہیں تو اللہ تعالیٰ کو یہ کس طرح گوارا ہوسکتا ہے کہ مسلمان خود ان جیسے کام کرنے لگیں گویا جب ان صفات والوں کی اطاعت سے منع کیا گیا تو خود یہ صفات اختیار کرنے سے تو بدرجہ اولیٰ منع کر دیا گیا۔

ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ کافر جو بات بھی مسلمان سے منوانا چاہتے ہیں بظاہر وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اس کے پیچھے ان کا کوئی نہ کوئی خبیث مقصد ضرور ہوتا ہے اس لیے ان کا کہنا کسی صورت میں بھی نہیں ماننا چاہیے۔

آیت ⑨ ﴿ تُدْهِنُ ﴾ دُهْن (تیل) سے مشتق ہے۔ جس طرح چمڑے وغیرہ کو تیل لگا کر نرم کیا جاتا ہے اس طرح بات کو نرم کر دینا یعنی ان کی خواہش ہے کہ آپ اسلام کی تبلیغ میں اپنی سرگرمیاں کم کر دیں تو وہ بھی آپ کو ستانے میں کمی کر دیں، آپ اپنے دین میں کچھ ترمیم کر کے اس میں ان کے شرک اور دوسری گمراہیوں کی کچھ گنجائش نکال لیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ صلح کر لیں گے، آپ خود جو چاہیں کریں مگر تمام لوگوں کی زندگی کے ہر شعبہ مثلاً ان کے عقائد، معیشت اور معاشرت، حکومت وغیرہ میں اللہ کے حکم کی تنفیذ پر اصرار چھوڑ دیں تو وہ بھی آپ کے نماز روزے کو برداشت کر لیں، جیسا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیکولر لوگوں کا کہنا ہے کہ دین ذاتی مسئلہ ہے حکومت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ یاد رہے جس

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍۭ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝
عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ءَايَٰتُنَا قَالَ
أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ۝

اور کسی بہت قسمیں اٹھانے والے ذلیل کا کہنا مت مان۔⑩ جو بہت طعنہ دینے والا، چغلی میں بہت دوڑ دھوپ کرنے والا ہے۔⑪ خیر کو بہت روکنے والا، حد سے بڑھنے والا سخت گناہ گار ہے۔⑫ سخت مزاج ہے، اس کے علاوہ بدنام ہے۔⑬ اس لیے کہ وہ مال دار ہے اور بیٹوں والا رہا ہے۔⑭ جب اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔⑮

چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ بات کو نرم کر دینا ہے، لہجے میں نرمی نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ خلق عظیم پر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ کفار کو نرم کرنے کے لیے آپ اپنے موقف اور عقیدے میں نرمی کر دیں، رہی انداز اور لہجے میں نرمی تو وہ آپ کے خلق عظیم کا بھی تقاضا ہے اور اللہ کا حکم بھی۔ گویا آپ کو مداہنت سے منع کیا جا رہا ہے مدارات سے نہیں۔

آیت ⑩ تا ⑮ ان چھ آیات میں مذکور بری خصلتوں والے شخص سے بعض مفسرین نے ایک خاص شخص مراد لیا ہے مگر آیت کے لفظ عام ہیں: ﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴾ ''ایسی خصلتوں والے کسی شخص کا کہنا مت مان'' اس لیے ان خصلتوں والا ہر شخص آیت کا مصداق ہے۔ اس سے پہلی آیات میں مکذبین کی اطاعت سے منع فرمایا تھا، اب انھی جھٹلانے والوں کا ذکر ان خصلتوں کے ساتھ کیا ہے جو دین کو جھٹلانے کی وجہ سے عام طور پر آدمی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ سب کفر کی صفات ہیں آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں سے کوئی بد خصلت اس کے اندر پیدا نہ ہونے پائے۔

آیت⑩ ﴿ حَلَّافٍ ﴾ حلف (باب ضرب) سے مبالغہ ہے، بہت قسمیں کھانے والا ﴿ مَّهِينٍ ﴾ مَهُنَ يَمْهُنُ مَهَانَةً (ک) حقیر، ذلیل ہونا (مَّهِينٍ: حقیر، ذلیل)

یہ دونوں صفتیں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔ زیادہ قسمیں کھانے سے آدمی لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو جاتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل اور بے اعتبار ہونے ہی کی وجہ سے وہ زیادہ قسمیں کھاتا ہے تاکہ اپنی بات کا یقین دلائے کیونکہ وہ خود سمجھتا ہے کہ لوگوں کے دل میں نہ اس کی عزت ہے نہ اعتبار۔

آیت ⑪ ﴿هَمَّازٍ﴾ هَمَزَ يَهْمِزُ هَمْزًا (باب ن) سے مبالغہ ہے، بہت طعنہ دینے والا، عیب لگانے والا۔ ﴿مَشَّاءٍ﴾ مَشَى يَمْشِيْ مَشْيًا (باب ض) چلنا سے مبالغہ ہے، بہت چلنے والا، بہت دوڑ دھوپ کرنے والا۔ ﴿نَمِيْمٍ﴾ چغلی، خرابی ڈالنے کی نیت سے کسی کی بات دوسرے شخص تک پہنچانا۔ ان دونوں صفتوں کا خلاصہ دوسروں پر عیب لگانا ہے۔ ﴿هَمَّازٍ﴾ وہ جو دوسرے کے منہ پر عیب لگاتا اور طعنہ دیتا ہے۔ ﴿مَشَّاءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ وہ جو پیٹھ پیچھے چغلی کرتا ہے یعنی بس چلے تو جرأت سے منہ پر طعنہ زنی اور عیب جوئی کرتا ہے بس نہ چلے تو پیٹھ پیچھے دوڑ دھوپ جاری رکھتا ہے۔

آیت ⑫ ظلم کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کسی کا حق جو آدمی کے ذمے ہو روک لینا' ادا نہ کرنا' دوسری قسم کسی پر زیادتی کرنا۔ ﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ﴾ میں پہلی قسم مبالغے کے ساتھ پائی جاتی ہے اور ﴿مُعْتَدٍ﴾ میں دوسری۔ ﴿أَثِيْمٍ﴾ کا ذکر اس کے ساتھ اس طرح ہے جس طرح ﴿لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ میں ہے۔

آیت ⑬ ﴿عُتُلٍّ﴾ عَتَلَ يَعْتِلُ (باب ن وض) سختی سے گھسیٹنا، جیسے فرمایا: ﴿خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ إِلٰى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ﴾ (الدخان: ۴۸) ''اسے پکڑو پھر سختی سے کھینچتے ہوئے اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک لے جاؤ۔'' عُتُلٌّ موٹے جسم، موٹے دماغ اور سخت مزاج والا۔ ﴿زَنِيْمٍ﴾ کے دو معنے ہیں: جو کسی قوم سے نہ ہو مگر اس میں سے ہونے کا دعویٰ کرے، دوسرا معنیٰ لئیم جو کمینگی اور شرارت میں مشہور ہو۔ بدنام کے لفظ میں دونوں مفہوم ادا ہو رہے ہیں۔

آیت ⑭ ﴿أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ سے پہلے لام محذوف ہے یعنی ﴿لِأَنْ كَانَ﴾ یہ ﴿لَا تُطِعْ﴾ کے متعلق ہے یعنی محض اس لیے آپ اس کا کہنا نہ مانیں کہ وہ مال اور بیٹوں والا

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ۝۱۶ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ۝۱۷

جلد ہی ہم اس کی تھوتھنی پر داغ لگائیں گے۔ ⑯ یقیناً ہم نے انھیں آزمایا ہے جیسے باغ والوں کو آزمایا تھا۔ جب انھوں نے قسم کھائی کہ صبح ہوتے ہوتے اس کا پھل ضرور توڑ لیں گے۔ ⑰

ہے، دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ وہ ہماری آیات کو پہلے لوگوں کی کہانیاں کہہ کر محض اس لیے جھٹلاتا ہے کہ وہ مال اور بیٹوں والا ہے، اس صورت میں یہ بعد والی آیت سے متعلق ہے۔

آیت ⑯ ﴿ اَلْخُرْطُوْمِ ﴾ اصل میں درندوں کی ناک (تھوتھنی) یا ہاتھی کی سونڈ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان بدخصلتوں والے انسان کی ناک کو تحقیر و مذمت کے لیے خرطوم کہا گیا ہے۔ سرکش آدمی چونکہ اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے ہی حق سے انکار کرتا ہے اس لیے قیامت کے دن اسی ناک پر داغ لگایا جائے گا، جو اس کی ذلت کا نشان ہوگا۔ "وَسَمَ يَسِمُ (باب ض) کا معنیٰ داغ اور نشان لگانا ہے۔

آیت ⑰ اہل مکہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ تمام لوگ حج کے لیے ان کے پاس آتے اور اپنی ضروریات کے لیے ان کے گاہک بنتے، وہ جہاں جاتے اہل حرم ہونے کی وجہ سے کوئی انھیں کچھ نہ کہتا۔ ہر قسم کا میوہ ان کے شہر پہنچ جاتا' ان کی تجارت خوب چمکی ہوئی تھی اور وہ نہایت مالدار اور مکمل امن کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ ان نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ انعام کیا کہ ان میں رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا مگر انھوں نے نعمت کی قدر نہ کی بلکہ آپ ﷺ کو جھٹلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ چلے جانے کے بعد قریش نے آپ کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے وہ خود بھی غیر محفوظ ہو گئے، تجارت برباد ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے ان پر قحط مسلط ہو گیا، یہاں تک کہ وہ مردار تک کھا گئے۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ الدخان) اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کی اس حالت کا ذکر ان آیات میں بھی کیا ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ

﴿وَلَا يَسْتَثْنُونَ﴾ ⑱

اور وہ کوئی استثنا نہیں کر رہے تھے۔ ⑱

بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴾ (النحل: ۱۱۲، ۱۱۳) ''اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی اس کے پاس اس کا رزق بافراغت ہر جگہ سے آتا تھا اور اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ ان کے پاس انھی میں سے ایک رسول آیا تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا تو انھیں عذاب نے اس حال میں آ پکڑا کہ وہ ظالم تھے۔''

یہاں اہل مکہ کی ناشکری اور اس پر سزا کے لیے بطور مثال ایک باغ والوں کا قصہ بیان کیا اور فرمایا: ﴿إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ﴾ ''ہم نے مکذبین کو نعمت دے کر آزمایا جس طرح باغ والوں کو نعمت دے کر آزمایا تھا۔'' یہ چند بھائی تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے بہت شاندار باغ عطا فرمایا تھا مگر بجائے اس کے کہ وہ اسے اللہ کی نعمت سمجھ کر اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حصہ نکالتے، انھوں نے قسم کھالی کہ صبح صبح ہی اس کا پھل توڑ لیں گے، کسی مسکین کو نہ آنے دیں گے اور نہ اسے کچھ دیں گے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے جانے سے پہلے ہی آگ لگنے یا کسی اور آسمانی آفت سے باغ برباد ہو گیا، صبح گئے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

﴿بَلَوْنَاهُمْ﴾ بَلَا يَبْلُوْ (باب ن) آزمانا، مصیبت ڈالنا، انعام کرنا۔ ﴿لَيَصْرِمُنَّهَا﴾ صَرَمَ (ض) کاٹنا، کٹنا (صریم: کٹا ہوا) یہ باغ کہاں تھا اور باغ والے کون تھے؟ قرآن نے ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ قرآن واقعات کو بطور تاریخ نہیں بلکہ بطور عبرت بیان کرتا ہے اور اس کے لیے نفس واقعہ ہی کافی ہے...... اس مقام پر سورہ کہف آیت ۳۲ تا ۴۴ بھی دیکھ لیں وہاں بھی عبرت دلانے کے لیے دو باغ رکھنے والے کی مثال پیش کی گئی ہے۔

آیت ⑱ ﴿وَلَا يَسْتَثْنُونَ﴾ اَلِاسْتِثْنَاءُ کسی چیز کو عام حکم سے علیحدہ کرنا، ان شاء اللہ کہنا۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿١٩﴾ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ﴿٢٠﴾ فَتَنَادَوْا
مُصْبِحِينَ ﴿٢١﴾ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ ﴿٢٢﴾ فَانطَلَقُوا وَهُمْ
يَتَخَافَتُونَ ﴿٢٣﴾ أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ﴿٢٤﴾ وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ﴿٢٥﴾

پس اس پر تیرے رب کی طرف سے ایک اچانک عذاب پھر گیا جب کہ وہ سوئے ہوئے
تھے۔ ⑲ تو صبح کو وہ باغ کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا۔ ⑳ پھر انھوں نے صبح ہوتے ہی ایک
دوسرے کو آواز دی۔ ㉑ کہ اگر تمھیں پھل توڑنا ہے تو صبح صبح اپنے کھیت پر جا پہنچو۔ ㉒
چنانچہ وہ چل پڑے اور وہ چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ ㉓ کہ آج اس باغ
میں تمھارے پاس کوئی مسکین ہرگز داخل نہ ہونے پائے۔ ㉔ اور وہ صبح سویرے پختہ ارادے
کے ساتھ اس حال میں نکلے کہ (اپنے خیال میں پھل توڑنے پر) قادر تھے۔ ㉕

آیت کے دو معنے ہیں، ایک یہ کہ انھیں اپنے منصوبے کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ انھوں نے ان شاء اللہ بھی نہیں کہا اور وہ اللہ کی قدرت و مشیّت کو بھی بھول گئے، دوسرا یہ کہ انھوں نے سارا پھل اتار لینے کی قسم کھائی۔ عام طور پر پھل چنتے وقت کچھ پھل مساکین کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن انھوں نے اس کا استثناء بھی نہیں کیا۔

آیت ⑲، ⑳ ''**طائف**'' لفظی معنیٰ ہے پھر جانے والا، چکر لگانے والا، مراد اللہ کی طرف سے اچانک عذاب ہے، جس کے ایک ہی چکر سے باغ کا نام ونشان مٹ گیا یعنی رات باغ کو آگ لگ گئی اور صبح زمین صاف تھی، جس طرح کھیتی کٹنے کے بعد ہوتی ہے۔

آیت ㉑، ㉒ ﴿عَلَىٰ حَرْثِكُمْ﴾ ''اپنے کھیت پر'' معلوم ہوا باغ کے ساتھ کھیتی بھی تھی۔

آیت ㉕ ﴿حَرْدٍ﴾ اس کا ایک معنیٰ ہے، قصد و ارادہ یعنی وہ پختہ ارادے کے ساتھ نکلے کہ کسی مسکین کو باغ میں گھسنے نہیں دیں گے، دوسرا معنیٰ ہے شدید غصہ یعنی وہ مساکین پر سخت غصے کے عالم میں نکلے، دونوں صورتوں میں قادرین کا معنیٰ ہے اس حال میں کہ وہ اپنے خیال میں باغ کے پھل پر قادر تھے۔ ﴿حَرْدٍ﴾ کا تیسرا معنیٰ ہے 'روکنا' یعنی وہ صبح صبح اس حال میں

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

پس جب اسے دیکھا تو کہنے لگے یقیناً ہم راستہ بھولے ہوئے ہیں۔ ۲۶ بلکہ ہم بے نصیب ہیں۔ ۲۷ ان میں سے بہتر نے کہا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ ۲۸ کہنے لگے ہمارا رب پاک ہے، بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے۔ ۲۹

نکلے کہ (اپنے خیال میں) مساکین کو روکنے پر قادر تھے۔

آیت ۲۶، ۲۷ جب باغ نظر نہ آیا تو پہلے تو یہ سمجھے کہ ہم بھول گئے ہیں، پھر جب یقین ہو گیا کہ یہ صاف زمین ہمارا ہی باغ ہے تو کہنے لگے ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

آیت ۲۸، ۲۹ ﴿ اَوْسَطُهُمْ ﴾ کا معنی ان کے درمیان والا بھی ہے اور ان میں سے افضل بھی، جیسے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ (البقرة: ۱۴۳) ”اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا۔“ ﴿ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴾ ان میں سے جو بہتر تھا اس نے انھیں ان کے خبیث ارادے کے وقت نصیحت کی تھی کہ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ اور اس بری نیت سے توبہ کیوں نہیں کرتے؟ مگر انھوں نے اس کی بات نہیں مانی تھی، اب اس نے انھیں وہ بات یاد دلائی۔ ﴿ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴾ کا معنی بعض نے یہ کیا ہے کہ ”تم ان شاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟“ مگر سارا پھل توڑنے کا ارادہ کر کے ان شاء اللہ پڑھ بھی لیتے تو کچھ فائدہ نہ تھا۔ اس لیے یہی معنی درست معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کہا: تم اپنے رب کو یاد کیوں نہیں کرتے، اس کا ہر عیب سے پاک ہونا خصوصاً اس قسم کے بخل سے اور مسکینوں کو محروم کرنے کے ارادے سے پاک ہونا کیوں یاد نہیں کرتے کہ تم بھی اس بخل اور کمینگی سے بچ جاؤ۔

اس معنی کے درست ہونے کا ایک قرینہ یہ ہے کہ جب ان کے بھائی نے انھیں اپنی بات یاد دلائی تو انھوں نے ” سُبْحٰنَ رَبِّنَا “ کہہ کر اس وقت سبحان اللہ نہ کہنے کی تلافی کی کوشش کی۔

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ ﴿٣٠﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طَاغِينَ ﴿٣١﴾ عَسَىٰ
رَبُّنَا أَن يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ ﴿٣٢﴾ كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ
الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٣٤﴾

پھر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر آپس میں ملامت کرنے لگے۔ ۳۰ کہنے لگے ہائے ہماری ہلاکت! یقیناً ہم ہی حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ ۳۱ امید ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس کے بدلے میں اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔ یقیناً (اب) ہم اپنے رب ہی کی طرف راغب ہونے والے ہیں۔ ۳۲ اس طرح ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب تو یقیناً اس سے کہیں بڑا ہے۔ کاش! وہ جانتے ہوتے۔ ۳۳ بلاشبہ ڈرنے والوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت والے باغات ہیں۔ ۳۴

آیت ۳۰ تا ۳۲ اب ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو ملامت شروع کر دی، کوئی کسی کو قصور وار ٹھہراتا کوئی کسی کو، پھر خود ہی کہنے لگے کہ ہائے ہماری بربادی! ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے کہ اللہ کے مال کو اپنا مال سمجھ بیٹھے اور حق دار کو محروم کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اب ہم توبہ کرتے ہیں، اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے رب سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کے بدلے میں اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔

آیت ۳۳ اہل مکہ کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ نعمت کی ناشکری پر عذاب اس طرح ہوتا ہے جس طرح باغ والوں پر آیا اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑا ہے کیونکہ دنیا کے عذاب کے بعد تو توبہ و استغفار کی گنجائش ہے، جیسا کہ اس باغ والوں نے توبہ کرلی اور توبہ کے بعد عذاب سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی بھی امید ہے، جیسا کہ باغ والوں نے، بہتر باغ ملنے کی امید رکھی مگر آخرت کے عذاب کے بعد ان میں سے کسی چیز کی گنجائش نہیں۔

آیت ۳۴ پچھلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنے کی پاداش میں کس طرح باغ والوں کا باغ برباد ہوا اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی بڑا ہے' دنیا کے باغ کے بعد آخرت کے باغات کا ذکر کیا اور فرمایا کہ رب تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے ان کے رب

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝

تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کردیں گے؟ ۳۵ کیا ہے تمھیں، کیسے فیصلے کرتے ہو؟ ۳۶ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم (یہ) پڑھتے ہو۔ ۳۷ کہ یقیناً تمھارے لیے آخرت میں وہی ہوگا جو تم پسند کروگے۔ ۳۸

کے پاس ایک نہیں بلکہ نعمت والے کئی باغ ہیں۔

آیت ۳۵ مشرکین کہا کرتے تھے کہ اول تو مرنے کے بعد زندگی کی بات ہی غلط ہے، اگر یہ سچ ہے اور مرنے کے بعد عذاب یا ثواب ہونا ہے تو ہم یہاں مسلمانوں کی بہ نسبت خوشحال ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے ہم پر راضی ہونے کی دلیل ہے آخرت میں بھی وہ نعمتیں اور باغات ہمیں کو ملیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کی تردید کی اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں اندھیر نہیں کہ حکم ماننے والوں سے اور مجرموں سے ایک جیسا سلوک کیا جائے۔

آیت ۳۷، ۳۸ فائدہ 1 کفار جو کہتے تھے کہ ہمیں آخرت میں بھی جنت و نعمت ملے گی اس کی ایک اور طرح سے تردید ہے، فرمایا: تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ اگر کہو کہ تمھیں خود اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے تو بتاؤ تمھارے پاس اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب ہے؟ جس میں تم نے پڑھا ہے کہ آخرت میں تمھیں تمھاری پسند ہی کی چیزیں ملیں گی۔ صاف ظاہر ہے نہ تمھارے پاس ایسی کوئی کتاب ہے، نہ تمھارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے۔

فائدہ 2 ﴿ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴾ جملہ بن کر ﴿ تَدْرُسُونَ ﴾ کا مفعول بہ ہے "أَن" کا ہمزہ مفتوح ہونا چاہیے تھا لیکن ﴿ مَا تَخَيَّرُونَ ﴾ پر لام آنے کی وجہ سے مکسور ہو گیا ترجمہ یہ ہو گا "کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ بات پڑھتے ہو کہ یقیناً تمھارے لیے آخرت میں وہی ہوگا جو تم پسند کروگے۔"

أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ
أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ﴿٤٠﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ﴿٤١﴾
يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٤٢﴾

یا تمھارے پاس ہمارے ذمے کوئی حلفیہ عہد ہیں جو قیامت کے دن تک جا پہنچنے والے ہیں کہ بے شک تمھیں وہی ملے گا جو تم فیصلہ کرو گے۔ (۳۹) ان سے پوچھ ان میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ (۴۰) یا ان کے کوئی شریک ہیں؟ تو اگر وہ سچے ہیں تو اپنے شریک لے آئیں۔ (۴۱) جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور لوگوں کو سجدے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ (۴۲)

آیت (۳۹) (**ایمان**) **یمین** کی جمع ہے، قسم، حلفیہ عہد، فرمایا: ''یا پھر تمھارے پاس ہمارے کوئی حلفیہ عہد ہوں جو قیامت تک کے لیے ہوں کہ تمھیں وہی ملے گا جو تم فیصلہ کرو گے۔ ظاہر ہے ہمارا عہد اگر ہے بھی تو ان سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہیں۔ مجرموں اور ظالموں سے تو ہمارا کوئی عہد ہے ہی نہیں: ﴿ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴾ (البقرۃ: ۱۲٤) ''میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔''

آیت (۴۰) ان سے پوچھیے ان میں سے کون اس کا ذمہ لیتا ہے کہ آخرت میں انھیں وہی ملے گا جو وہ کہیں گے۔

آیت (۴۱) یا اگر یہ خود ضمانت نہیں دے سکتے تو کیا ان کے پاس ایسی ہستیاں ہیں جو اللہ کے شریک ہوں اور انھیں آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے زبردستی چھڑوا کر جنت دلوانے کا ذمہ دے سکیں، اگر سچے ہیں تو وہ شریک سامنے لائیں۔

آیت (۴۲)، (۴۳) فائدہ (1) ﴿ يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ ﴾ میں ''یوم'' پچھلی آیت میں ﴿ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ ﴾ کے متعلق ہے یعنی دنیا میں تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے جھوٹ موٹ شریک گنوا دیں جو ان کی رہائی کے ذمہ دار بننے کا دعویٰ کریں مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں، اگر

سچے ہیں تو اس دن اپنے شریک سامنے لائیں جس دن پنڈلی سے پردہ ہٹایا جائے گا......الخ۔
یا ﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴾ کے متعلق ہے یعنی متقین کو نعمت والی جنتیں اس دن ملیں گی جب......**الخ**

فائدہ 2 ﴿ یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ﴾ کا ایک معنیٰ تو وہ ہے جو ان لفظوں کا سادہ ترجمہ ہے اور خود بخود ظاہر ہو رہا ہے، ایک وہ ہے جو ان لفظوں کے سادہ ترجمہ سے ہٹ کر کیا گیا ہے اور جو لغت عرب کا ایک محاورہ ہے۔ وہ معنیٰ جو لفظوں کا سادہ ترجمہ ہے اور خود بخود ظاہر ہو رہا ہے یہ ہے کہ ''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی یعنی اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی ظاہر فرمائے گا اور لوگوں کو سجدے کے لیے بلایا جائے گا۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے اور صحیح سند کے ساتھ آپ سے یہی مروی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یَكْشِفُ رَبُّنَا عَنْ سَاقِهٖ فَیَسْجُدُ لَهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ وَ یَبْقٰی مَنْ كَانَ یَسْجُدُ فِی الدُّنْیَا رِیَاءً وَ سُمْعَةً فَیَذْهَبُ لِیَسْجُدَ فَیَعُوْدُ ظَهْرُهٗ طَبَقًا وَاحِدًا)) (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ ن والقلم)

''ہمارا رب اپنی پنڈلی کھولے گا تو ہر مومن مرد اور مومن عورت اس کو سجدہ کریں گے اور وہ شخص باقی رہ جائے گا جو دنیا میں دکھانے اور سنانے کے لیے سجدہ کرتا تھا وہ سجدہ کرنے لگے گا تو اس کی پیٹھ ایک طبق ہو جائے گی (یعنی دوہری نہیں ہو سکے گی)

اس حدیث میں صاف الفاظ موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا، بلکہ صحیح بخاری کے ایک اور مقام پر اسی حدیث میں ہے کہ ہر قوم جس کسی کی پرستش کرتی تھی اس کے پیچھے چلی جائے گی، صلیب والے صلیب کے پیچھے، بتوں والے بتوں کے پیچھے اور دوسرے معبودوں والے اپنے معبودوں کے پیچھے چلے جائیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو اللہ کی عبادت کرتے تھے، خواہ نیک ہوں یا بد اور کچھ بچے کھچے اہل کتاب رہ جائیں گے۔ وہ اللہ

تعالیٰ کا انتظار کر رہے ہوں گے، اللہ ان سے پوچھے گا:

﴿ هَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُ آيَةٌ تَعْرِفُونَهَا فَيَقُولُونَ السَّاقُ فَيَكْشِفُ عَنْ سَاقِهِ فَيَسْجُدُ لَهُ الخ﴾ (دیکھیے: بخاری، التوحید، باب (٢٤) حدیث : ٧٤٣٩)

''کیا تمھارے اور (تمھارے رب) کے درمیان کوئی نشانی ہے، جسے تم پہچانتے ہو؟ وہ کہیں گے ''پنڈلی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا۔''.... الخ

اس سے معلوم ہوا کہ پنڈلی کھولنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کے درمیان اور اہل ایمان کے درمیان طے شدہ نشانی ہو گی اور اس نشانی کو دیکھ کر اہل ایمان رب تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر جائیں گے۔

یہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ حدیث کی دوسری بہت سی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اتنی اعلیٰ درجے کی صحیح سند کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ سے آیت کی تفسیر آنے کے بعد کسی اور تفسیر کی نہ ضرورت رہتی ہے اور نہ گنجائش، مگر چونکہ بہت سے مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر کی ہے اس لیے وہ بھی ذکر کی جاتی ہے۔

ان مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ ''کشف ساق'' لغت عرب کا ایک محاورہ ہے جو شدت سے کنایہ ہے۔ یعنی ﴿ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا دن بہت سخت ہو گا، کیونکہ جب کوئی سختی یا مشکل پیش آتی ہے تو آدمی پنڈلی سے کپڑا اٹھا کر کمر کس لیتا ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور بعض تابعین جیسے مجاہد، عکرمہ اور ابراہیم نخعی وغیرہ سے بھی آتی ہے۔

یہ تفسیر اگرچہ درست ہے اور لغت عرب میں یہ محاورہ استعمال بھی ہوتا ہے مگر پہلی تفسیر (یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا) میں قرآن کے صریح الفاظ کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور یہ تفسیر اس ذات گرامی نے کی ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔ اس لیے یہی مقدم ہے البتہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں۔ اس دن اللہ تعالیٰ کی پنڈلی بھی ظاہر ہو گی اور اس دن کی شدت میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ خود ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر ہونے

کا کبھی انکار نہیں فرمایا اور نہ دیگر صحابہ میں سے کسی نے ان الفاظ کا انکار کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے متعلق اس سلسلے میں قرآن یا حدیث میں آتے ہیں۔

قرآن مجید میں چونکہ یہ صراحت نہیں کہ اللہ کی پنڈلی ظاہر ہوگی بلکہ صرف پنڈلی کا لفظ ہے، اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا مفہوم یہ لیا کہ کشف ساق سے اس دن کی شدت مراد ہے اور یہ مراد لینا لغت عرب کے بالکل مطابق ہے، مگر ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت نقل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر ہوگی، اس لیے مقدم وہی مفہوم ہوگا جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، اگرچہ قیامت کے دن کی شدت بھی اپنی جگہ حقیقت ہے۔

افسوس تو ان لوگوں پر ہے جنھوں نے صاف کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر نہیں ہوگی، نہ اس کی پنڈلی ہے۔ ان لوگوں نے اس سے بڑھ کر اس قسم کے ان تمام الفاظ کا انکار کر دیا جو قرآن میں آئے ہیں مثلاً ہاتھ، چہرہ، آنکھ، پاؤں وغیرہ اور کہا کہ اگر ہم یہ مانیں تو اللہ تعالیٰ کا جسم لازم آتا ہے اور اس کا ہمارے جیسا ہونا لازم آتا ہے جب کہ اس نے خود فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' یہ لوگ ان تمام الفاظ کی کوئی نہ کوئی تاویل کرتے اور ان صفات کے ماننے والوں کو مشبہہ قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ ان کی اس بات کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے جسے وہ اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) یعنی اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے یعنی یہ بھی مانو کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مانو کہ وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی۔

یہ خیال کر کے اس کے سمیع و بصیر ہونے کا انکار نہ کر دینا کہ ہم بھی سمیع اور بصیر ہیں، اگر اسے سمیع و بصیر مانا تو اس کا ہمارے مشابہ ہونا لازم آئے گا۔ نہیں، اس کا سمیع و بصیر ہونا تمھارے سمیع و بصیر ہونے کے مشابہ نہیں ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی پنڈلی، اس کا چہرہ، اس

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ
سَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ فَذَرْنِي وَمَن يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا
يَعْلَمُونَ ﴿٤٤﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٤٥﴾

ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہوگی حالانکہ اس سے پہلے انھیں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا جب وہ صحیح سالم تھے۔ ﴿۴۳﴾ پس چھوڑ مجھے اور اس کو جو اس بات کو جھٹلاتا ہے، ہم انھیں آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف اس طرح سے لے جائیں گے کہ انھیں علم بھی نہ ہوگا۔ ﴿۴۴﴾ اور میں انھیں مہلت دوں گا، یقیناً میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے۔ ﴿۴۵﴾

کا قدم اور جو کچھ اس نے خود اپنے متعلق بتایا، سب برحق ہے، مگر اس کی پنڈلی مخلوق کی پنڈلی کے مشابہ نہیں، نہ کوئی اور صفت مخلوق کی صفت کے مشابہ ہے، وہ اسی طرح ہے، جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صفات الٰہی کی آیات و احادیث کے متعلق سلف صالحین کا طریقہ یہی ہے کہ ان کے ظاہر لفظوں پر ایمان لانا چاہیے اور ان کی کیفیت اللہ کے سپرد کر دینی چاہیے۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا انکار کیا ہے۔ درحقیقت وہ خود تشبیہ میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے اللہ کی پنڈلی، اس کے چہرے اور دوسری صفات کو اپنے اعضا جیسا سمجھا اور یہ سمجھ کر ان سے انکار کر دیا، اگر وہ ان صفات کو اپنی صفات کی مثل خیال نہ کرتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔

آیت ﴿۴۳﴾ گویا آخرت میں ان کی پیٹھ کا تختہ بن جانا اور ان کا سجدے کے قابل نہ رہنا اس بات کی سزا ہے کہ انھوں نے دنیا میں صحیح سالم ہوتے ہوئے، ایک اللہ کو سجدہ کرنے کی دعوت قبول نہ کی۔

آیت ﴿۴۴﴾، ﴿۴۵﴾ یعنی جھٹلانے والوں کو سزا دینے میں اگر تاخیر ہو رہی ہے تو آپ فکر مت کریں انھیں ہمارے سپرد کر دیں، پھر ہم جانیں اور وہ۔ ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُم﴾ ہم انھیں درجہ بدرجہ ہلاکت کی طرف لے جائیں گے یعنی ہم انھیں عمر، صحت اور دوسری نعمتیں مسلسل دیتے جائیں

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ﴿٤٦﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤٧﴾
فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾

کیا تو ان سے کوئی مزدوری طلب کرتا ہے کہ وہ تاوان سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ ﴿۴۶﴾ یا ان کے پاس غیب کا علم ہے تو وہ لکھتے جاتے ہیں۔ ﴿۴۷﴾ پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جا، جب اس نے اس حال میں پکارا کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ ﴿۴۸﴾

گے، وہ شکر کی بجائے کفر میں بڑھتے جائیں گے اور انجام کار جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ کفر و فسق کے باوجود نعمتیں بڑھتی جائیں تو یہ اللہ کی طرف سے استدراج اور اس کی خفیہ تدبیر ہے۔
(دیکھیے المومنون:٥٦، الانعام:٤٤،الاعراف:١٨٣)

آیت ﴿۴۶﴾ ان کے اسلام قبول نہ کرنے کا ایک عذر یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہوں، جو ان کے لیے خواہ مخواہ کی چٹی اور بوجھ ہو، ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

آیت ﴿۴۷﴾ یا یہ عذر ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس غیب کا علم ہے، وہ خود کتاب الٰہی لکھ سکتے ہیں تو انھیں آپ پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؟ یا انھوں نے غیب سے معلوم کر کے لکھ دیا ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں یا انھوں نے اپنے متعلق غیب سے معلوم کر کے لکھ رکھا ہے کہ انھیں آخرت میں بھی دنیا جیسی نعمتیں ملتی رہیں گی، ظاہر ہے، ایسا بھی ہرگز نہیں ہے۔

آیت ﴿۴۸﴾ مچھلی والے سے مراد یونس علیہ السلام ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار صبر سے کریں، عذاب آنے میں دیر سے پریشان نہ ہوں، انھیں دی ہوئی مہلت کو لمبا سمجھ کر جلد بازی اور اکتاہٹ میں کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھیں جیسا مچھلی والے (یونس علیہ السلام) سے سرزد ہوا کہ وہ اجازت کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یونس کے واقعہ کے لیے دیکھیے: (سورہ یونس:٩٨، الانبیا:٨٧۔٨٨، والصافات:١٣٩۔١٤٨،) یونس علیہ السلام کی ندا یہ تھی: ﴿لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ..... الخ﴾ (الانبیاء : ٨٧) ”تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں، تو پاک ہے یقیناً میں ظلم کرنے والوں میں

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ۝ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝

اگر یہ نہ ہوتا کہ اسے اس کے رب کی نعمت نے سنبھال لیا تو وہ چٹیل زمین پر اس حال میں پھینکا جاتا کہ وہ مذمت کیا ہوا ہوتا۔ ۴۹ پھر اس کے رب نے اسے چن لیا اور اسے نیکوں میں شامل کر دیا۔ ۵۰

سے تھا۔'' اور غم سے بھرے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن ان کے دل میں کئی غم اور صدمے اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک قوم کے ایمان نہ لانے کا غم' دوسرا ان سے عذاب ٹل جانے کا، تیسرا صریح اجازت کے بغیر اپنے چلے آنے کا، چوتھا سمندر میں پھینک دیے جانے کا، اور پانچواں مچھلی کے پیٹ میں قید ہو جانے کا۔ ان سب غموں اور صدموں کا علاج انھوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا، تسبیح اور استغفار سے کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر غم سے نجات عطا فرما دی۔

آیت ۴۹ اگر یونس علیہ السلام تسبیح و استغفار نہ کرتے تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ (و الصافات: ۱۴۳' ۱۴۴)

تسبیح کے بعد دائمی قید کا فیصلہ ختم ہو گیا، مگر مرتبے میں جو کمی ہوئی اور اپنی خطا کی وجہ سے جس ملامت کے سزاوار ٹھہرے، اگر ان کے رب کی نعمت انھیں نہ سنبھالتی اور ان کی خطا معاف نہ کر دی جاتی اور اسی حالت میں عراء (چٹیل زمین) میں پھینک دیے جاتے تو اس حالت میں وہ مذموم ہوتے، مگر نعمت الٰہی سے تمام کوتاہیوں کی تلافی کے بعد، عراء میں پھینکے گئے تو وہ مذموم نہ تھے بلکہ محمود تھے۔

آیت ۵۰ چنے ہوئے تو پہلے بھی تھے، اب ان کا مرتبہ اور بڑھا دیا، انھیں اعلیٰ درجے کے نیک اور شائستہ بندوں میں داخل کر دیا۔ ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی بندے کو لائق نہیں کہ وہ کہے: میں یونس بن متیٰ سے بہتر ہوں۔'' (صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث: ۳۴۱۳' ۳۴۱۶)

وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ
لَمَجْنُونٌ ﴿٥١﴾

اور بلاشبہ وہ لوگ جو کافر ہیں جب ذکر سنتے ہیں تو قریب ہے کہ تجھے اپنی نظروں سے (گھور گھور کر) پھسلا دیں اور کہتے ہیں کہ یقیناً یہ تو دیوانہ ہے۔ ﴿٥١﴾

آیت ﴿٥١﴾ اس آیت میں ''إِنْ'' اصل میں ''إِنَّ'' (نون مشدد کے ساتھ) تھا، کیونکہ بعد میں ﴿ لَيُزْلِقُونَكَ ﴾ پر لام آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب کفار کو اللہ تعالیٰ کی آیات سناتے، بت پرستی کی مذمت کرتے تو وہ سخت غصے میں آ کر آپ کو قہر کی نظر سے گھور گھور کر دیکھتے اور آپ کو دیوانہ قرار دیتے، سورہ حج میں ہے کہ قریب ہے کہ وہ ہماری آیات پڑھنے والوں پر حملہ ہی کر دیں۔ (حج: ۷۲)

﴿ لَيُزْلِقُونَكَ ﴾ أَزْلَقَ يُزْلِقُ، پھسلانا۔ اس کا معنیٰ 'ہلاک کرنا' بھی آتا ہے، کیونکہ پھسل کر گرنے سے آدمی ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ جب ذکر سنتے ہیں تو آپ کو اتنے غصے اور اتنی تیز نظروں سے گھور گھور کر دیکھتے ہیں، جیسے آپ کو آپ کے موقف ہی سے پھسلا دیں گے، دوسرا معنیٰ ہے، جیسے آپ کو ہلاک ہی کر دیں گے، یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے، فلاں شخص نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے مجھے کھا ہی جائے گا۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بعض قبیلے ایسے تھے کہ جن کی نظر بہت جلد لگ جاتی تھی اس لیے وہ آپ ﷺ کو بری نظروں سے دیکھتے تھے، تاکہ آپ کو نظر لگ جائے، اگرچہ نظر کا حق ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن یہاں اس تفسیر کا موقع نہیں، کیونکہ اگر کوئی کسی چیز کو اچھا سمجھ کر دیکھے تو نظر لگا کرتی ہے، غصہ کی نظر سے نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں ان کے دیکھنے کو ﴿ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ ﴾ سے مقید کیا ہے، یعنی جب وہ ذکر سنتے ہیں تو آپ کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں الخ۔ ایسے غصے کے وقت نظر لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور وہ روایتیں بھی مضبوط نہیں ہیں

وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

حالانکہ وہ تمام جہانوں کے لیے نصیحت کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ﴿۵۲﴾

(کذا قال صاحب احسن التفاسیر و ابن الجوزی فی زاد المسیر)

آیت ﴿۵۲﴾ یعنی قرآن کی آیتوں میں تو وہ نصیحتیں ہیں کہ جن کے اثر سے ایک دو نہیں، بلکہ ایک عالم راہ راست پر آنے والا ہے، ایسی نصیحت کے سنانے والے کو جو دیوانہ بتاتا ہے وہ خود دیوانہ ہے۔ (احسن التفاسیر)

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝

وہ ہو کر رہنے والی۔ ① کیا ہے وہ ہو کر رہنے والی۔ ② اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ ہو کر رہنے والی کیا ہے؟ ③ ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی (قیامت) کو جھٹلا دیا۔ ④

تفسیر سورۃ الحاقۃ

آیت ① تا ③ ﴿ اَلْحَآقَّةُ ﴾ حَقَّ يَحِقُّ (ض ون) ''ثابت ہونا، واجب ہونا'' سے فاعلۃ کے وزن پر ہے یعنی ہو کر رہنے والی، واجب ہونے والی، جس کا ہونا حق ہے، مراد قیامت ہے کیونکہ وہ ہو کر رہے گی۔ اسی لیے اس کا نام الواقعہ بھی ہے۔ قیامت کا ذکر استفہامیہ فقروں سے شروع کیا گیا ہے۔ یہ اہل بلاغت کا خاص اسلوب ہے۔ اس سے ایک تو سننے والے کو متوجہ کرنا اور شوق دلانا مقصود ہوتا ہے، دوسرا قیامت کی عظمت اور ہولناکی بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ اتنی عظیم الشان ہے کہ نہ تمھاری سمجھ میں پوری طرح آ سکتی ہے اور نہ کوئی اور ایسا ہے جو تمھیں معلوم کروا سکے کہ وہ کیا ہے؟

آیت ④ ﴿ اَلْقَارِعَةِ ﴾ قَرَعَ (ف) کھٹکھٹانا۔ کسی سخت چیز پر دوسری چیز سے ضرب لگانا، یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، کیونکہ وہ بھی اسی طرح یک لخت آ کھٹکھٹائے گی جیسے کوئی آنے والا زور سے دروازہ آ کھٹکھٹاتا ہے اور آدمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

کفار کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ قیامت کا انکار کرنے والے پہلے لوگ تم ہی نہیں، بلکہ تم سے پہلے عاد و ثمود نے جو قوت و شوکت میں تم سے کہیں بڑھ کر تھے، اس کھٹکھٹانے والی (قیامت)

﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ﴾

سو جو ثمود تھے وہ حد سے بڑھی ہوئی (آواز) کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔⑤ اور جو عاد تھے وہ سخت ٹھنڈی تند آندھی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے جو قابو سے باہر ہونے والی تھی۔⑥

کو جھٹلایا، پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ ثمود جو عرب کے شمال مغرب اور عاد جو عرب کے جنوب مشرق کی متمدن ترین قومیں تھیں، توحید کے انکار کے بعد ان کا سب سے بڑا جرم قیامت اور آخرت کا انکار تھا۔ جس نے انھیں سرکش بنا دیا تھا اور جس کی پاداش میں آخر کار انھیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔

موجودہ زمانے کی مادہ پرست بزعم خویش مہذب قوموں کی سرکشی کا اصل باعث بھی قیامت اور جزا و سزا کا انکار ہے۔

آیت⑤ ﴿اَلطَّاغِيَةِ﴾ طَغٰی يَطْغٰی) سے اسم فاعل ہے اور عافیۃ کی طرح مصدر بھی ہو سکتا ہے۔

اسم فاعل ہو تو ﴿اَلطَّاغِيَةِ﴾ کا معنیٰ، حد سے بڑھنے والی ہے اور یہ **الرجفة یا الصیحة الصاعقة** کی صفت ہو گی، یعنی ثمود اس زلزلے سے یا آواز سے یا بجلی کی کڑک سے ہلاک کر دیے گئے، جو آوازوں کی حد سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ یہ فرشتے کی آواز تھی یا بجلی کی کڑک تھی، جس کے ساتھ زلزلہ بھی تھا یا زلزلے کے ساتھ آنے والی خوفناک آواز تھی۔ **رجفة** کے لیے دیکھیے۔ الاعراف: ۷۸ اور **صیحة** کے لیے دیکھیے۔ ھود: ٦٧ اور **صاعقة** کے لیے حم السجدۃ: ۱۷۔

مصدر ہو تو معنیٰ حد سے بڑھنا ہے۔ **باسببیة** گی یعنی ثمود اپنے حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے، جیسے فرمایا: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ﴾ (الشمس: ۱۱) ''قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے (صالح علیہ السلام کو) جھٹلا دیا۔''

آیت⑥ ﴿صَرْصَرٍ﴾ یہ **صِرٌّ** سے مشتق ہے، جس کا معنی سخت ٹھنڈک اور تیزی ہے یعنی

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ

اللہ نے اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھا۔ سو تو ان لوگوں کو اس میں اس طرح زمین پر گرے ہوئے دیکھے گا جیسے وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہوں۔ ⑦

سخت ٹھنڈی اور تند آندھی، یا صَرْصَر یُصَرْصِرُ صَرْصَرَۃً (سخت آواز نکالنا) سے مشتق ہے، یعنی سخت آواز والی آندھی۔ ﴿عَاتِيَةٍ﴾ عَتَا یَعْتُوْ عُتُوًّا (ن) قابو سے باہر ہونا، سرکشی کرنا، یعنی وہ ہوا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بھی قابو کرنے والے کے قابو سے باہر تھی۔

آیت ⑦ ﴿حُسُوْمًا﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنیٰ 'پے در پے' کیا ہے۔ (ابن جریر) اس صورت میں یہ ﴿حَسَمْتُ الدَّابَّةَ﴾ سے مشتق ہے، یعنی میں نے جانور کو پے در پے داغ لگائے، یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ آندھی ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھی، ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکی۔

حَسَمَ یَحْسِمُ (ض) کا معنیٰ جڑ سے کاٹنا بھی ہے۔ اس صورت میں یہ حاسم کی جمع ہے جیسے شاہد کی جمع شہود ہے، معنیٰ ہوگا ان پر وہ آندھی جڑ سے کاٹ ڈالنے والی سات راتوں اور آٹھ دنوں تک چلائے رکھی۔ حُسُوْمًا مصدر بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے شُکُوْرًا اور کُفُوْرًا ہے، اس صورت میں یہ مفعول لہ ہوگا، یعنی ان پر وہ آندھی سات راتیں اور آٹھ دن جڑ سے کاٹ ڈالنے کے لیے چلائے رکھی۔ مزید تراکیب کے لیے طویل کتب تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

﴿صَرْعٰى﴾ صریع کی جمع ہے، پچھاڑ کر گرائے ہوئے، ہلاک کیے ہوئے۔ ﴿اَعْجَازُ﴾ جمع عَجُزٌ و عِجْزٌ کسی چیز کا آخری حصہ، درخت کا تنا۔ ﴿خَاوِيَةٍ﴾ خَوَى یَخْوِیْ (ض) گر پڑنا، خالی ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے قوم عاد سے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ایک عرصہ تک بارش روکے رکھی۔ ادھر وہ پیغمبر کو زچ کرنے کے لیے بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جب عذاب بادل کی

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝

تو کیا تو ان کا کوئی بھی باقی رہنے والا دیکھتا ہے؟⑧اور فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے اور الٹ جانے والی بستیوں نے گناہ کا ارتکاب کیا۔⑨اور انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اس نے انھیں ایک سخت گرفت میں پکڑ لیا۔⑩

صورت میں نمودار ہوا اور انھوں نے اسے اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو خوش ہو گئے کہ اب بارش ہو گی، مگر تھوڑی ہی دیر میں عذاب شروع ہو گیا جو مغرب کی طرف سے آنے والی تیز ٹھنڈی آندھی کی صورت میں تھا، جس نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا، تفصیل کے لیے دیکھیے (الاحقاف: ۲۱ تا ۲۶) سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلنے کے بعد آندھی تھمی تو ان کی لاشیں اس طرح گری ہوئی تھیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔ اہل ایمان کے علاوہ ایک شخص بھی باقی نہ بچا۔ اس تشبیہ سے اس قوم کا مضبوط جسامت اور لمبے قدوں والا ہونا صاف معلوم ہو رہا ہے۔ سورہ احقاف (۲۶) اور الفجر (۸ تا ۱۰) میں ان کی قوت و شوکت کا کچھ حال بیان ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری مدد (خندق کے موقع پر) صبا یعنی مشرق سے آنے والی ہوا کے ساتھ کی گئی اور عاد کو دبور یعنی مغرب سے آنے والی ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ (بخاری، کتاب الانبیاء: ۳۳۴۳ و مسلم)

آیت ⑨، ⑩ ﴿ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ ﴾ اِئْتَفَكَ (افتعال) سے اسم فاعل ہے اور محذوف لفظ القری (بستیوں) کی صفت ہے، یعنی الٹ جانے والی بستیاں۔ مراد لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں جن کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا گیا اور پھر ان پر کھنگر یلے پتھروں کی بارش برسا دی گئی۔ دیکھیے (ھود: ۷۷ تا ۸۳ اور الحجر: ۶۱ تا ۷۴)

﴿ اَلْخَاطِئَةِ ﴾ عافیہ کے وزن پر مصدر ہے۔ گناہ خطا۔ ﴿ رَّابِيَةً ﴾ **ربا یربو** (ن) سے اسم فاعل ہے۔ زیادہ ہونا، بڑھنا، یعنی وہ گرفت اپنی شدت میں دوسری گرفتوں سے بہت

﴿إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ ۝﴾

بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا تمھیں کشتی میں سوار کیا۔⑪ تاکہ ہم اسے تمھارے لیے ایک یاددہانی بنا دیں اور یاد رکھنے والا کان اسے یاد رکھے۔⑫

بڑھی ہوئی تھی یعنی فرعون نے اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور قوم لوط نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی سخت گرفت میں پکڑ لیا گناہ کیا تھا؟ ﴿فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ﴾ ’اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کرنا۔

آیت ⑪ نوح علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان کا ذکر کیا ہے، فرمایا: ”نوح علیہ السلام کی قوم کے کفر و شرک پر اصرار کی وجہ سے جب پانی اتنا بڑھا کہ عام حدوں سے کہیں اونچا ہو گیا تو ہمیں تھے جنھوں نے تمھیں اس سے پہلے ہی کشتی میں سوار کر لیا اور پھر اتنے بے حساب پانی میں اس کشتی کو محفوظ رکھا، ورنہ اس طوفان سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہاں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے زمانے کے لوگوں سے خطاب ہو رہا ہے مگر مراد یہی ہے کہ تمھارے آبا کو سوار کیا، وہ سوار ہوئے تو تم بھی سوار ہوئے کیونکہ تم ان کی پشتوں میں تھے اگر وہ اس کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے نجات نہ پاتے تو آج تمھارا وجود بھی نہ ہوتا۔

آیت ⑫ ﴿لِنَجْعَلَهَا﴾ میں ”ھا“ کی ضمیر اس واقعہ کی طرف جا رہی ہے یعنی تاکہ ہم اس واقعہ کو تمھارے لیے ایک نصیحت اور یادگار بنا دیں۔ نوح علیہ السلام کی قوم کا یہ واقعہ پشت در پشت نقل ہو کر آ رہا تھا اور عرب کے لوگ اچھی طرح اس سے واقف تھے۔

بعض مفسرین نے اس ضمیر ”ھا“ سے مراد الجاریۃ (کشتی) بھی لیا ہے، مگر اس کے بعد آنے والے الفاظ: ﴿وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ﴾ ”اور اسے یاد رکھنے والا کان یاد رکھے۔“ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ضمیر سے مراد واقعہ ہے کیونکہ وعی یعی معنیٰ سوچ سمجھ کر سننا اور یاد رکھنا

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝

بس جب صور میں ایک ہی دفعہ پھونکا جائے گا۔⑬ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا اور دونوں ایک ہی بار ٹکرا دیے جائیں گے۔⑭ تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی۔⑮

ہوتا ہے۔ کان سے مراد کانوں والے انسان ہیں جو واقعہ کو سنیں تو اس سے عبرت پکڑیں کہ آخرت کے انکار اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے کا انجام کتنا ہولناک ہوتا ہے۔

فائدہ آیات ⑬ تا ⑱ قرآن مجید میں بعض مقامات پر پہلے **نفخہ** کے وقت پیش آنے والے واقعات ذکر کیے گئے ہیں بعض پر دوسرے **نفخہ** کے وقت اور بعض مقامات پر انھیں اکٹھا ہی ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان آیات میں بھی پہلے **نفخہ** سے لے کر دوسرے **نفخہ** کے بعد تک کے حالات بیان ہوئے ہیں، زمین اور پہاڑوں کے ٹوٹنے کا سلسلہ تو پہلے **نفخہ** کے وقت کا ہے اور آسمان کا پھٹنا، فرشتوں کا اس کے کناروں پر ہونا، عرش الٰہی کو آٹھ فرشتوں کا اٹھائے ہوئے ہونا' اللہ تعالیٰ کا میدان محشر میں نزول فرمانا اور سب بندوں کا حساب کتاب کے لیے پیش کیا جانا، یہ سب کچھ دوسرے **نفخہ** کے بعد کا ہے۔

آیت ⑬ تا ⑮ ﴿ الْوَاقِعَةُ ﴾ یعنی قیامت کے منکروں کا دنیا میں انجام ذکر کرنے کے بعد اب اس کے واقع ہونے کی کیفیت بیان ہوتی ہے کہ صور میں اچانک ایک پھونک ماری جائے گی، اس کے ساتھ ہی زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر، ایک ہی بار ٹکرا کر، ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور تمام زندہ لوگ مر کر گر جائیں گے۔ یہ واقعہ یک لخت ہوگا' اس کے وقت کا کسی کو بھی علم نہیں۔ حتیٰ کہ صور میں پھونکنے والے کو بھی نہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کیسے خوش حال ہو کر رہوں جب کہ صور والا (فرشتہ) صور منہ میں لیے ہوئے اور کان لگائے ہوئے ہے اور پیشانی جھکا کر انتظار کر رہا ہے کہ اسے صور میں پھونکنے کا حکم کب ہوتا ہے؟ (ترمذی و صححہ الالبانی، انظر صحیح الجامع الصغیر:٤٥٩٢)

وَّانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ ۟ۙ وَّالْمَلَكُ عَلٰۤی اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَیَحْمِلُ عَرْشَ
رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِیَةٌ ۟ؕ یَوْمَىِٕذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰی مِنْكُمْ خَافِیَةٌ ۟

اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن بہت کمزور ہو گا۔ ⑯ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ ⑰ اس دن تم پیش کیے جاؤ گے، تمھاری کوئی چھپی ہوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔ ⑱

آیت ⑯ تا ⑱ فائدہ ① دوسرے **نفخہ** کے ساتھ یہ مضبوط آسمان، جس میں لاکھوں کروڑوں سال سے ایک شگاف بھی نہیں پڑا، بالکل کمزور ہو کر پھٹ جائے گا اور فرشتے اس کے کناروں پر چلے جائیں گے، اس دن آٹھ فرشتے عرش الٰہی کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ اور فرشتے صف در صف زمین پر تشریف لائیں گے، ادھر ایک طرف جہنم لائی جائے گی۔ (دیکھیے تفسیر سورۃ الفجر: ۲۱ تا ۲۳) دوسری طرف جنت قریب لے آئی جائے گی۔ (الشعراء: ۹۰، ۹۱) اس وقت سب لوگ اپنے اعمال کی جزا کے لیے اللہ کے حضور پیش کیے جائیں گے۔ کسی شخص کا کوئی عمل چھپا نہیں رہ سکے گا۔

فائدہ ② یہ آیت اللہ تعالیٰ کے عرش کے وجود کی زبردست دلیل ہے، جو لوگ عرش الٰہی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں اس سے مراد صرف حکومت ہے، قیامت کے دن آٹھ فرشتوں کا عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہونا ان کی تردید کرتا ہے۔ یہ حضرات نہ عرش کے وجود کے قائل ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا مانتے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کا قیامت کے دن زمین پر آنا مانتے ہیں اور نہ اس کا اوپر کی جانب ہونا مانتے ہیں، حالانکہ یہ سب کچھ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں موجود ہے۔ ایک بزرگ جنھوں نے ہر جگہ عرش الٰہی کی تاویل 'حکومت و فرمانروائی' سے کی ہے، اس مقام پر آٹھ فرشتوں کے عرش الٰہی کو اٹھانے کے صریح الفاظ کی کوئی تاویل نہیں کر سکے تو انھوں نے اسے آیات متشابہات میں سے قرار دے کر تسلیم کیا ہے کہ ''ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے؟ اور نہ سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۚ﴿۲۰﴾

سو جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا وہ کہے گا لو پکڑو میرا اعمال نامہ پڑھو۔ ⑲ یقیناً میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں۔ ⑳

اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی؟'' کیا ہی بہتر ہوتا کہ اسی طرح وہ اللہ کے عرش کے اوپر ہونے کو بھی مانتے اور اس کے زمین پر آنے کو بھی مانتے اور اس کی کیفیت اللہ کے سپرد کر دیتے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر کس طرح ہے اور وہ زمین پر کس طرح اترے گا کیونکہ قرآن و حدیث کی نصوص اور سلف صالحین کا یہی طریقہ ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ الفجر آیت ۲۲ کی تفسیر۔

''یہ کہنا کہ فرشتوں کا حامل عرش ہونا حق تعالیٰ کی شان قیومیت کے منافی ہے، محض اپنی سطحیت کا اظہار کرنا ہے، اگر قیومیت کے یہ معنیٰ لے لیے جائیں تو ایک اس مسئلہ پر کیا موقوف ہے ملائکہ کو واسطہ بنا کر ان سے کام لیتے رہنے کا سارا نظام ہی باطل ہو جاتا ہے۔'' (ماجدی)

آیت ⑲ ﴿ هَآؤُمُ ﴾ اسم فعل ہے۔ ابن عطیہ نے فرمایا اس کا معنیٰ ہے ''آؤ'' زمخشری نے فرمایا: ﴿ هَآؤُمُ ﴾ ایک آواز ہے، جس سے ''خذ'' یعنی ''لو پکڑو'' کا مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ (التسهیل)

﴿ كِتٰبِيَهْ ﴾ میں ''ها'' وقف کے لیے ہے، ضمیر نہیں ہے۔ جیسے **ماهيه** میں ہے۔ **حسابيه** **ماليه** اور **سلطانيه** میں بھی ایسے ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملے گا وہ اتنا خوش ہوگا کہ دوسروں کو بلا بلا کر دکھاتا پھرے گا جیسے دنیا میں بھی انسان کوئی بڑی خوشی ملنے پر پکار پکار کر دوسروں کو اس میں شریک کرتا ہے۔

آیت ⑳ ﴿ اِنِّيْ ظَنَنْتُ ﴾ ظن کا لفظ وہم، گمان اور یقین تینوں چیزوں کے لیے آتا ہے کیونکہ یہ اصل میں علامات اور نشانیوں کے ذریعے سے حاصل ہونے والی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے، نشانیاں کمزور ہوں تو وہم یا گمان تک معاملہ رہتا ہے، اگر مضبوط ہوں تو غالب گمان اور علم و یقین کا معنیٰ دیتا ہے۔ خصوصاً جب اس کے ساتھ ''اَنَّ'' بھی ہو۔ (مفردات) یہاں **ظَنَنْتُ**

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۝ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا
بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝

پس وہ ایک خوشی والی زندگی میں ہوگا۔㉑ ایک بلند جنت میں۔㉒ جس کے میوے قریب ہوں گے۔㉓ کھاؤ پیو مزے سے ان اعمال کے عوض جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں آگے بھیجے۔㉔

کا لفظ غالب گمان کے معنیٰ میں ہے، جو دن بدن دلائل کے ساتھ یقین سے بدلتا جاتا ہے، اسی غالب گمان ہی کی وجہ سے انسان قیامت کے دن کے حساب سے ڈر کر اللہ کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ اگر مکمل یقین کے بغیر وہ اللہ کی نافرمانی چھوڑنے پر تیار نہ ہو تو مکمل یقین تو قیامت سامنے آنے پر ہی ہوگا، اس وقت اس یقین کا کوئی فائدہ نہیں۔ صاحب احسن التفاسیر فرماتے ہیں کہ ”قرآن شریف میں یقین کی جگہ ظن کا لفظ عقبیٰ کی باتوں میں اس لیے بولا گیا ہے کہ پورا یقین ان باتوں کا مرنے کے بعد ہوگا۔“

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ وہ اپنی خوش قسمتی کی وجہ یہ بتائے گا کہ اس نے دنیا میں یہ سمجھ کر زندگی بسر کی کہ آخر ایک دن اس کا حساب ہونا ہے۔

آیت ㉑ جنت میں کوئی فکر و غم ہوگا نہ مرض، نہ موت، نہ تھکاوٹ، نہ بڑھاپا، نہ کوئی نقص، نہ عیب اور نہ کمزوری۔ ہر نعمت جو دل چاہے گا بلکہ جو خیال کی رسائی سے بھی بلند ہے، ملے گی۔ ان تمام باتوں کو **عیشۃ راضیۃ** لفظ سے ادا فرما دیا ہے۔

آیت ㉓ ﴿قُطُوْفُ﴾ **قَطَفَ** (ض) پھل توڑنا۔ قطوف، قطف کی جمع ہے (بکسر القاف) وہ پھل جو توڑے جائیں۔ ﴿دَانِيَةٌ﴾ قریب یعنی وہ خوشے اور پھل جھکے ہوئے ہوں گے کہ آدمی کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں لے سکے گا۔

آیت ㉔ ﴿هَنِيْٓـًٔا﴾ **هَنُؤَ يَهْنُؤُ** (ک) سے فعیل کے وزن پر ہے، جس کے حاصل ہونے میں کوئی مشقت ہو نہ کھانے کے بعد معدے پر کوئی بوجھ ہو، ادھر کھایا، ادھر ہضم ہوا۔ ﴿بِمَآ اَسْلَفْتُمْ﴾ معلوم ہوا نیک اعمال جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔

وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ۝ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ۝

اور لیکن جسے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا وہ کہے گا کاش! مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا۔ ۲۵ اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ ۲۶ اے کاش کہ وہ (موت) کام تمام کردینے والی ہوتی۔ ۲۷ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا۔ ۲۸ میری حکومت مجھ سے برباد ہوگئی۔ ۲۹

آیت ۲۵ تا ۲۹ جن لوگوں کو بائیں ہاتھ میں اعمالنامہ دیا جائے گا وہ نہایت پریشانی میں یہ باتیں کہیں گے، جو ان آیات میں ذکر ہوئی ہیں۔ یہ بائیں ہاتھ میں اعمالنامے والے کافر لوگ ہوں گے۔ اس کی دلیل آگے آنے والی آیت ہے: ﴿إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ﴾ (الحاقة:۳۳) ”یعنی وہ عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا“ ایمان والوں کو دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملے گا، البتہ وہ ایمان والے جو کچھ عرصہ آگ میں رہیں گے ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ انھیں اعمال نامہ آگ میں جانے سے پہلے ملے گا یا آگ سے نکلنے کے بعد، راجح یہی ہے کہ آگ سے نکلنے کے بعد ملے گا، کیونکہ اعمال نامہ ملنے کے بعد اگر انھیں آگ میں بھیجا جا رہا ہوتو ان کے منہ سے: ﴿هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ﴾ کے خوشی کے الفاظ نہیں نکل سکتے۔ (التسهیل)

﴿يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ﴾ یعنی موت میرا کام تمام کر دیتی۔ دوبارہ نہ اٹھایا جاتا۔ ﴿مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ۜ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو بھوکے بھیڑیے جو بھیڑ بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں، انھیں اس سے زیادہ تباہ و برباد نہیں کرتے جتنا آدمی کی مال اور سرداری کی حرص اس کے دین کو تباہ و برباد کرتی ہے۔ (ترمذی) تمام عمر انھی دو چیزوں کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں گزار دینے کے بعد اس وقت افسوس سے کہے گا کہ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا اور میری سرداری بھی برباد ہوگئی۔ ﴿سُلْطَانِيَهْ﴾ سلطان سے مراد دلیل و حجت ہو تو مطلب یہ ہے کہ میرے سارے دلائل اور حجت بازیاں جن سے میں حق والوں

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُۙ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُۙ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُۙ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِۙ

اسے پکڑو، پس اسے طوق پہنا دو۔ ۳۰ پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو۔ ۳۱ پھر ایک زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، اسے داخل کر دو۔ ۳۲ بلاشبہ وہ عظمت والے اللہ پر دل سے یقین نہیں رکھتا تھا۔ ۳۳ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ ۳۴

کو لاجواب کرتا تھا آج بے کار ہو گئے اور سرداری و حکومت ہو تو مطلب یہ ہے کہ آج میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا، وہ جتھے اور پارٹیاں' وہ فوج اور پولیس کے دستے، وہ اہل خانہ، وہ نوکر چاکر جن پر میرا حکم چلتا تھا سب غائب ہو گئے، دوسروں پر اقتدار تو دور کی بات ہے اپنے ہی اعضا نے میری سرداری ماننے سے انکار کر دیا ہے، بلکہ میرے خلاف شہادتیں دے رہے ہیں۔ ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴾ سے حجت و دلیل اور حکومت و سرداری دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

آیت ۳۰ تا ۳۲ حکم ہو گا اسے پکڑو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو۔ پھر اسے ایک زنجیر میں جکڑ دو جو ستر ہاتھ لمبی ہے۔ جہنمیوں کو جہنم میں طوقوں اور زنجیروں سے جکڑ کر لمبے لمبے ستونوں سے باندھ دیا جائے گا تا کہ حرکت نہ کر سکیں کیونکہ حرکت سے بھی عذاب میں کچھ تخفیف ہوتی ہے: ﴿اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌۙ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ (الھمزہ)
''یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بندی کی ہوئی ہے، لمبے لمبے ستونوں میں۔''

ستر ہاتھ سے مراد یہ پیمائش بھی ہو سکتی ہے اور بہت زیادہ لمبائی بھی کیونکہ عربوں کے ہاں ستر کا عدد کثرت کے لیے بھی آتا ہے، پھر ہو سکتا ہے کہ یہ زنجیر ہر مجرم کے لیے الگ الگ ہو اور یہ بھی کہ ایک ہی زنجیر میں سب کو پروتے چلے جائیں۔ (التسہیل)

آیت ۳۳، ۳۴ عذاب کا باعث یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ یہ تھا کہ اس پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا، یعنی اسے مانتا ہی نہیں تھا یا اس کے ساتھ کچھ شریک بنا رکھے تھے اور بندوں کے ساتھ یہ تھا کہ مسکین کو خود کھلانا دور کی بات ہے کسی دوسرے کو اسے کھلانے کی ترغیب بھی نہیں دیتا تھا۔ اس نے اللہ کا حق پہچانا نہ بندوں کا۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌۙ۝۳۵ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍۙ۝۳۶ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخٰطِـُٔوْنَ۠۝۳۷

سو آج یہاں نہ اس کا کوئی دلی دوست ہے۔۳۵ اور نہ اس کے لیے زخموں کے دھوون کے علاوہ کوئی کھانا ہے۔۳۶ جسے گناہ گاروں کے علاوہ کوئی نہیں کھاتا۔۳۷

آیت ۳۵ ﴿ حَمِيْمٌ ﴾ دوست یا رشتہ دار جسے اس کی خاطر گرمی آئے۔ حَمَّةٌ چشمے سے نکلنے والا گرم پانی، حمیم گرم پانی کو بھی کہتے ہیں۔

آیت ۳۶ ﴿ غِسْلِيْنٍ ﴾۔ غَسَلَ يَغْسِلُ (ض) سے فِعْلِيْنٌ کا وزن ہے، زخم یا کوئی گندی چیز دھونے سے نکلنے والا پانی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد جہنمیوں کے زخموں سے نکلنے والا لہو اور پیپ ہے۔

آیت ۳۷ ﴿ الْخٰطِـُٔوْنَ ﴾ خَاطِئٌ کی جمع ہے۔ جو جان بوجھ کر نادرست کام کرے جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل) ''بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے۔'' اگر کسی سے قصد و ارادہ کے بغیر نادرست کام ہو جائے تو وہ ''مُخْطِئٌ'' ہے۔ (المفردات والستھیل)

آیت ۳۷ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شاعر کہتے کبھی کاہن، کبھی یہ کہتے کہ اس نے یہ کلام اپنے پاس سے بنا کر اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا ہے، کبھی کہتے کسی دوسرے آدمی نے اسے بنا کر دیا ہے، کبھی کہتے یہ پریشان خواب و خیال ہیں، کبھی آپ کو دیوانہ قرار دیتے۔ دیکھیے:

(الانبیاء:۵، الصافات:۳۶، الطور:۲۹، النحل:۱۰۳)

ان تمام باتوں کا اللہ تعالیٰ نے الگ الگ جواب بھی دیا ہے مگر ان آیات میں ایک ہی جگہ دلیل کے ساتھ سب باتوں کی تردید فرما دی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَۙ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ قسم سے پہلے ''لَا'' کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ درست نہیں۔ قسم کا مقصد کسی بات کی تاکید ہوتا ہے اور عام طور پر قسم اس بات کے لیے دلیل اور شاہد

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۳۸﴾ وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿ۙ۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۚ﴿ۙ۴۰﴾ وَّ مَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿ۙ۴۱﴾

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس کی جسے تم دیکھتے ہو!﴿۳۸﴾ اور جسے نہیں دیکھتے!﴿۳۹﴾ بلاشبہ یہ (قرآن) ایک معزز پیغام لانے والے کا قول ہے۔﴿۴۰﴾ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم بہت کم یقین کرتے ہو۔﴿۴۱﴾

ہوتی ہے، یہاں جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس میں خالق ومخلوق، ماضی، حال، مستقبل، زمین و آسمان، دنیا و آخرت غرض سب کچھ آجاتا ہے۔ قرآن میں مذکور قسموں میں، یہ سب سے جامع قسم ہے یعنی جو کچھ تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے، میں ان سب کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔

آیت﴿۳۸﴾ تا ﴿۴۱﴾ یہ چار آیات جواب قسم ہیں پہلی یہ کہ یہ قرآن ایک معزز پیغام لانے والے کا قول ہے، دوسری یہ کہ یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تیسری یہ کہ یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں اور چوتھی یہ کہ یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔

اس قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ ان چاروں چیزوں کے حق ہونے کی شہادت دے رہا ہے اور جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے، اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے، وہ یہ بات جاننے کے لیے کافی تھا کہ یہ قرآن جس شخص کی زبان سے ادا ہو رہا ہے، وہ نہ شاعر ہے نہ کاہن، نہ جھوٹا ہے نہ اپنے پاس سے بات گھڑنے والا اور نہ کسی ذاتی مفاد یا عہدے کا طالب، بلکہ وہ اللہ کا معزز رسول ہے۔ یہی بات ہرقل نے کہی تھی جب اس نے ابوسفیان سے آپ کے متعلق سوال کیے اور ابوسفیان کو آپ کے اوصاف حمیدہ کی شہادت دینا پڑی۔ (دیکھیے صحیح بخاری، حدیث:۷) اور یہی بات آپ نے اللہ کے حکم سے اہل مکہ سے کہی تھی: ﴿فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ (یونس:۱۶) یعنی اعلان نبوت سے پہلے میں نے (چالیس سال کی) ایک عمر تم میں گزاری ہے، کیا تم عقل نہیں کرتے؟

وہ رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق، صدق، امانت، ایفائے عہد، لوگوں کے ساتھ ہمدردی

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۚ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ

اور نہ کسی کاہن کا قول ہے، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔ ﴿۴۲﴾ یہ جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ ﴿۴۳﴾

کو بھی دیکھ رہے تھے اور شاعروں کے جھوٹ، مبالغے، قول و فعل کے تضاد اور خوشامد و تملق جیسی کمینگیوں کو بھی جانتے تھے۔

آیت ﴿۴۲﴾، ﴿۴۳﴾ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی کہی ہوئی باتوں کا بھی مشاہدہ کیا تھا کہ نہ ماضی کے متعلق آپ کی بتائی ہوئی کوئی بات خلاف واقعہ نکلی نہ آئندہ کے متعلق آپ کی کوئی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی، اور کاہنوں کی غیب کے متعلق بتائی باتوں کا بھی تجربہ کیا تھا کہ ان کی ملأ اعلیٰ سے چرائی ہوئی کوئی ایک بات اگر درست نکلتی ہے تو سو باتیں جھوٹ بھی نکلتی ہیں، شاعروں اور کاہنوں کے مقابلے میں آپ کے احوال کا مشاہدہ اس بات کے یقین کے لیے کافی تھا کہ آپ نہ شاعر ہیں نہ کاہن۔

انھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، مگر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ قرآن مجید کے چیلنج کے باوجود وہ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی سورہ بھی نہیں لا سکے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ بھی شہادت دے رہا ہے کہ یہ قرآن ایک معزز رسول کی زبان سے پہنچایا جا رہا ہے۔ یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے، نہ کاہن کا اور جو کچھ تم نہیں دیکھتے خواہ وہ عقل سے سمجھ میں آنے والی چیزیں ہوں، جو حواس خمسہ کی دسترس سے باہر ہیں یا عقل سے بھی ماورا ہوں، سب کی شہادت وہی ہے جو تمھاری دیکھی ہوئی چیزوں کی ہے۔ میں ہر چیز کو پیدا کرنے والا، اس بات پر تمھاری دیکھی ہوئی اور تمھاری نہ دیکھی ہوئی تمام چیزوں کی قسم اٹھاتا ہوں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام پر قرآن کو رسول اللہ ﷺ کا قول قرار دیا گیا ہے، جب کہ سورۂ مدثر میں اس شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے جس نے کہا تھا: ﴿إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ کہ یہ قرآن تو بشر کا قول ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ مدثر میں جہنم کی

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝

اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ ۴۴ تو ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ ۴۵ پھر اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔ ۴۶ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔ ۴۷

وعید اس لیے سنائی گئی کہ اس شخص نے قرآن کو بشر کا اپنا قول قرار دیا تھا، جب کہ زیر تفسیر آیت میں اسے بشر کا یا انسان کا اپنا قول نہیں کہا گیا بلکہ اسے رسول کریم، یعنی ایک معزز پیغام لانے والے کا قول کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے پیغام لانے والے کی بات اپنی نہیں ہوتی بلکہ اسے جو پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے، وہ آگے پہنچا دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی بات کرتا ہے تو وہ رسول نہیں۔ اس کی ایک اور دلیل بعد میں آنے والی آیت بھی ہے: ﴿ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے، بشر کی اپنی بات میں اور قاصد ہونے کی حیثیت سے پہنچائی ہوئی بات میں جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ سورۂ تکویر میں جو قرآن مجید کو رسول کریم کا قول قرار دیا گیا ہے، وہاں اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہاں انھی کی صفتیں بیان ہوئی ہیں، مثلاً: ﴿ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴾ (التکویر: ۲۰، ۲۱) ”بڑی قوت والا ہے عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے، وہاں اس کی بات مانی ہوئی ہے امانت دار ہے۔“

بعض مفسرین نے یہاں بھی جبریل علیہ السلام مراد لیے ہیں مگر یہاں نبی ﷺ مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہاں قرآن کو رسول کریم کا قول قرار دینے کے بعد فرمایا یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں۔ ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریل کو نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کو شاعر و کاہن قرار دیتے تھے۔ بہر حال اسے جبریل علیہ السلام کا قول قرار دیا جائے یا رسول اللہ ﷺ کا دونوں صورتوں میں ان کا قول اس حیثیت سے ہے کہ وہ رسول تھے۔ انھوں نے وہی آگے پہنچایا جو دے کر انھیں بھیجا گیا تھا۔

﴿ كَاهِنٍ ﴾ ستاروں وغیرہ کا حساب لگا کر یا جنوں سے سن کر غیب کی خبریں بتانے والا۔

آیت ۴۴ تا ۴۷ ان آیات میں کفار کی اس بات کا رد ہے کہ یہ باتیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے دل سے بنا کر اللہ کے ذمے لگا دی ہیں۔ فرمایا جب یہ ثابت ہوگیا کہ آپ اللہ کے سچے رسول

ہیں اور آپ کی کہی ہوئی ہر بات اللہ کی بات ہے تو اب اگر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے ذمے باتیں لگانے دے اور اس پر انھیں کچھ نہ کہے تو وہ سب باتیں اللہ کی باتیں سمجھی جائیں گی، اللہ تعالیٰ اس کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے؟ فرمایا: ”اگر ہمارا یہ سچا رسول کوئی بات گھڑ کر ہمارے ذمے لگا دیتا تو اس جعلسازی کے جرم میں ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے اور کوئی شخص رستے میں رکاوٹ نہ بن سکتا۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے غلط استدلال کیا ہے کہ اگر کسی مدعی نبوت کی جان کی رگ دعوئ نبوت کرتے ہی نہ کاٹ دی جائے تو یہ اس کے نبی ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ سچے نبی کے بارے میں ہے، نبوت کے جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے، جھوٹے مدعی نبی تو نبوت ہی نہیں خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور مدتوں زمین پر دندناتے رہتے ہیں، یہ ان کے سچے ہونے کا ثبوت نہیں، اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جس طرح بادشاہ کسی شخص کو کسی منصب پر مقرر کر کے سند وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں، اب اگر وہ کوئی بات جھوٹ گھڑ کر بادشاہ کے ذمے لگا دے تو فوراً بادشاہ کی طرف سے اس کی تردید کی جاتی ہے اور ایسا کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی سڑک کوٹنے والا مزدور یا صفائی کرنے والا بھنگی اعلان کرتا پھرے کہ بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا ہے تو نہ سننے والے اس کی پروا کرتے ہیں نہ حکومت فوراً اس سے تعرض کرتی ہے۔

ہمارے زمانے کے دجال قادیانی کا اس آیت سے استدلال اور خود اس کے کلام میں سے اس کا رد دیکھنے کے لیے تفسیر ثنائی ملاحظہ فرمائیں۔((فَاِنَّهٗ كَفٰى وَ شَفٰى رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى رَحْمَةً وَاسِعَةً))

﴿ تَقَوَّلَ ﴾ کا معنیٰ ہے، کسی کے ذمے وہ بات لگانا جو اس نے نہیں کہی۔ ﴿ الْاَقَاوِيْلِ ﴾ اُقْوُوْلَةٌ کی جمع ہے، جس طرح اعجوبة اور اضحوكة کی جمع اعاجیب اور اضاحیک ہے۔ ﴿ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴾ سے مراد یا تو یہ ہے کہ ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی گردن کی رگ کاٹ دیتے، یہ سزا کی ہولنا کی دکھانے کے لیے قتل کی تصویر کشی ہے کیونکہ جب

وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۝ وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ۝ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝

اور یقیناً یہ (قرآن) ڈرنے والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ ۴۸ اور بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ یقیناً جھٹلانے والے ہیں۔ ۴۹ اور یقیناً وہ کافروں کے لیے حسرت کا باعث ہے۔ ۵۰

قتل کرنے والا کسی مجرم کو تلوار مارنے لگتا ہے تو اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتا ہے یا یہ مطلب ہے اللہ تعالیٰ خود اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگ جان کاٹ دیتے۔ بعض مفسرین نے یمین کا معنی قوت کیا ہے، یعنی ہم اسے پوری قوت سے پکڑ کر اس کی رگ جان کاٹ دیتے۔ عرب کے محاورہ میں یہ معنی بھی استعمال ہوتا ہے، مگر یہ معنی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا انکار کر دینا درست نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ﴾ (المائدہ: ٦٤)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كِلْتَا يَدَيْ رَبِّيْ يَمِيْنٌ)) ''میرے رب کے دونوں ہاتھ دائیں (برکت والے) ہیں، البتہ اس بات میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں جیسے نہیں : ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ بلکہ اس طرح ہیں جس طرح اس کی شان کے لائق ہیں۔

﴿ الْوَتِيْنَ ﴾ گردن کی وہ رگ جو دل سے ملتی ہے، جس کے کٹنے سے آدمی فوراً مر جاتا ہے۔ (عبدہٗ)

آیت ۴۸ یعنی اس نصیحت سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

آیت ۴۹ ''ہم جانتے ہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان جھٹلانے والوں کو سزا دیں گے، جیسے فسادیوں کو ڈانٹنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو سب ہمیں معلوم ہے۔

آیت ۵۰ یعنی یہ جھٹلانا کفار کے لیے باعث حسرت ہو گا یا یہ قرآن کفار کے لیے باعث حسرت و افسوس ہو گا کہ انھوں نے اسے کیوں جھٹلایا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ (الحجر: ۲) ''کسی وقت کافر آرزو کریں گے کہ کاش! وہ مسلم ہوتے۔''

وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾

اور بلاشبہ وہ ثابت شدہ یقین ہے۔ ﴿٥١﴾ پس اپنے عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر۔ ﴿٥٢﴾

آیت ﴿٥١﴾ ﴿ حَقُّ الْيَقِينِ ﴾ حق کا معنی ''جو ثابت ہو'' یقین ''وہ بات جس میں کوئی شک نہ ہو۔'' قرآن مجید سے یقین کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں: پہلا علم الیقین، وہ یقین جو خبر وغیرہ سے معلوم ہو جائے، جیسے فرمایا: ﴿ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ﴾ (التکاثر : ٥۔٦) ''ہرگز نہیں، کاش! تم یقینی جاننا جان لیتے کہ تم ضرور جہنم کو دیکھو گے۔''

دوسرا عین الیقین، وہ یقین جو آنکھوں کے دیکھنے سے حاصل ہو آنکھوں سے دیکھی ہوئی بات کا یقین سنی ہوئی بات کے یقین سے قوی ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ)) سننا دیکھنے کی طرح نہیں (مسند احمد ، صحیح الجامع الصغیر: ٥٣٧٣) ابراہیم علیہ السلام نے ﴿ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ ﴾ کہ کر یقین کے اس مرتبہ کی درخواست کی تھی۔ تیسرا حق الیقین، وہ یقین جو کسی چیز کو خود استعمال کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ہر طرح پختہ اور ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ پہلے دونوں درجوں سے بڑھ کر ہے۔ ان تینوں درجوں کی مثال یہ ہے کہ اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بتانے سے جنت کا یقین ہے، یہ علم الیقین ہے۔ جب میدان محشر میں جنت قریب لائی جائے گی۔ ﴿ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴾ (الشعراء : ٩٠) ''اور متقی لوگوں کے لیے جنت قریب لائی جائے گی۔'' اور وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیں گے تو یہ عین الیقین ہے، پھر جب اس میں داخل ہوں گے اور اس کی نعمتوں سے لذت اٹھائیں گے تو انھیں حق الیقین حاصل ہوگا۔ فرمایا یہ قرآن حق الیقین ہے یعنی قرآن میں جو علوم و معارف وحقائق بیان ہوئے ہیں جو شخص ان کی لذت سے آشنا ہو جائے اس کے لیے یہ ہر طرح سے ثابت شدہ یقین ہے۔ (خلاصہ بدائع التفسیر و تفسیر عبد الرحمن السعدی)

آیت ﴿٥٢﴾ یعنی یہ مانیں یا نہ مانیں آپ اپنے عظمت والے رب کے نام کی، جس کا یہ کلام

ہے تسبیح بیان کرتے رہیں۔ اس کی برکت سے آپ کے لیے ہر مشکل آساں ہو جائے گی۔

اس آیت کے بعد بھی اور رکوع میں بھی ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ)) پڑھنا چاہیے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں کھڑے ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی رکعت میں بقرہ، نساء اور آل عمران پڑھیں، حذیفہ فرماتے ہیں: آپ ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے رہتے جب آپ کسی ایسی آیت پر سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ تسبیح پڑھتے، جب کسی سوال پر سے گزرتے تو سوال کرتے، جب پناہ مانگنے کی آیت پر سے گزرتے تو پناہ مانگتے پھر آپ نے رکوع کیا اور آپ ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ)) پڑھتے رہے، آپ کا رکوع قیام کی مثل تھا، پھر آپ نے ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہا، پھر آپ نے رکوع کے قریب لمبا قیام کیا، پھر آپ نے سجدہ کیا اور سجدہ میں ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى)) پڑھتے رہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلوٰۃ اللیل)

رکوعاتہا ۲ (۷۰) سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ (۷۹) اٰیاتہا ۴۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ

ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کے متعلق سوال کیا جو واقع ہونے والا ہے۔ ① کافروں پر، جسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ ②

تفسیر سورۃ المعارج

آیت ①، ② ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴾ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ایک پوچھنے والے نے عذاب کے متعلق سوال کیا ہے (کہ وہ کب آئے گا؟) اس صورت میں با بمعنی عن ہوگی اور مراد کفر کا وہ سوال ہے جو وہ بار بار عذاب کو جھٹلانے اور مذاق کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (الملک: ۲۵) ''اور وہ کہتے ہیں کہ وہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا؟ اگر تم سچے ہو۔''

دوسرا معنی یہ ہے کہ ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے۔ اس سے مراد کفار کے سرکش لوگوں کی وہ دعا ہے جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ محمد ﷺ جو کچھ لے کر آئے ہیں اگر یہ حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔ (الانفال: ۳۲) اور کفار کا وہ مطالبہ بھی مراد ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے کرتے رہتے تھے کہ ہم پر جلد از جلد عذاب لے آؤ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ (العنکبوت: ۵۳) ''یہ لوگ آپ سے جلدی عذاب لانے کا سوال کرتے ہیں۔''

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا پوچھنے والا عذاب کے متعلق پوچھتا ہے کہ وہ کب آئے گا؟ مانگنے والا مطالبہ کرتا ہے کہ عذاب لے آؤ تو سن لو کہ وہ عذاب کافروں پر ضرور آ کر

مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ

اللہ کی طرف سے جو سیڑھیوں والا ہے۔③ فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، (وہ عذاب) ایک ایسے دن میں (ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے۔④

رہے گا، کوئی اسے ہٹا نہیں سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر آئے گا۔ آپ ان کے مطالبہ پر نہ اس کے جلدی آنے کا سوال کریں نہ ان کے مذاق اڑانے پر کسی قسم کی بے صبری کا مظاہرہ کریں، وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں اور ہمیں وہ بالکل قریب نظر آ رہا ہے۔

﴿ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ یا تو واقعہ کے متعلق ہے یعنی وہ عذاب کافروں پر واقع ہونے والا ہے، کوئی اسے ہٹا نہیں سکتا یا ''دَافِعٌ'' کے متعلق ہے، یعنی ''کافروں سے اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔''

آیت ③، ④ ﴿ الْمَعَارِجِ ﴾ عَرَجَ يَعْرُجُ (ن) سے مِعْرَجٌ کی جمع ہے۔ چڑھنے کا آلہ، سیڑھی، زینہ۔ یعنی اس عذاب کو معمولی نہ سمجھو بلکہ وہ اس اللہ کی طرف سے ہوگا جو سیڑھیوں والا ہے یعنی اس کی ذات بہت ہی بلند ہے۔ فرشتوں کو اس کے حضور پیش ہونے کے لیے کئی سیڑھیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ﴿ مَعَارِجِ ﴾ (سیڑھیوں) سے مراد آسمان ہیں کیونکہ فرشتے آسمانوں پر چڑھتے ہوئے سدرۃ المنتہٰی کے پاس اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔

(فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں) یہاں روح سے مراد یا تو جبریل علیہ السلام ہیں کیونکہ قرآن میں ان کا نام 'الروح' ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ (الشعراء: ١٩٤۔١٩٥) ''یعنی اس قرآن کو روح امین نے تمھارے دل پر نازل کیا ہے۔'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (البقرہ: ٩٧) ''کہہ دو جو جبریل کا دشمن ہے (وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟) کیونکہ بلاشبہ اس نے تو اسے تمھارے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے۔'' دونوں آیتیں ملانے سے ثابت ہوتا ہے کہ الروح سے

مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ فرشتوں سے ان کا الگ ذکر، ان کی عظمت شان کی وجہ سے ہے یا مراد مومنوں کی ارواح ہیں کیونکہ نیک لوگ جب فوت ہوتے ہیں تو فرشتے ان کی ارواح کو آسمان کی طرف لے کر جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے ان کے لیے کھلتے چلے جاتے ہیں، جیسا کہ ابو ہریرہ اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم کی صحیح احادیث میں آیا ہے۔ (دیکھیے، نسائی، الجنائز، باب (۹) حدیث : ۱۸۳۲، ابوداوٗد، حدیث : ۴۷۵۳، مسند احمد : ۲۸۷/۴، ۲۸۸)

البتہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والوں کی ارواح کو لے کر فرشتے چڑھتے ہیں تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ (الاعراف: ۴۰ و احادیث مذکورہ بالا)

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا بلندی پر ہونا اور فرشتوں اور روح کا اس کی طرف چڑھنا صاف ثابت ہو رہا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے اوپر کی جانب ہونے اور عرش پر ہونے کے منکر ہیں وہ قرآن مجید کی صاف صریح آیات سن کر بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا رب اوپر کی جانب ہے۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زمان و مکان کی قیود سے منزہ ہے، حالانکہ یہ کسی نے کہا ہی نہیں کہ بلندی یا عرش اس کے لیے قید ہے یا وہ ان کا محتاج ہے۔

(ایک ایسے دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے) اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، ایک ایسے دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے، یعنی وہ اتنی بلندی پر ہے کہ فرشتوں اور روح کو اس کی بارگاہ میں پہنچنے کے لیے اتنی بلندیوں پر چڑھنا پڑتا ہے کہ کوئی اور چڑھے تو اسے پچاس ہزار سال لگ جائیں، مگر فرشتے اور روح وہ فاصلہ ایک دن میں طے کر لیتے ہیں (ابن جریر) واضح رہے کہ پچاس ہزار سال کا عدد بھی صرف فاصلے کی دوری بیان کرنے کے لیے ہے، کیونکہ انسان کی محدود نظروں نے آلات کی مدد سے جو کچھ دیکھا ہے اس سے آسمان کے نیچے ہی اتنی وسیع کہکشائیں معلوم ہوئی ہیں کہ زمین سے ان کے ستاروں کے فاصلے ماپنے کے لیے نوری سال کی اصطلاح وضع کرنی پڑی۔ عربی زبان میں پچاس، سو، ہزار وغیرہ کا عدد کثرت کے بیان کے لیے عام استعمال ہوتا ہے اس سے مراد گنتی نہیں ہوتی۔

فرشتے اور روح اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی قوت وسرعت کی بدولت تحت الثریٰ سے لے کر ساتوں آسمانوں کے اوپر تک پچاس ہزار سال کا یہ فاصلہ ایک ہی دن میں طے کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت سے ہر ایک کام سات آسمانوں پر سے اتنی جلدی ہو جاتا ہے تو ان عذاب مانگنے والوں پر عذاب کے آنے میں کیا دیر لگتی ہے، بس تھوڑا سا صبر کریں۔آیت کے الفاظ کی رو سے یہ معنیٰ قریب ہے کیونکہ فی یوم سے پہلے متصل ہی: ﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ﴾ آیا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب ایک ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے، اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس صورت میں: ﴿ فِيْ يَوْمٍ ﴾ کا لفظ (واقع) کے متعلق ہے۔

یہ معنیٰ زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صحیح حدیث سے بھی، اس لیے حافظ ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

سورہ طور کے شروع میں فرمایا: ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ، مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ، يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ، وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴾ (طور : ۷۔۱۰) ”یقیناً تیرے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہنے والا ہے اسے کوئی ہٹانے والا نہیں، جس دن آسمان لرزے گا سخت لرزنا اور زمین چلے گی بہت چلنا۔“ ان آیات میں بھی رب تعالیٰ کا عذاب جسے کوئی ہٹانے والا نہیں، قیامت کے دن واقع ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ آیات زیر تفسیر میں بھی: ﴿ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ کے دو آیت بعد فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ، وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴾ (المعارج: ۸۔۹) ”یعنی یہ پچاس ہزار سال والے دن کا عذاب اس دن ہوگا جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔“ جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴾ سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے زکاۃ نہ دینے والے کو قیامت کے دن ہونے والے عذاب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا: ((حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَ عِبَادِهٖ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝

پس تو صبر کر، بہت اچھا صبر۔⑤ بے شک وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں۔⑥ اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔⑦ جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔⑧ اور پہاڑ (رنگین) اون کی طرح ہو جائیں گے۔⑨

خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ (صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب اثم مانع الزكاة)

(عذاب ہوتا رہے گا) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھاری گنتی سے پچاس ہزار سال ہے۔ قیامت کے دن کی یہ درازی کفار کے لیے ہوگی اور دوسرے عذاب کے ساتھ بجائے خود ایک عذاب ہوگی ویسے بھی مصیبت کے دن لمبے ہوتے ہیں، رہے اہل ایمان تو وہ اس دن بالکل بے فکر ہوں گے: ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (یونس:٦٢) ''نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (الانبیاء:١٠٣) ''انھیں سب سے بڑی گھبراہٹ غمگین نہیں کرے گی اور انھیں فرشتے لینے کے لیے آئیں گے۔'' ﴿وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ﴾ (النمل:٨٩) ''اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔'' خوشی کے دن گزرنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔

آیت⑤ تا⑦ یعنی کفار کے عذاب کے مطالبہ اور مذاق پر صبر کریں: ﴿صَبْرًا جَمِيْلًا﴾ جس میں نہ تنگدلی ہو نہ گھبراہٹ، نہ جلد بازی، نہ شکوہ ہو اور نہ شکایت۔ یہ لوگ اس عذاب کو بعید سمجھ رہے ہیں کیونکہ ان کا اس پر ایمان نہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں کیونکہ اس کا آنا یقینی ہے اور تمھارے پچاس پچاس ہزار سال ہمارے ہاں ایک دن شمار ہوتے ہیں۔

آیت⑧، ⑨ ﴿كَالْمُهْلِ﴾ آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح (سرخ اور گرم ہو کر پھٹ جائے گا) (دیکھیے الرحمان:٣٧) ﴿الْعِهْنِ﴾ اُون، پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح بالکل ہلکے

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝۱۰ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـــــْٔوِيْهِ ۝۱۳ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝۱۴ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝۱۵ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶

اور کوئی دلی دوست کسی دلی دوست کو نہیں پوچھے گا۔ ⑩ حالانکہ وہ انھیں دکھائے جا رہے ہوں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں دے دے اپنے بیٹوں کو۔ ⑪ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو۔ ⑫ اور اپنے خاندان کو جو اسے جگہ دیا کرتا تھا۔ ⑬ اور ان تمام لوگوں کو جو زمین میں ہیں پھر اپنے آپ کو بچا لے۔ ⑭ نہیں نہیں، یقیناً وہ (جہنم) ایک شعلہ مارنے والی آگ ہے۔ ⑮ منہ اور سر کی کھال کو اتار کھینچنے والی ہے۔ ⑯

ہو کر اڑنے لگیں گے۔ (دیکھیے طٰہٰ: ۱۰۵ ۔ والقارعۃ: ۵)

اٰیت ⑩ تا ⑭ کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھے گا اس لیے نہیں کہ وہ دکھائی نہ دے رہا ہو گا بلکہ ﴿يُّبَصَّرُوْنَهُمْ﴾ ہر شخص کو اس کے عزیز دوست دکھلائے جا رہے ہوں گے، آنکھوں کے سامنے ہوں گے، نہ پوچھنے کی وجہ یہ ہوگی کہ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی، مجرم دنیا میں جن جن پر اپنی جان قربان کرتا تھا اس دن سب کو، بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو اپنی جان بچانے کے لیے عذاب الٰہی کے حوالے کر دینا پسند کرے گا۔ اس مقام پر رشتہ داروں کی ترتیب میں پہلے ان کا ذکر کیا جو سب سے زیادہ محبوب ہیں بیٹے، بیوی، بھائی، خاندان سورۂ عبس میں اس کا الٹ ہے۔ ﴿فَصِيْلَتِهِ﴾ خاندان، کنبہ، کیونکہ وہ قبیلے سے جدا ہوتا ہے۔ ﴿تُـــْٔوِيْهِ﴾ اٰوٰی یُؤوِی (افعال) جگہ دینا، پناہ دینا۔

اٰیت ⑮ ﴿كَلَّا﴾ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ وہ اپنے فدیہ میں کسی اور کو عذاب کے حوالے کر کے بچ جائے بلکہ وہ جہنم ایک شعلے مارنے والی آگ ہے۔

اٰیت ⑯ ﴿نَزَّاعَةً﴾ مبالغہ کا صیغہ ہے (بہت اتار کھینچنے والی) مبالغہ کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کے شعلے کی لپیٹ فوراً ہی سر اور چہرے کی کھال جلا کر اتار کھینچے گی اور یہ بھی کہ وہ کھال بار بار درست ہوتی رہے گی اور آگ کا شعلہ اسے بار بار جلاتا رہے گا، البتہ دل

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۙ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ﴿۲۱﴾

وہ (ہر) اس شخص کو پکارے گی جس نے پیٹھ پھیری اور منہ موڑا۔﴿۱۷﴾ اور (مال) جمع کیا اور اسے بند رکھا۔﴿۱۸﴾ بلاشبہ انسان تھڑدلا بنایا گیا ہے۔﴿۱۹﴾ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔﴿۲۰﴾ اور جب بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔﴿۲۱﴾

قائم رہے گا تا کہ عذاب کی تکلیف برقرار رہے۔ (دیکھیے النساء:۵۷)

آیت﴿۱۷﴾ یعنی جن لوگوں نے دنیا میں ایمان کی طرف بلائے جانے پر پیٹھ پھیر لی اور منہ موڑ لیا تھا اب جہنم انھیں اپنی طرف بلائے گی اور اس طرح نہیں بلائے گی کہ چاہیں تو جائیں اور چاہیں تو نہ جائیں۔

آیت﴿۱۸﴾ فائدہ ① (اَوْعٰى) وعاء برتن کو کہتے ہیں، یعنی برتن میں بند رکھا۔ پچھلی آیت اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کے جہنم میں جانے کے بڑے اسباب دو ہیں ایک ایمان نہ لانا بلکہ حق بات سن کر منہ پھیر لینا دوسرا شدید بخل۔ (دیکھیے: الحاقہ:۳۳، ۳۴)

فائدہ ② جہنم کا کلام کرنا اس آیت سے بھی ثابت ہے اور ﴿ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ (ق:۳۰) سے بھی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن آگ سے ایک گردن نکلے گی جس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھتی ہوں گی اور دو کان ہوں گے جو سنتے ہوں گے اور زبان ہوگی جو بولتی ہوگی وہ کہے گی کہ مجھے تین (قسم کے آدمیوں) پر مقرر کیا گیا ہے ہر جبار عنید پر اور ہر اس شخص پر جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنائے اور مصوروں پر۔ (ترمذی و صححہ الالبانی، باب ما جاء فی صفة النار) اس طرح صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت اور دوزخ کی بحث کی حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے جہنم کے کلام کا انکار کرنا یا اس کی تاویل کرنا درست نہیں قرآن مجید کے مطابق قیامت کے دن زمین بھی بات کرے گی، ہاتھ پاؤں اور چمڑے بھی گفتگو کریں گے پھر جنت یا جہنم کے بولنے میں کیا تعجب ہے؟

آیت﴿۱۹﴾ تا﴿۲۱﴾ یعنی انسان میں پیدائشی طور پر یہ کمزوری رکھی گئی ہے کہ وہ تھڑدلا ہے، بے صبرا

إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿۲۲﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿۲۳﴾

سوائے ان نماز ادا کرنے والوں کے۔ ﴿۲۲﴾ جو اپنی نماز پر ہمیشگی کرنے والے ہیں۔ ﴿۲۳﴾

ہے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جاتا ہے، مال یا کوئی اور نعمت ملتی ہے تو روک کر بیٹھ جاتا ہے اور حقداروں کو نہیں دیتا، مگر یہ کمزوری ایسی نہیں کہ انسان اس پر قابو نہ پا سکے۔ اہل ایمان نہ مصیبت میں گھبراتے ہیں اور نہ خوشحالی میں اتراتے ہیں۔ صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے سب کام ہی اس کے لیے خیر ہیں اور مومن کے علاوہ یہ چیز کسی کو حاصل نہیں اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے سو وہ اس کے لیے خیر ہوتی ہے اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے سو وہ (بھی) اس کے لیے خیر ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ) مگر اس کے لیے کوشش یقیناً کرنی پڑتی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَمَنْ يَسْتَعِفَّ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ وَمَنْ يَتَصَبَّرْ)) يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ)

''جو شخص سوال سے بچے گا، اللہ اسے بچا لے گا جو اللہ سے غنا مانگے گا اللہ اسے غنی کر دے گا اور جو صبر کی کوشش کرے گا، اللہ اسے صابر بنا دے گا۔''

آیت ﴿۲۲﴾، ﴿۲۳﴾ ﴿ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴾ مگر نمازی بے صبرے اور تھڑ دلے نہیں ہوتے، وہ نہ مصیبت پر شکوہ شکایت کرتے ہیں نہ نعمت ملنے پر بخل کرتے ہیں۔ نماز کی صحیح ادائیگی سے آدمی میں وہ عزم اور وہ ہمت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی تمام کمزوریوں پر قابو پا لیتا ہے کیونکہ روزانہ پانچ وقت دنیا کے کسی لالچ کے بغیر پورے شروط و آداب کے ساتھ نماز ادا کرنا بہت ہی مشکل کام ہے جو اللہ کے خوف اور آخرت پر ایمان کے بغیر ادا ہو ہی نہیں سکتا: ﴿ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٤٥﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿٤٦﴾ ﴾ (البقرہ:٤٥، ٤٦) ''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو اور بے شک وہ بہت بڑی ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر جو سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسی کی

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

اور جن کے مالوں میں ایک مقرر حصہ ہے۔ ㉔ سوال کرنے والے کے لیے اور اس کے لیے جسے نہیں دیا جاتا۔ ㉕

طرف لوٹنے والے ہیں۔''

آیت نمبر ۲۳ سے لے کر ۳۴ تک وہ صفات بیان فرمائی ہیں جن کے بغیر نمازی بھی ھلوع ہی رہتا ہے۔ ان میں سے پہلی صفت اپنی نماز پر ہیشگی ہے یہ نہیں کہ کبھی پڑھ لی کبھی چھوڑ دی۔ کیونکہ جونہی نماز ترک کرے گا صرف بے صبری اور بخل ہی واپس نہیں آئیں گے بلکہ کفر بھی دوبارہ اس میں پلٹ آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بَيْنَ الْعَبْدِ وَ بَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))(صحیح مسلم) ''بندے اور کفر کے درمیان نماز ترک کرنے کی دیر ہے۔''

آیت ㉔، ㉕ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ و زکاۃ مکہ میں بھی فرض تھے اور وہاں بھی اہل ایمان اپنے اموال میں سے ایک مقرر حصہ نکالتے تھے کیونکہ یہ سورہ مکی ہے، بلکہ مشرکین بھی اپنی کھیتی اور مویشیوں میں سے بتوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک مقرر حصہ نکالتے تھے۔ (الانعام: ۱۳۷) ''اس سے بہت پہلے اسماعیل علیہ السلام بھی اپنے اہل کو صلاۃ و زکاۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔'' (مریم: ۵۵) ہاں زکاۃ کا موجودہ مخصوص نصاب مدینہ میں مقرر ہوا، اتنے فرض کی ادائیگی کے بغیر تو آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا البتہ اہل ایمان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، یہ ہر شخص کی اپنی صوابدید ہے کہ وہ اس کی راہ میں کتنا حصہ مقرر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ صحیح مسلم میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے جس کا نام لے کر بادلوں کو حکم ہوا کہ اس کے باغ کو پانی پلائیں۔ وہ شخص اپنے باغ کی آمدنی کے تین حصے کرتا تھا جس سے ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا تھا۔ (صحیح مسلم)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیے بغیر بے صبری اور بخل کی کمینگی دور ہو ہی نہیں

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝
اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰى
اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝

اور جو جزا کے دن کو دل سے سچا مانتے ہیں۔ (۲۶) اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ (۲۷) یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسا ہے جس سے بے خوف نہیں ہوا جا سکتا۔ (۲۸) اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (۲۹) مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں پر تو وہ یقیناً ملامت نہیں کیے گئے۔ (۳۰) پھر جو اس کے علاوہ کوئی راستہ ڈھونڈیں تو وہی حد سے گزرنے والے ہیں۔ (۳۱) اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔ (۳۲)

سکتی۔ محروم میں وہ بھی شامل ہے جس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں یا کسی آفت کی وجہ سے اپنے سرمایہ سے محروم ہو گیا ہے اور وہ بھی جسے ضرورت مند ہونے کے باوجود سوال نہ کرنے کی وجہ سے کچھ نہیں دیا جاتا۔

آیت (۲۶) تا (۲۸) یعنی ان کے اعمال کا اصل محرک قیامت پر ایمان اور رب تعالیٰ کے عذاب کا خوف ہے۔

آیت (۲۹) تا (۳۱) ان آیات سے بیوی اور لونڈی کے علاوہ جنسی خواہش پوری کرنے کے تمام ذرائع مثلاً زنا' متعہ' لڑکوں یا جانوروں سے بدفعلی اور استمنا بالید وغیرہ کی حرمت ثابت ہوئی، بلکہ ان اسباب کی حرمت بھی معلوم ہوئی جو آدمی کو ان چیزوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ مثلاً عریانی، غیر محرموں سے میل جول، گناہ پر ابھارنے والے گیت، ناول افسانے اور فلمیں وغیرہ۔

آیت (۳۲) امانت و عہد کی حفاظت ایمان کی اور خیانت و بدعہدی نفاق کی علامت ہے، جیسا کہ نفاق کی علامات والی مشہور حدیث میں ہے۔ (دیکھیے: بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق و مسلم کتاب الایمان، باب خصال المنافق) امانات کو جمع لانے سے مراد

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝۳۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۳۴
اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝۳۵

اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں۔ ۳۳ اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۳۴ یہی لوگ جنتوں میں عزت پانے والے ہیں۔ ۳۵

یہ ہے کہ وہ صرف مال ہی نہیں بلکہ ہر اس امانت کی حفاظت کرتے ہیں جس کی ادائیگی اللہ تعالیٰ، یا بندوں کی طرف سے ان کے ذمے ہیں۔ اس میں نماز، روزہ اور دوسری فرض عبادات اور واجب حقوق العباد سب شامل ہیں۔

آیت ۳۳ شہادتوں پر قائم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کی شہادت نہ چھپاتے ہیں نہ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، نہ جھوٹی شہادت دیتے ہیں اور نہ شہادت کی ادائیگی کے وقت اس میں کوئی ہیرا پھیری کرتے ہیں کیونکہ یہ سب کام نفاق وکفر کے کام ہیں۔ شہادات میں ایمان، توحید ورسالت، لوگوں کے باہمی معاملات غرض ہر حق بات کی شہادت شامل ہے۔

آیت ۳۴ نمازیوں کے اوصاف کا آغاز نماز پر ہمیشگی سے کیا اوران کا اختتام نماز پر محافظت سے کیا ہے۔ اس سے نماز کی اہمیت صاف واضح ہو رہی ہے۔ محافظت سے مراد اس کے اوقات کا خیال رکھنا اور اس کے شروط وارکان کی صحیح ادائیگی کا خیال رکھنا ہے۔ منافق نہ صحیح وقت پر نماز پڑھتا ہے اور نہ اطمینان وسکون سے اس کے ارکان کو درست طریقے سے ادا کرتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھ کر سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے (یعنی غروب کے قریب ہوجاتا ہے) تو اٹھ کر اس کے لیے چار ٹھونگے مار لیتا ہے، اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر کم۔ (صحیح مسلم، کتاب المساجد حدیث: ۱۹۵)

آیت ۳۵ یہی لوگ ہیں جو تھڑ دلی، بے صبری اور شدید بخل سے محفوظ ہیں اور انھی کو جنتوں میں

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ۝ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ۝
أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ۝ كَلَّا ۖ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّمَّا
يَعْلَمُونَ ۝

پھر ان لوگوں کو جو کافر ہیں کیا ہوا کہ تیری طرف دوڑتے چلے آنے والے ہیں۔ ۳۶ دائیں اور بائیں طرف سے ٹولیاں بن کر۔ ۳۷ کیا ان میں سے ہر آدمی طمع رکھتا ہے کہ اسے نعمت والی جنت میں داخل کر دیا جائے۔ ۳۸ ہرگز نہیں! یقیناً ہم نے انھیں اس چیز سے پیدا کیا ہے جسے وہ جانتے ہیں۔ ۳۹

عزت عطا ہو گی۔

آیت ۳۶ تا ۳۹ ﴿مُهْطِعِينَ﴾ أَهْطَعَ يُهْطِعُ (افعال) سے اسم فاعل ہے، تیزی سے دوڑنے والے۔ عِزِينَ جمع ہے عِزَةٌ کی جو اصل میں عِزَوَةٌ یا عِزَهَةٌ تھا، ٹولیاں، گروہ۔

کفار رسول اللہ ﷺ کو مذاق کرنے کے لیے ٹولیاں بنا بنا کر کبھی دائیں طرف سے دوڑے چلے آتے، کبھی بائیں طرف سے، وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے، آخرت کو بھی جھٹلاتے اور مذاق سے کہتے کہ اگر بالفرض کوئی جنت ہے بھی تو وہ بھی ہمارے ہی لیے ہے کیونکہ دنیا میں بھی ہمیں ہی زیادہ نعمتیں ملی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرح آنے پر تعجب کا اظہار فرمایا اور فرمایا: کیا ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو اتنا اونچا سمجھنے لگ گیا ہے کہ وہ نعمت والی جنت میں داخل ہونے کی طمع رکھتا ہے ہرگز نہیں، ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے وہ خود بھی جانتے ہیں، حقیر قطرے سے پیدا ہونے والے انسان کو یہ تکبر بھلا زیب دیتا ہے؟ (اس مضمون کے لیے دیکھیے سورۃ المرسلات: ۲۰ تا ۲۳۔ والطارق: ۵ تا ۷)

ان آیات سے تین باتیں مقصود ہیں۔ ایک انسان کو تکبر سے باز رکھنا اور یہ یاد دلانا کہ تم منی جیسی حقیر چیز سے پیدا ہو کر اتنے بڑے بن رہے ہو کہ جنت میں داخل ہونے کو اپنا حق سمجھ رہے ہو، حالانکہ جنت کے قابل تو رسول کی اطاعت سے ہو گے جس پر ٹولیاں بنا کر حملہ آور ہو رہے ہو۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَۙ۝ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ۝

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ یقیناً ہم طاقت رکھنے والے ہیں۔ ۴۰ کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم ہرگز عاجز نہیں ہیں۔ ۴۱

دوسری کفار کے اس طمع کا رد کہ وہ جنت میں جائیں گے گویا بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمھیں بھی اسی چیز سے پیدا کیا جس سے دوسروں کو پیدا کیا ہے، جب سب کی پیدائش ایک جیسی ہے تو تم عمل کے بغیر جنت میں داخل ہونے کے امیدوار کیسے بن گئے؟ تیسری دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل پیش کرنا ہے کہ جب ہم نے اس حقیر پانی سے تمھیں بنا لیا تو دوبارہ بنانا کون سا مشکل کام ہے؟ جیسے فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴾ (القیامة: ۳۷) ''کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے۔''

آیت ۴۰، ۴۱ سورج مشرق سے ہر روز نئی جگہ سے نکلتا ہے اور مغرب میں نئی جگہ غروب ہوتا ہے۔ وہ جگہیں بھی ہر شہر اور ہر جگہ کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے مشرقوں اور مغربوں کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ قسم سے پہلے لا کہہ کر منکرین کے قول کی نفی کی گئی ہے۔ پھر مشارق و مغارب کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ انھیں ختم کر کے ان سے بہتر لوگوں کو لے آئیں اور ہم کچھ عاجز نہیں ہیں۔ قسم کی مناسبت یہ ہے کہ ہم مشارق و مغارب کے رب ہیں، آسمان و زمین اور سورج وغیرہ سب ہمارے قبضے میں ہیں، کوئی شخص ہمیں عاجز کر کے ہماری گرفت سے نکل نہیں سکتا، ہم جب چاہیں انھیں ہلاک کر سکتے ہیں اور ان کی جگہ ان سے بہتر لوگوں کو لا سکتے ہیں، مگر ہم نے اپنی حکمت کی وجہ سے انھیں مہلت دے رکھی ہے۔ اس قسم اور جواب قسم سے ایک اور بات بھی نکل رہی ہے کہ جب ہم ان سے بہتر ایک بالکل نئی مخلوق پیدا کر سکتے ہیں تو انھیں دوبارہ کیوں پیدا نہیں کر سکتے؟

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۝ يَوْمَ يَخْرُجُونَ
مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ۝ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ
تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝

پس انھیں چھوڑ دے کہ بے ہودہ باتوں میں اور کھیل میں لگے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن کو جا پہنچیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ﴿۴۲﴾ جس دن وہ قبروں سے اس طرح تیز دوڑتے ہوئے نکلیں گے جیسے وہ کسی گاڑے ہوئے نشان کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ ﴿۴۳﴾ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہوگی، یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ﴿۴۴﴾

آیت ﴿۴۲﴾ مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ اس کے بعد ﴿ يَوْمَ يَخْرُجُونَ ﴾ اس سے بدل ہے۔ دنیا کے کھیل کود کی مہلت موت تک ہے اور موت قیامت کا دروازہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ))

آیت ﴿۴۳﴾، ﴿۴۴﴾ قیامت کے دن قبروں سے اتنی تیزی سے نکل کر دوڑیں گے جس طرح وہ لوگ تیزی سے دوڑتے ہیں جو نشانہ بازی کے وقت ایک نشان گاڑ لیتے ہیں پھر تیر چلا کر تیزی سے دوڑتے ہیں تا کہ جا کر دیکھیں نشانہ درست لگا ہے یا نہیں۔

رکوعاتھا ۲ (۷۱) سورۃ نوح مکیۃ (۷۱) آیاتھا ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

تفسیر سورۂ نوح

ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان کتنی مدت تھی؟ آپ نے فرمایا: ''دس قرن۔'' (صحیح ابن حبان، کتاب علامات النبوۃ، باب ذکر ابینا آدم) حافظ ابن کثیر نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ (البدایۃ والنھایۃ ج:۱، قصہ نوح)

صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انھوں نے فرمایا: آدم اور نوح کے درمیان دس قرن تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شروع میں سب لوگ اللہ کی توحید پر قائم تھے شرک اور بت پرستی کا وجود نہیں تھا پھر جیسا کہ زیر تفسیر سورہ کی آیت ۲۳ کی تشریح میں آرہا ہے۔ شیطان کے سکھانے سے بت پرستی شروع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں شرک سے منع کرنے اور اللہ واحد کی عبادت کی تبلیغ کے لیے نوح علیہ السلام کو بھیجا، آپ اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف بھیجے گئے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے۔ (دیکھیے: صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، ذکر نوح)

رسالت ملنے کے بعد آپ ساڑھے نو سو برس اپنی قوم کو سمجھاتے رہے، جب وہ نافرمانی سے باز نہ آئے تو انھیں پانی کے طوفان سے غرق کر دیا گیا۔ (العنکبوت: ۱٤) یہ پوری سورہ نوح علیہ السلام کی دعوت، اس کے جواب میں قوم کے طرز عمل اور ان کے انجام کی تفصیل پر مشتمل ہے اور اس کا نام بھی اسی جلیل القدر پیغمبر کے نام پر ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١﴾
قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢﴾ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ﴿٣﴾ يَغْفِرْ لَكُم
مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ
لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾

بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کو ڈرا اس سے پہلے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔ ① اس نے کہا اے میری قوم! بلاشبہ میں تمھیں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ② کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ ③ وہ تمھیں تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور ایک مقرر وقت تک تمھیں مہلت دے گا۔ یقیناً اللہ کا مقرر کردہ وقت جب آجائے تو اس میں تاخیر نہیں ہوتی، کاش کہ تم جانتے ہوتے۔ ④

آیت ①، ② نوح علیہ السلام کی قوم جس شرک اور بت پرستی میں گرفتار تھی، اس کا لازمی نتیجہ دنیا اور آخرت میں عذاب الیم تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ آگاہ کرنے اور ڈرانے کے بغیر عذاب نہیں کرتا۔ (بنی اسرائیل: ۱۵) اس عذاب الیم سے ڈرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔

آیت ③ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو تین باتوں کا حکم دیا:

① پہلی یہ کہ بت پرستی اور ہر قسم کا شرک چھوڑ کر اکیلے اللہ کی عبادت کرو۔

② دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یعنی ہر کام کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھو۔ اس کے بھیجے ہوئے احکام کی پابندی کرو۔

③ تیسری بات یہ کہ میرا حکم مانو، کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ کی عبادت بھی وہی قبول ہے جو میرے بتائے ہوئے طریقے پر ہوگی۔ تینوں کا خلاصہ توحید، شریعت الٰہی کی پابندی اور اطاعت رسول ہے۔

آیت ④ ﴿ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ ﴾ ''مِنْ'' کا معنی عام طور پر ''بعض'' ہوتا ہے، اس صورت

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا ۙ﴿۵﴾

اس نے کہا اے میرے رب! بلاشبہ میں نے اپنی قوم کو رات دن بلایا۔⑤

میں معنیٰ ہوگا ''اور تمھارے کچھ گناہ معاف کر دے گا'' مگر اس پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ کچھ گناہ تو پھر بھی باقی رہ گئے، ان کا کیا بنے گا؟ اس کا ایک جواب وہ ہے جو امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ یہاں ''مِنْ'' ''عَنْ'' کی جگہ آیا ہے اور جمیع کا معنیٰ دے رہا ہے، گویا یَغْفِرْ کے ضمن میں یصفح یعفو کا معنی ملحوظ ہے۔ معنیٰ یہ ہوگا ((يَعْفُوْ لَكُمْ عَنْ جَمِيْعِ ذُنُوْبِكُمْ)) وہ تمھارے سب گناہ معاف کر دے گا، دوسرا یہ ہے کہ مِنْ یہاں بعض کے معنیٰ میں ہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر تم میری دعوت قبول کر کے ایمان لے آؤ گے تو تمھارے پہلے گناہ معاف ہو جائیں گے کیونکہ اسلام پہلے سب گناہ مٹا دیتا ہے، البتہ آئندہ کے لیے گناہوں سے بچتے رہنا یہ نہ سمجھنا کہ ایمان لانے سے پہلے پچھلے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ﴿ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ یعنی طبعی موت کا ایک وقت مقرر ہے وہ کفر کی وجہ سے یا ایمان نہ لانے کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ ہر مومن و کافر پر آتی ہے، وہ تو اپنے مقرر وقت پر آ کر رہے گی۔ البتہ ایمان لے آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اس عذاب سے جو کفر کے نتیجے میں آتا ہے، تمھیں محفوظ رکھے گا۔

﴿ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ﴾ اس مقرر وقت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی قوم پر عذاب کے لیے مقرر ہوتا ہے، کاش! تمھیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ وقت آنے پر مہلت ختم ہو جائے گی پھر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو تم اس سے پہلے پہلے ایمان لے آؤ۔

آیت ⑤ نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے۔ سینکڑوں برس کی تبلیغ کے باوجود جب چند قلیل آدمیوں کے علاوہ کسی نے ایمان قبول نہ کیا اور نوح علیہ السلام ان سے ہر طرح مایوس ہو گئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کی۔ نوح علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دی یعنی کوئی وقت نہیں چھوڑا جس میں دعوت نہ دی ہو (حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے جتنا لمبا عرصہ مسلسل دعوت میں

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ

فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷

مگر میرے انھیں بلانے نے دور بھاگنے کے علاوہ ان کی کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا۔⑥ اور میں نے جب بھی انھیں دعوت دی تاکہ تو انھیں معاف کر دے انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے اور بہت بڑا تکبر کیا۔⑦

گزارا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ہر داعی اور عالم کو اسی جذبے اور محنت سے دعوت دینی چاہیے۔)

آیت⑥ مگر ان پر الٹا اثر ہوا، وہ ایمان قبول کرنے کی بجائے اور زیادہ دور بھاگنے لگے۔

آیت⑦ اس آیت میں تھوڑا سا حذف ہے، یعنی میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ ایمان لے آئیں تاکہ اس کے نتیجے میں تو انھیں معاف فرما دے تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، منہ سر کپڑوں میں لپیٹ لیے اور اپنی بات پر اڑ گئے الخ یعنی ان کے پاس نوح علیہ السلام کی دعوت کو رد کرنے کا کوئی جواز نہ تھا، نہ آپ کے دلائل کا سامنا کرنے کی ہمت تھی، ادھر وہ شرک چھوڑنے پر بھی تیار نہیں تھے نہ اپنی بڑائی سے دستبردار ہونے پر تیار تھے۔ نوح علیہ السلام کی بات ماننے میں ان کی سرداری، بڑائی اور چودھراہٹ میں فرق آتا تھا اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ نہ نوح علیہ السلام کی بات کانوں میں پڑے نہ ان کی نظر ان پر پڑے۔ غرض کسی صورت بھی ان سے آمنا سامنا نہ ہونے پائے مبادا وہ پھر تبلیغ شروع کر دیں اس لیے جیسے بھی ہو سکے ہر صورت منہ سر چھپا کر ان کے پاس سے نکل جائیں۔

نوح علیہ السلام کی قوم کا تکبر یہ تھا کہ انھوں نے حق بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا ایک آدمی نے کہا آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (یہ تکبر نہیں) اللہ خوبصورت ہے خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق سے انکار کر دینا اور

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹ فَقُلْتُ
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّ یُمْدِدْكُمْ
بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲

پھر میں نے انھیں بلند آواز سے دعوت دی۔ ⑧ پھر میں نے انھیں کھلم کھلا دعوت دی اور راز دارانہ طریقے سے چھپا کر بھی دعوت دی۔ ⑨ تو میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگ لو، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا ہے۔ ⑩ وہ تم پر بہت برستی ہوئی بارش اتارے گا۔ ⑪ اور مالوں اور بیٹوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں باغات عطا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔ ⑫

لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر)

آیت ⑦، ⑧ جب ان کے کانوں میں انگلیاں لے لینے اور منہ سر کپڑوں میں چھپا لینے تک نوبت پہنچ گئی تو پھر بھی میں نے انھیں سمجھانا نہیں چھوڑا بلکہ پھر انھیں مزید بلند آواز سے دعوت دی، پھر انھیں کھلم کھلا مجمع عام میں بھی سمجھایا اور لوگوں سے چھپا کر ایک ایک کو نجی طور پر بھی سمجھایا، غرض جس طرح دن، رات ہر وقت دعوت دی تھی، اسی طرح ہر طریقے سے دعوت دی۔

آیت ⑨ چنانچہ میں نے ان سے کہا اپنے رب سے بخشش مانگو (ظاہر ہے ایمان لانے کے بعد ہی بخشش مانگنے کا مرحلہ آتا ہے) یقیناً وہ بہت ہی بخشنے والا ہے، یعنی بخشنا اور معاف کرنا ہمیشہ سے اس کی صفت رہی ہے، پھر کسی واسطے یا وسیلے سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے، اپنے رب سے خود ہی معافی مانگ لو، وہ تمھیں بخش دے گا۔ جب معافی مل گئی تو آخرت میں سزا سے بچ جاؤ گے۔

آیت ⑩ تا ⑫ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اس سے بخشش مانگنے سے صرف تمھاری آخرت ہی درست نہیں ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی بے شمار نعمتیں عطا فرمائے گا، وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا، قسم قسم کے مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿ۚ۱۳﴾

تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے۔ ⑬

ساتھ تمھاری مدد کرے گا۔ تمھیں باغات اور نہریں عطا فرمائے گا۔ نوح علیہ السلام کے علاوہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے انبیاء نے اپنی اپنی قوم کو ایمان واستغفار سے آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے علاوہ ان سے حاصل ہونے والی دنیوی برکتیں بھی بتائیں۔ (دیکھیے سورۂ ہود: ۳، ۵۲، المائدہ: ۶۶، الاعراف: ۹۶)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ بارش کی ضرورت ہو، مال واولاد کی یا کسی بھی نعمت کی، اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا چاہیے۔ اس مقام پر تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ استسقاء کے لیے نکلے تو استغفار سے زیادہ کچھ نہیں کیا اور واپس آ گئے، لوگوں نے پوچھا: ''امیر المومنین! ہم نے آپ کو بارش کی دعا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تو فرمایا میں نے آسمان کو حرکت دینے والی ان چیزوں کے ذریعے بارش طلب کی ہے جن کے ذریعے بارش کا سوال کیا جاتا ہے۔ پھر یہ آیت اور سورۂ ہود کی آیت: ﴿ وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ ﴾ پڑھی۔

تفسیر طبری میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ شعبی سے روایت کیا گیا ہے جن کی ملاقات عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نہیں۔ اس لیے یہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور امیر المومنین سے امید بھی نہیں کہ وہ بارش کی دعا کے لیے نکلے ہوں اور مسنون طریقہ پر نماز اور دعا کے بغیر صرف استغفار کر کے واپس آ گئے ہوں۔

صحیح بخاری میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا بارش کی دعا کرنا اور عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کروانا موجود بھی ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ دعائے استسقاء میں بھی استغفار زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے، مگر ہر مقام پر استغفار اس طریقے سے کیا جائے گا جس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔

آیت ⑬ ﴿ لَا تَرْجُوْنَ ﴾۔ رَجَا يَرْجُوْ رَجَاءً (ن) امید رکھنا۔ اس کا معنی عقیدہ رکھنا اور ڈرنا بھی آتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں اور امید آپس میں لازم وملزوم ہیں امید اسی چیز کی ہوتی ہے

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝

حالانکہ اس نے تمھیں مختلف حالتوں میں پیدا کیا۔⑭ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا فرمایا۔⑮ اور ان میں چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنا دیا۔⑯ اور اللہ نے تمھیں زمین سے ایک خاص طریقہ سے اگایا۔⑰

جس کے موجود ہونے کا عقیدہ ہو اور امید کا مطلب ہی یہ ہے کہ خوف بھی موجود ہے۔ وقار کا معنیٰ عظمت ہے۔ آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تمھیں کیا ہے کہ اپنے بتوں کی عظمت تو تمھارے دل میں بہت ہے مگر تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کا عقیدہ نہیں رکھتے؟ دوسرا معنیٰ ہے تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے اگر تم اس کے وقار وعظمت کے معتقد ہوتے اور تمھیں اس کا خوف ہوتا تو اس کے ساتھ ایسی ہستیوں کو کبھی شریک نہ بناتے جو اس کے مقابلے میں کوئی وقار اور کوئی عظمت نہیں رکھتیں۔

آیت ⑭ یعنی حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے دلائل خود تمھاری ذات میں موجود ہیں، اس نے تمھیں مختلف اطوار میں پیدا فرمایا ہے۔ پہلے مٹی، پھر نطفہ، پھر علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں، پھر ان پر گوشت، پھر بہترین شکل وصورت کا انسان، جس کا ہر روز نئے سے نیا طور (انداز) ہوتا ہے بچپن، جوانی بڑھاپا پھر موت، اتنے اطوار کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔ اگر تم ایسے خالق کی عظمت کا خیال نہ کرو اور اس کے حضور پیش ہونے کو محال سمجھتے رہو تو کتنے تعجب کی بات ہے؟ یہی بات تفصیل کے ساتھ سورۃ الحج:۵،۶۔ المومنون: ۱۴تا۱۶ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

﴿خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا﴾ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمھیں مختلف انداز میں پیدا فرمایا کہ کوئی ایک بھی شخص، شکل وصورت، قد وقامت، رنگ روپ، آواز، ذہنی صلاحیت غرض کسی بھی چیز میں دوسرے سے نہیں ملتا۔ یہی مفہوم سورۃ الروم: ۲۲ میں بیان ہوا ہے۔

آیت ⑮ تا ⑳ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان کی پیدائش میں توحید اور قیامت کے دلائل کی طرف

ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝
لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ
مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۝

پھر دوبارہ وہ تمھیں اس میں لوٹائے گا اور ایک خاص طریقے سے نکالے گا۔ ⑱ اور اللہ نے تمھارے لیے زمین کو ایک فرش بنا دیا۔ ⑲ تاکہ تم اس کے کھلے راستوں پر چلو۔ ⑳ نوح نے کہا اے میرے رب! بے شک انھوں نے میری بات نہیں مانی اور اس کے پیچھے چل پڑے جس کے مال اور اولاد نے خسارے کے علاوہ اس کی کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا۔ ㉑

توجہ دلانے کے بعد ان چیزوں پر غور وفکر کی دعوت دی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے گرد و پیش ان کی ضرورتوں کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ فرمایا کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے سات آسمان، ان میں روشنی پھیلانے والا چاند اور جلتا ہوا چراغ، سورج کس طرح پیدا فرمایا؟ زمین کو بچھونے کی طرح نرم کر دیا اور تمھاری سہولت کے لیے اس میں گھاٹیاں اور کشادہ رستے بنا دیے۔ یہ تمام انتظام اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا بلکہ جس طرح اس نے تمھیں پہلے زمین سے پیدا کیا ہے اسی طرح زمین میں دفن کرنے کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس کے علاوہ تمھاری ضرورت کی یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں، تمھارے معبودان باطل نے تو کچھ بھی پیدا نہیں کیا، تم نے دونوں کو برابر کیسے سمجھ لیا؟

آیت ㉑ یہ نوح علیہ السلام کی دوسری شکایت ہے کہ اے میرے رب! انھوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ان سرداروں اور مالداروں کے پیچھے لگ گئے جنھیں تو نے مال اور اولاد عطا فرمائی، مگر وہ مال و اولاد انھیں کوئی فائدہ پہنچانے کی بجائے ان کے لیے اور زیادہ خسارے کا باعث بن گئے، کیونکہ اس مال و اولاد کے غرور کی وجہ سے ہی انھوں نے حق کو ٹھکرایا اور اسی مال و اولاد کو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کر کے قوم کو بہکایا اور یہی مال خرچ کر کے

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۚ

اور انھوں نے بہت بڑی خفیہ تدبیر کی۔ ﴿۲۲﴾ اور کہنے لگے تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی ودّ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔ ﴿۲۳﴾

لوگوں کو اللہ کی راہ سے ہٹایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کافروں کو جتنا مال اولاد یا نعمتیں ملیں، درحقیقت ان کے لیے عذاب ہی کا سامان ہے، کیونکہ اس سے وہ مزید غفلت و سرکشی اختیار کر کے جہنم کا ایندھن بنتے ہیں۔

آیت ﴿۲۲﴾ ﴿ كُبَّارًا ﴾ (باء کی تشدید کے ساتھ) میں كُبَارًا (باء کی تشدید کے بغیر) سے زیادہ مبالغہ ہے اور کبارا میں کبیر سے زیادہ مبالغہ ہے، یعنی انھوں نے بہت ہی بڑی خفیہ تدبیریں کیں۔ (مَكْرًا) جنس ہے، اس سے صرف ایک ہی مکر مراد نہیں۔ یہ اسی قسم کے حربے تھے جو ہمیشہ کسی قوم کے چوہدری اور مالدار لوگ اپنے اقتدار کی خاطر اہل حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں ان میں سے کئی حربے مذکور ہیں مثلاً یہ کہ اگر نوح اللہ کا نبی ہوتا تو فرشتہ ہوتا، یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے۔ اس کے پیروکار نیچ لوگ ہیں، اگر یہ رسول ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے، بڑے بڑے لوگ اس کے ساتھ ہوتے، یہ غیب جانتا ہوتا، یہ تو بس سرداری چاہتا ہے، یہ دیوانہ ہے وغیرہ تفصیل کے لیے سورۃ الاعراف، ہود اور المومنون وغیرہ میں نوح علیہ السلام کے واقعات ملاحظہ فرمائیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی یہی حربے استعمال کیے گئے۔

آیت ﴿۲۳﴾ فائدہ ① ساڑھے نو سو سال میں اللہ بہتر جانتا ہے کتنی ہی نسلیں ختم ہوئیں اور کتنی نئی پیدا ہوئیں مگر ہر پہلا پچھلے کو جیتے جی اور مرتے وقت یہی تاکید کرتا رہا کہ دیکھنا نوح کے کہنے پر ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت ہرگز ہرگز نہ چھوڑنا۔ یہ وہ پانچ بت تھے جن کی قوم نوح عبادت کرتی تھی۔

عبد اللہ بن عباس علیہ السلام فرماتے ہیں یہ پانچوں نوح علیہ السلام کی قوم کے صالح لوگوں کے نام

ہیں جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ (بطور یادگار) جن مجلسوں میں وہ بیٹھتے تھے، وہاں ان کے بت نصب کردو اور ان کے وہی نام رکھ دو، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا تو اس وقت ان کی عبادت نہیں کی گئی یہاں تک کہ جب وہ (بطور یادگار بت نصب کرنے والے) فوت ہو گئے اور (کسی کو اس بات کا) علم نہ رہا تو ان بتوں کی عبادت ہونے لگی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورة نوح حدیث: ٤٩٢٠)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ بت پرستی کا اصل باعث اکابر کی محبت میں غلو اور ان کے مجسمے بنا کر انھیں نصب کرنا تھا، شریعت میں تصویر کی حرمت کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اسی روایت میں جو اوپر گزری ہے، مذکور ہے کہ یہی بت جو قوم نوح میں تھے بعد میں عرب کے اندر آ گئے ۔ وَدّ، دومۃ الجندل میں کلب قبیلے کا بت تھا، سواع ہذیل کا تھا، یغوث، مراد پھر غطیف قبیلے کا تھا، جو سبا کے قریب جرف میں تھا۔ یعوق ہمدان کا اور نسر، حمیر کا تھا جو ذوالکلاع کی آل تھے۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ نوح)

یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے طوفان کے بعد جس میں تمام مشرک غرق کر دیے گئے، وہ بت کیسے باقی رہ گئے اور دوبارہ ان کی پرستش کیسے شروع ہو گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان قدرتی طور پر اپنے سے پہلے لوگوں کے حالات جاننے کا شوق رکھتا ہے، چنانچہ علم تاریخ اسی شوق کا نتیجہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ باقی بچنے والے اہل ایمان سے بعد والی نسلوں نے ان بزرگوں کی نیکی اور کرامتوں کے واقعات سنے ۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب جہالت کا غلبہ ہوا تو شیطان نے ان کے ہاتھوں آثار قدیمہ کے طور پر وہی بت نکلوا کر یا ان سے ان اکابر کے فرضی مجسمے بنوا کر جیسا کہ عیسائیوں نے مسیح اور مریم علیہما السلام کے فرضی مجسمے بنا رکھے ہیں، دوبارہ ان کی عبادت شروع کروا دی۔ بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان پانچوں بتوں کی پرستش ہوتی تھی اور باقاعدہ ان

وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾

اور بلاشبہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا اور تو ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا۔﴿۲۴﴾

کے آستانے موجود تھے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزرا ہے۔ عرب میں عبدِ ودّ اور عبد یغوث وغیرہ نام بھی ملتے ہیں۔

فائدہ ﴿2﴾ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں فرمایا: ''واقدی کا بیان ہے کہ ''ودّ'' ایک آدمی کی شکل میں ''سواع'' عورت کی شکل میں ''یغوث'' شیر کی صورت میں ''یعوق گھوڑے کی شکل میں اور ''نسر'' ایک پرندے کی صورت میں تھا، مگر یہ شاذ ہے۔ مشہور یہی ہے کہ یہ سب انسانی شکل میں تھے اور ان کی عبادت کے آغاز کا سبب جو بیان ہوا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ انتہی

حافظ رحمہ اللہ کی بات نوح علیہ السلام کے زمانے کے بتوں کے متعلق تو یقیناً درست ہے مگر بعد میں جب فرضی بت بنائے گئے تو ممکن ہے کہ ان جانوروں کی شکل پر بنائے گئے ہوں جیسا کہ مشرک قوموں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

فائدہ ﴿3﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو شرک سے بچانے کے لیے ان دروازوں کو بھی بند کرنے کا حکم دیا، جہاں سے شرک داخل ہو سکتا ہے، قبر پرستی کے فتنے کی ابتدا قبروں پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے سے ہوتی ہے اور بت پرستی کی ابتدا تصویریں اور مجسمے بنانے سے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں چیزوں سے منع فرمایا اور اونچی قبروں کو (دوسری قبروں) کے برابر کر دینے اور ہر تصویر مٹا دینے کا حکم دیا۔

ابو الہیاج اسدی فرماتے ہیں مجھے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا میں تمھیں اس کام پر مقرر کر کے نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا، وہ یہ تھا کہ کوئی مورتی نہ چھوڑو، مگر اسے مٹا دو اور نہ کوئی اونچی قبر مگر اسے برابر کر دو۔ (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الامر بتسویۃ القبر)

آیت ﴿۲۴﴾ یعنی قوم کے ان سرداروں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ ''اور ان ظالموں کو

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝

اپنے گناہوں کی وجہ سے ہی وہ غرق کر دیے گئے اور آگ میں داخل کر دیے گئے، پھر انھوں نے اللہ کے علاوہ اپنے لیے کوئی مدد کرنے والے نہ پائے۔۲۵

گمراہی کے علاوہ کسی چیز میں نہ بڑھا'' یہ دعا درحقیقت عذاب کے لیے ہے کیونکہ گمراہی پر قائم رہنے اور اس میں مزید بڑھتے چلے جانے کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہو جائیں' موسیٰ علیہ السلام نے آل فرعون کے حق میں یہی بد دعا کی تھی کہ: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴾ ''یا اللہ ان کے دل ایسے سخت کر دے کہ عذاب الیم دیکھنے تک ایمان نہ لائیں۔'' (یونس:۸۸)

ضمیر کی جگہ ''**ظالمین**'' کے لفظ کی صراحت سے ان لوگوں کے عذاب کی بد دعا کے مستحق ہونے کا سبب بیان ہوا ہے۔

آیت۲۵ یہ نوح علیہ السلام کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ﴿مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا﴾ جار مجرور پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہوگیا ہے یعنی صرف اپنے گناہوں (کفر و معصیت) کی وجہ سے انھیں غرق کیا گیا۔ ان کے غرق ہونے کا تفصیلی واقعہ سورۂ ھود، سورۂ مومنون، عنکبوت وغیرہ میں مذکور ہے۔

﴿فَاُدْخِلُوْا نَارًا﴾ پس آگ میں داخل کیے گئے۔ فا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غرق ہوتے ہی انھیں آگ میں داخل کر دیا گیا، یعنی قیامت کے دن جہنم میں جانے سے پہلے برزخ و قبر میں ہی وہ آگ میں داخل کر دیے گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝﴾ (المومن:۴۵'۴۶) ''اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا جو آگ ہے اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔'' خلاصہ یہ کہ نوح ﷺ کی قوم اور آل فرعون کو پہلے

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ
يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ
دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ إِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾

اور نوح نے کہا اے میرے رب! ان کافروں میں سے زمین پر کوئی رہنے والا نہ چھوڑ۔ ﴿٢٦﴾ اگر تو انھیں چھوڑے رکھے گا تو یقیناً یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور کسی نافرمان، سخت منکر کے سوا کسی کو نہیں جنیں گے۔ ﴿٢٧﴾ اے میرے رب! بخش دے مجھے اور میرے ماں باپ کو اور جو مومن بن کر میرے گھر میں آجائے اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو اور ظالموں کو ہلاکت کے علاوہ کسی چیز میں نہ بڑھا۔ ﴿٢٨﴾

پانی میں غرق کیا گیا۔ پانی کے عذاب کے بعد اس کا الٹ یعنی آگ کا عذاب قبر شروع ہو گیا پھر قیامت کے دن جہنم کے ﴿ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ میں داخل کیے جائیں گے۔

یہ آیت اور سورۂ مومن کی آیت عذاب قبر کی زبردست دلیلیں ہیں۔ ﴿ فَلَمْ يَجِدُوْا ------ الخ﴾ یعنی اللہ کے عذاب سے نہ انھیں کوئی سردار بچا سکا نہ ان کے پاک پنج تنوں میں سے کوئی ان کی مدد کر سکا۔

آیت ﴿٢٦﴾ یہاں سے نوح علیہ السلام کی دعا کا بقیہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو کیسے معلوم ہوا کہ اگر یہ لوگ زندہ رہے تو ان کی پشت سے کافر ہی پیدا ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے خود نوح علیہ السلام کو بتا دی تھی کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ اب کوئی شخص ایمان قبول نہیں کرے گا۔ (سورۂ ہود: ٣٦) یہ بات معلوم ہونے کے بعد نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! زمین پر ان کافروں میں سے ایک دیار بھی باقی نہ چھوڑ ﴿ دَيَّارًا ﴾ فیعال کے وزن پر ہے۔ دَارَ يَدُوْرُ دَوْرًا (گھومنا) سے ہو تو معنیٰ ہوگا، ایک پھرنے والا بھی نہ چھوڑ۔ دار (گھر) سے مشتق ہو تو معنیٰ ہے گھر میں بسنے والا ایک فرد بھی باقی نہ چھوڑ۔

آیت ﴿٢٨﴾ اس آیت میں نوح علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کا ذکر ہے جو انھوں نے اپنے لیے،

اپنے والدین کے لیے اور ان اہل ایمان کے لیے کی جو عذاب کی پیشگوئی سچ مان کر اس سے بچنے اور کشتی میں سوار ہونے کے لیے ان کے گھر جمع ہو گئے تھے، اس کے ساتھ ہی انھوں نے پہلے تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے مغفرت کی دعا کی اور کافروں کے لیے مزید ہلاکت کی بد دعا کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کے والدین موحد تھے۔

رکوعاتہا ۲ (۷۲) سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ (۴۰) اٰیاتہا ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

شان نزول

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ سوق عکاظ کی طرف جانے کے ارادے سے روانہ ہوئے (یہ اس وقت کی بات ہے جب) شیاطین اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی' اور (جب وہ اوپر خبریں سننے کے لیے گئے تو) ان پر انگارے پھینکے گئے وہ شیطان (جب آسمان سے خبریں نہ سن سکے) اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو انھوں نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے کہا: ''ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اور ہم پر انگارے پھینکے گئے ہیں، انھوں نے کہا تمھارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ کی وجہ کوئی نئی پیدا ہونے والی چیز ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے تم زمین کے مشارق و مغارب کا سفر کر کے دیکھو کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمھارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ بنی ہے تو وہ لوگ جو تہامہ کی طرف روانہ ہوئے تھے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، جب آپ نخلہ میں تھے اور سوق عکاظ کا ارادہ رکھتے تھے آپ اس وقت اپنے اصحاب کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے جب انھوں نے قرآن سنا تو کان لگا کر سننے لگے اور کہنے لگے: اللہ کی قسم! یہی وہ چیز ہے جو تمھارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ بنی ہے اس موقع پر جب وہ اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو انھوں نے کہا: ''اے ہماری قوم! ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ..... الخ﴾ بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا، جو سیدھی راہ کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم کبھی کسی کو اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں کریں گے) تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ آیات نازل فرمائیں:

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ﴿١﴾ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۖ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ﴿٢﴾

کہہ دے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے کان لگا کر سنا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔① جو سیدھی راہ کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اس پر

﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ﴾ (صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الجهر بقراءة صلاة الصبح حدیث: ۷۷۳) (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الجهر بالقراءة فی الصبح،حدیث : ۱۰۰۵)

تفسیر سورۃ الجن

آیت ①،② فائدہ ﴿1﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنوں کا قرآن سن کر ایمان لانا اور ان کی آپس کی ساری گفتگو رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے معلوم ہوئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ((مَا قَرَأَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْجِنِّ وَمَا رَآهُمْ إِنَّمَا أَتَوْهُ وَهُوَ بِنَخْلَةَ فَسَمِعُوا الْقُرْآنَ)) (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الجهر بالقراءة فی الصبح، حدیث: ۱۰۰۵)

رسول اللہ ﷺ نے نہ جنوں کے سامنے قرآن پڑھا نہ انھیں دیکھا وہ تو آپ کے پاس اس وقت آئے جب آپ نخلہ میں تھے اور انھوں نے اس موقع پر قرآن سنا۔

ہاں اس کے بعد کئی دفعہ آپ کی جنوں سے ملاقات ہوئی اور آپ نے انھیں قرآن سنایا اور پڑھایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ صحابہ سے غائب رہے، صحابہ نے وہ رات سخت پریشانی میں گزاری، تلاش کرتے کرتے وہ آپ سے اس وقت ملے جب آپ حرا کی طرف سے آ رہے تھے، پوچھنے پر آپ ﷺ نے بتایا: ''میرے پاس جنوں کا دعوت دینے والا آیا تھا، چنانچہ میں انھیں قرآن پڑھانے گیا تھا'' ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''پھر آپ ہمیں لے گئے اور ان کے نشان اور ان کی آگوں کے نشان دکھائے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، حدیث:

(۱۰۰۷،۱۰۰۶)

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے جنوں کے سامنے سورۃ الرحمان پڑھی اور وہ: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' پر ((لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ نُكَذِّبُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) تیری کسی بھی نعمت کو نہیں جھٹلاتے اے ہمارے رب! اور تیرے ہی لیے سب تعریف ہے۔'' جواب دیتے رہے۔ (ترمذی، تفسیر سورۃ الرحمن، حدیث: ۳۲۹۱)

فائدہ ② ان آیات میں کفار قریش کو شرم دلائی گئی ہے کہ دیکھو اتنی مدت تک سننے کے باوجود تم پر قرآن کا کچھ اثر نہیں ہوا نہ تم شرک کی نجاست سے پاک ہو سکے جب کہ یہ اتنی اعلیٰ، مؤثر اور عجیب کتاب ہے کہ جنوں کی اس جماعت نے اسے سنتے ہی ایمان قبول کر لیا اور ہمیشہ کے لیے شرک چھوڑنے کا اعلان کر دیا، حالانکہ جنوں کی سرکشی مشہور و معروف ہے۔

فائدہ ③ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن وہ زبانیں جانتے ہیں جو انسانوں میں بولی جاتی ہیں کم از کم وہ جن تو عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی باریکیوں تک کو اتنا سمجھتے تھے کہ انھوں نے قرآن کو عجیب قرار دیا اور فوراً اس پر ایمان لے آئے۔

فائدہ ④ جن بھی انسانوں کی طرح شریعت کے مخاطب ہیں اور ان کے رسول بھی وہی ہیں جو انسانوں کے ہیں۔ قرآن مجید یا حدیث میں جنوں میں سے کسی پیغمبر کا ذکر نہیں آیا اس کے برعکس زیر تفسیر سورہ میں صاف ذکر ہے کہ جن قرآن پر ایمان لائے اور سورہ احقاف میں ہے کہ انھوں نے کہا ہم نے ایک ایسی کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے۔ (الاحقاف: ۳۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کو اپنا رسول مانتے تھے۔ سورۂ رحمان کی تمام آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنوں کے سامنے انھیں پڑھنا اور ان کا جواب دینا بھی اس بات کی دلیل ہے۔ سورۃ الانبیاء: ۷، ۸ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

فائدہ ⑤ جنوں میں شرک کرنے والے بھی موجود ہیں جیسا کہ یہ جن مشرک تھے اور انھوں نے قرآن مجید سننے کے بعد شرک چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی آیات پڑھ رہے تھے جس سے انھیں شرک کی خرابی معلوم ہوئی۔

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۙ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى
اللّٰهِ شَطَطًا ۙ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ وَّاَنَّهٗ كَانَ
رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۙ

اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے، اس نے نہ کوئی بیوی رکھی ہے نہ اولاد۔ ③ اور یہ کہ ہمارا بے وقوف اللہ کے ذمے زیادتی کی بات لگاتا تھا۔ ④ اور یہ کہ ہم نے سمجھا کہ انسان اور جن اللہ پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ⑤ اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں

آیت ③ یہ جن تثلیث کو ماننے والے عیسائی تھے یا کسی ایسے مذہب کو ماننے والے جس میں اللہ تعالیٰ کی بیوی اور اولاد مانی جاتی ہے۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی بیوی ہو یا اولاد ہو۔ بیوی ماننے سے وہ بلند شان والا نہیں بلکہ محتاج ٹھہرتا ہے کیونکہ خاوند شہوت کے ہاتھوں اس کا محتاج ہوتا ہے، اولاد بھی اسی شہوت کا نتیجہ ہے جو اسے بیوی کے پاس جانے پر مجبور کرتی ہے تو پھر شان کیا بلند رہی۔ (طبری)

”اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے“ یعنی ”اور ہم اس بات پر بھی ایمان لے آئے کہ ہمارے رب کی۔ الخ

آیت ④ ﴿ سَفِيْهُنَا ﴾ (ہمارا بیوقوف) سے مراد ایک فرد بھی ہوسکتا ہے اور ایک گروہ بھی۔ فرد ہو تو ابلیس یا ان جنوں کا سردار مراد ہے۔ گروہ ہو تو مطلب یہ ہے ہم میں سے کئی بے وقوف اور احمق لوگ اللہ تعالیٰ پر ایسی زیادتی کی باتیں تھوپا کرتے تھے کہ اس کا کوئی شریک ہے یا اس کی اولاد اور بیوی ہے۔

آیت ⑤ یعنی ہم یہی سمجھتے تھے کہ انسان اور جن کم از کم اللہ پر تو ہرگز جھوٹ نہیں باندھ سکتے اس لیے ہم نے ان سے سن کر مان لیا کہ اللہ کے کچھ شریک ہیں اور اس کی اولاد اور بیوی بھی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ظالم جھوٹے تھے۔

آیت ⑥ عرب کے بعض مشرک جب کسی خوفناک جگہ میں اترتے تو کہتے ہم اس علاقے میں

سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑا کرتے تھے تو انھوں نے ان (جنوں) کی سرکشی

اور زیادہ کردی۔ ⑥

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝

اور یہ کہ ان انسانوں نے گمان کیا جس طرح تم نے گمان کیا کہ اللہ کسی کو کبھی دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ ⑦ اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو اسے اس حال میں پایا کہ سخت

جو جنوں کا سردار ہے، اس کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس سے جنوں کی سرکشی اور بڑھ گئی کیونکہ وہ جان گئے کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے ماننے والوں کو اور زیادہ ڈرانا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا آدمی کو نہ جنوں سے ڈرنا چاہیے نہ ان کی پناہ مانگنی چاہیے نہ کسی غیر اللہ کی دہائی دینی چاہیے، کیونکہ یہ شرک ہے، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ کسی بھی چیز کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے قرآن مجید کی آخری دو سورتوں جیسی کوئی چیز نہیں۔ (مزید وضاحت کے لیے ان سورتوں کی تفسیر دیکھیں)

خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، جو شخص کسی منزل میں اترے اور یہ الفاظ کہے، اسے وہاں سے روانہ ہونے تک کوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی۔ «اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ» "میں اللہ کے کامل کلمات کی پناہ پکڑتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔" (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، حدیث: ۵۴، ۵۵)

آیت ⑦ جن اپنی قوم کے لوگوں کو کافر انسانوں کے متعلق بتا رہے ہیں کہ شرک کے علاوہ ان کا عقیدہ تمھاری طرح یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قیامت کے دن دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو (نبی بنا کر) نہیں بھیجے گا۔ کفار میں ہمیشہ خواہ وہ انسان ہوں یا جن توحید آخرت اور رسالت تینوں کا انکار پایا جاتا رہا ہے۔

آیت ⑧، ⑨ فائدہ ① اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو آسمان کی زینت کے علاوہ ان شیاطین سے

حفاظت کا ذریعہ بھی بنایا ہے جو آسمان کے قریب جا کر فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو ہٹانے کے لیے ہر طرف سے ان پر شہابوں (انگاروں) کی بارش ہوتی ہے۔
(الصافات:٦ تا ١٠)

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فرشتے عنان یعنی بادل میں اترتے ہیں اور (آپس میں) اس بات کا ذکر کرتے ہیں جس کا آسمان میں فیصلہ کیا گیا ہوتا ہے۔ شیطان چوری سے وہ بات سننے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے سن لیتے ہیں پھر وہ بات کاہنوں کو چپکے سے پہنچا دیتے ہیں پھر کاہن اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة، حدیث: ٣٢١٠)

﴿ مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی عالم بالا کی حفاظت کا انتظام تھا مگر جن کوئی نہ کوئی بات سن لیتے تھے اور انھیں بالائی فضا میں چھپ کر بیٹھنے کی بھی کوئی نہ کوئی جگہ مل جاتی تھی اب (آپ کی بعثت کے بعد) جب وہ سننے کے لیے اوپر گئے تو ساری بالائی فضا سخت پہرے اور مسلسل شہابوں کی بارش سے بھری ہوئی تھی۔ ﴿ مُلِئَتْ ﴾ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اب پہرے کا نظام پہلے سے بہت سخت ہو گیا تھا۔ اس سے انھیں پریشانی ہوئی اور وہ تلاش میں نکلے کہ اس بندوبست کا باعث کیا ہے؟ جیسا کہ اس سورہ کی شان نزول میں گزر چکا ہے۔

فائدہ 2 قرآن مجید کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن انسانوں سے الگ مخلوق ہیں جو مٹی سے نہیں بلکہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں اور جو انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ جن آسمان کے قریب جا سکتے ہیں بعض اوقات عالم بالا کی ایک آدھ بات چرا سکتے ہیں، انھیں انسانوں ہی میں سے سرکش قوم یا چھپے ہوئے جراثیم قرار دے کر ان کا انکار کر دینا قرآن و حدیث کا انکار ہے۔ کسی چیز کے انکار کی یہ بنیاد کہ اگر وہ موجود ہوتی تو نظر آتی،

تھے تو اب جو کان لگاتا ہے وہ اپنے لیے ایک چمکدار شعلہ گھات میں لگا ہوا
پاتا ہے۔⑨

وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَاۗىِٕقَ قِدَدًا ۙ

بے حد کمزور بنیاد ہے۔ (مزید دیکھیے سورہ اعراف:۲۷،۳۸۔ ہود:۱۱۹۔حم السجدہ:۲۵، ۲۹۔ الاحقاف:۱۸، ۲۹، ۳۲) آدم اور ابلیس کا قصہ جو قرآن مجید میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور سورۃ الرحمان پوری اس بات کی شاہد ہے کہ جن اور انسان الگ الگ مخلوق ہیں۔

آیت⑩ اتنے سخت پہرے دیکھ کر جنوں نے سمجھ لیا کہ دو باتوں میں سے ایک ضرور ہے یا تو اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یعنی کسی قوم پر اچانک عذاب آنے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور خبروں پر پہرا لگ گیا ہے تاکہ اس قوم کو وقت سے پہلے اطلاع نہ ہو جائے یا اللہ تعالیٰ نے ان کی بھلائی اور ہدایت کا ارادہ کیا ہے یعنی کوئی رسول مبعوث ہوا ہے جس کی طرف بھیجی جانے والی وحی کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے تاکہ شیطان، نہ اس میں کوئی دخل دے سکیں نہ پہلے معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کی طرف کیا وحی کی جا رہی ہے۔ جب وہ اس جستجو کے لیے نکلے کہ ان دو باتوں میں سے کون سی حق ہے تو انھیں رسول اللہ ﷺ کو قرآن پڑھتے ہوئے سن کر معلوم ہو گیا کہ یہ بندوبست اسی رسول کی وجہ سے ہے۔

اس آیت میں جنوں کے اس گروہ کا حسن ادب ملاحظہ ہو کہ ارادہ رشد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے ارادہ شر کی نسبت اس کی طرف نہیں کی۔

آیت⑪ ﴿طَرَاۗىِٕقَ﴾ طریقۃ کی جمع اور قِدَدًا ، قِدَّۃٌ بروزن قطعۃ کی جمع ہے، ٹکڑے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنوں میں صالح اور غیر صالح ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان

اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ جو لوگ زمین میں ہیں ان کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔⑩ اور یہ کہ ہم میں سے کچھ اچھے ہیں اور کچھ اس کے علاوہ ہیں، ہم مختلف گروہ چلے آئے ہیں۔⑪

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۝۱۲ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا
الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۝۱۳

میں اچھے عقائد، اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کے لوگ بھی ہیں اور اس کے برعکس بھی، ان میں موحد بھی ہیں مشرک بھی، متبع سنت بھی ہیں بدعتی بھی، خوش اخلاق بھی ہیں اور بداخلاق بھی، وہ بھی ہیں جو آسمان سے کوئی خبر سن کر اس میں سو جھوٹ ملاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ایسا نہیں کرتے۔

مومن جنوں کا اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کے سب راہ راست پر نہیں بلکہ ہم میں بھی غیر صالح لوگ موجود ہیں جنھیں حق بات سمجھانا اور ان کا اسے قبول کرنا ضروری ہے۔

آیت ⑫، ⑬ مشرک قومیں جنوں کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھتی ہیں، انھیں غیب دان جانتی ہیں مگر جن خود اقرار کر رہے ہیں کہ ہم نے سمجھ لیا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں پکڑنا چاہے تو نہ ہم زمین میں کہیں چھپ کر اسے عاجز کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں پکڑ نہ سکے نہ کہیں بھاگ کر غرض پھر کسی صورت ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل بے بس ہونے کے اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ جونہی ہم نے ہدایت کی بات سنی فوراً ایمان لے آئے۔ ﴿ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴾ نقصان یہ کہ جو نیکیاں کی ہیں ان میں کمی کر دی جائے، زیادتی یہ کہ جو گناہ نہیں کیے وہ تھوپ دیے جائیں۔

ان آیات میں بھی مومن جن اپنے بھائیوں کو نصیحت کر رہے ہیں کہ جس ذات عالی سے نہ بھاگ سکتے ہو نہ چھپ سکتے ہو اس پر ایمان لے آؤ، اسی میں تمھاری خیریت ہے پھر وہ ایسا

اور یہ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم کبھی اللہ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکیں گے اور نہ
ہی بھاگ کر اسے عاجز کر سکیں گے۔ ⑫ اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت سن لی، اس پر ایمان لے
آئے پھر جو کوئی اپنے رب پر ایمان لائے گا وہ نہ کسی نقصان سے ڈرے گا نہ زیادتی سے۔ ⑬
وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ وَاَمَّا

مہربان ہے کہ جو اس پر ایمان لے آئے اسے نہ نقصان کا خوف ہے نہ زیادتی کا۔

آیت ⑭، ⑮ فائدہ ① ﴿ الْقٰسِطُوْنَ ﴾ (ظلم کرنے والے، راہ حق سے ہٹنے والے) قَسَطَ یَقْسِطُ (ض) قَسْطًا (قاف کے فتحہ کے ساتھ) ظلم کرنا سیدھی راہ سے ہٹنا۔ اَلْقِسْط (قاف کے کسرہ کے ساتھ) انصاف۔ اَقْسَطَ یُقْسِطُ (افعال) انصاف کرنا۔

یعنی ہدایت سننے کے بعد بھی ہم میں سے کچھ وہ ہیں جو تابع فرمان ہو گئے، یہ وہ ہیں جن کا ارادہ ہے کہ پوری کوشش کے ساتھ سیدھی راہ پر چلیں۔ تَحَرّٰی یَتَحَرّٰی تَحَرِّیًا قصد کرنا، کوشش کے ساتھ ظن سے یقین تک پہنچنا) اور جو راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

فائدہ ② یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں، وہ جہنم کا ایندھن کیسے بنیں گے؟ جواب یہ ہے کہ جس طرح انسان مٹی سے بنا ہے مگر مٹی کا ڈھیلا مارا جائے تو اسے تکلیف ہوتی ہے، ہر زندہ چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ﴾ (الانبیاء: ۳۰) مگر یہی پانی اسے غرق کر دیتا ہے۔ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے مگر یہی پانی جنوں کے لیے جو آگ سے بنے ہیں نعمت ہے جیسا کہ سورۃ الرحمٰن کی آیت ۵۰ اور ۶۶ میں ہے اور اسی سورہ جن کی آیت ۱۶ میں آ رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ آگ سے پیدا کیے جانے کے باوجود جنوں کی ایک الگ شکل وصورت ہے جو آگ سے متاثر ہوتی ہے، جس طرح گوشت پوست کا انسان مٹی سے پیدا ہونے کے باوجود مٹی سے الگ شکل وصورت رکھتا ہے۔ (یہاں سے جنوں کی تقریر جو اللہ تعالیٰ نے نقل

الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۟ۙ

اور یہ کہ ہم میں سے کچھ فرماں بردار ہیں اور کچھ ہم میں سے ظالم ہیں پھر جو فرماں بردار ہو گیا تو وہی ہیں جنھوں نے سیدھے راستے کا قصد کیا۔⑭ اور جو ظالم ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔⑮

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۟ۙ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ

فرمائی ہے ختم ہوئی۔ آئندہ آیات میں دوبارہ اللہ تعالیٰ کا خطاب شروع ہوتا ہے۔)

آیت ⑯ اس کا عطف ﴿اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ ......الخ﴾ پر ہے اور ﴿وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا﴾ کا اصل ﴿وَ اَنَّهُمْ لَوِاسْتَقَامُوْا﴾ ہے یعنی کہہ دے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا الخ اور میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ (یعنی قریش مکہ یا تمام بنی آدم اور جن) اصل راستے پر سیدھے چلتے رہتے تو ہم انھیں وافر پانی پلاتے۔ غدق کا معنیٰ کثیر ہے۔ وافر پانی سے مراد وافر رزق ہے کیونکہ زمین سے حاصل ہونے والی تمام برکات بارش ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر بیان فرمائی ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (الاعراف: ۹۶) اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کھول دیتے۔ (سورہ نوح آیات ۱۰ تا ۱۲ اور المائدہ: ۶۶ میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔

آیت ⑰ ﴿لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ﴾ یعنی پانی کی کثرت اور رزق کی فراوانی کا مقصد بھی ان کی آزمائش ہے کہ وہ خوشحالی میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس کی توحید و اطاعت پر قائم رہتے ہیں یا بدمست ہو کر سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ معلوم ہوا مصیبت کی طرح نعمت بھی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ سورۃ الانبیاء: ۳۵۔ الاعراف: ۱۶۸ اور ن: ۱۷ تا ۲۰ میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔

۲۹

﴿يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا﴾

اور (یہ وحی کی گئی ہے) کہ اگر یہ لوگ راستے پر سیدھے رہتے تو ہم انھیں بہت وافر پانی

﴿صَعَدًا﴾ صَعِدَ يَصْعَدُ (س) کا مصدر ہے۔ لفظی معنیٰ چڑھائی ہے، مراد ایسا سخت عذاب ہے جو دم بدم بڑھتا ہی جائے گا۔

آیت ⑱ ﴿اَلْمَسٰجِدَ﴾ مسجد کی جمع ہے، اس کا معنیٰ سجدے بھی ہے۔(مصدر میمی) وہ جگہیں بھی جہاں سجدے کیے جاتے ہیں، یعنی مسجدیں اور وہ جگہیں یعنی اعضا بھی جن پر سجدہ ہوتا ہے یعنی پیشانی، ہاتھ پاؤں اور گھٹنے (ان دونوں معنوں کی صورت میں یہ ظرف ہے)

مطلب یہ ہے کہ سجدے بھی اللہ کے لیے ہیں، مسجدیں بھی اور اعضاءِ سجدہ بھی، تو پھر پکارنا بھی صرف اسی کا حق ہے۔ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو مت پکارو۔ مسجدیں کا لفظ اتنا عام ہے کہ اس سے مراد صرف وہی جگہیں نہیں جو عبادت کے لیے تعمیر کی گئی ہیں بلکہ اس میں زمین کا ہر قطعہ شامل ہے کیونکہ اس امت کے لیے ساری زمین ہی مسجد ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارنا منع ہے بعض لوگ جو مصیبت یا بیماری میں 'یا اللہ' کے ساتھ 'یا رسول اللہ' 'یا علی' 'یا حسین' 'یا شیخ عبدالقادر' وغیرہ کہتے اور ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، ان کا یہ فعل درست نہیں۔

غیر اللہ کو پکارنے کی ممانعت کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (سورہ یونس:۱۰۶۔ الرعد:۱۴۔ النحل:۲۰، ۲۱۔ الحج:۶۲، ۷۳، ۷۴۔ المومنون: ۱۱۷۔ الشعراء:۲۱۳۔ القصص:۸۸۔ سباء:۲۲۔ فاطر:۱۳، ۱۴۔ الاحقاف:۵)

اس کی وجہ یہ ہے کہ پکارنا ہی اصل عبادت ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ» یعنی پکارنا ہی عبادت ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾ (المومن: ٦٠) ''اور تمھارے رب نے فرمایا

پلاتے۔⑯ تا کہ اس میں ہم ان کی آزمائش کریں اور جو کوئی اپنے رب کی

یاد سے منہ موڑے گا وہ اسے سخت عذاب میں داخل کرے گا۔⑰

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۞

اور یہ کہ بلاشبہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔⑱

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۞ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ

مجھے پکارو میں تمھاری دعا قبول کروں گا بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' (رواہ الترمذی و صححہ فی ابواب الدعوات۔ باب ما جاء فی فضل الدعاء)

آیت⑲ مشرکین نہ صرف یہ کہ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے بلکہ ان کے لیے اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اس قدر باعث تعجب اور تکلیف دہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لیے یا توحید کی دعوت کے لیے کھڑے ہوتے اور صرف ایک اللہ ہی کو پکارتے تو مشرکین اظہار تعجب کے لیے اور آپ کو پریشان کرنے کے لیے گروہ در گروہ آپ کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔

آیت⑳ یعنی تمھیں جتنا بھی ناگوار ہو اور تم روکنے کے لیے جتنے بھی جمع ہو جاؤ، میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکاروں گا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔ ندائے غیر اللہ کی حرمت کی آیات کے لیے دیکھیں گزشتہ آیت نمبر ۱۸ کی تفسیر۔

آیت㉑ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صاف اعلان کرنے کا حکم دیا کہ آپ ﷺ دوسروں کے لیے نہ نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے، نہ ہدایت، نہ گمراہی کا اختیار رکھتے ہیں۔ (ضَرًّا کے مقابلے میں نَفْعًا اور رَشَدًا کے مقابلے میں غَيًّا حذف کر دیا ہے کیونکہ وہ خود بخود معلوم ہو رہا ہے)

ایک اور مقام پر یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ آپ ﷺ خود اپنے نفع یا نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ (الاعراف: ۱۸۸) اور کئی مقامات پر واضح فرمایا کہ اللہ کے علاوہ جن لوگوں

وَلَآ أُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا۝ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۝

اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا کہ اس کو پکارے تو وہ قریب تھے کہ اس پر تہ بہ تہ جمع ہو جائیں۔⑲ کہہ دے کہ میں تو صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔⑳ کہہ دے بلاشبہ میں تمھارے لیے کوئی نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ بھلائی کا۔㉑

قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۝ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا۝ حَتّٰٓي اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا۝

کو بھی پکارا جاتا ہے وہ ذرہ برابر چیز کا اختیار نہیں رکھتے مثلاً دیکھیے سورہ سبأ:۲۲ اور فاطر:۱۳ اتنی صراحت کے بعد بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو یا دوسرے انبیاء و اولیاء کو اپنے نفع ونقصان کا مالک سمجھے تو اسے خود ہی سوچنا چاہیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے فرمان کی کیا قدر کی؟

آیت ㉒ یعنی آپ انھیں کہہ دیں کہ اگر میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکاروں یا اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی گرفت سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا نہ مجھے اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ مل سکے گی تو تم اس کی گرفت سے کیسے بچ سکو گے؟ اور کس کی پناہ میں جاؤ گے؟

آیت ㉓ ﴿اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ .....الخ﴾ یہ ﴿لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا﴾ سے استثناء ہے، درمیان والی آیت پہلی آیت ہی کی مزید وضاحت ہے، یعنی میں تو صرف اللہ کے احکام پہنچانے کا اور اس کے پیغامات کا اختیار رکھتا ہوں میرا کام بس اتنا ہی ہے، پیغام پہنچ جانے کے بعد جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ نافرمانی سے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہ لانا ہے کیونکہ پچھلی

کہہ دے یقیناً مجھے اللہ سے کوئی بھی کبھی نہیں بچا سکے گا اور میں اس کے علاوہ کبھی پناہ کی کوئی جگہ نہیں پاؤں گا۔ ﴿۲۲﴾ مگر (میں تو صرف) اللہ کے احکام پہنچانے اور اس کے پیغامات کا (اختیار رکھتا ہوں) اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں۔ ﴿۲۳﴾ (یہ اسی طرح غفلت

آیات میں یہی مضمون آ رہا ہے۔ ابدی جہنمی صرف کفار ہیں یہ مطلب نہیں کہ ہر گناہ اور نافرمانی کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے۔

آیت ﴿۲۴﴾ یعنی کفار اپنی تعداد کی کثرت، اپنے مددگاروں کی قوت پر فخر اور مسلمانوں کی قلت تعداد اور کمزوری پر طعن کرتے ہیں تو کرتے رہیں، یہ سب کچھ تھوڑے وقت کے لیے ہے یہاں تک کہ جب یہ لوگ وہ چیز (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ مددگاروں کے لحاظ سے کمزور اور تعداد میں کم کون ہے؟

وہ چیز جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اس سے مراد اسلام کا غلبہ اور کفار کی شکست بھی ہے، جیسا کہ بدر، خندق، فتح مکہ اور حنین میں انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، کفار پر خوف اور قحط کا مسلط ہونا بھی ہے، مرتے وقت فرشتوں کا ان کے مونہوں اور دبروں پر مارنا بھی ہے، قبر کا عذاب بھی ہے قیامت کی ہولناکی اور جہنم کی آگ بھی۔ درجہ بدرجہ یہ سب کچھ دیکھتے جانے کے ساتھ ہی ان پر اپنی تعداد کی کثرت اور حمایتیوں کی قوت کی حقیقت کھلتی جائے گی۔

آیت ﴿۲۵﴾ یعنی یہ لوگ جو جلدی مچاتے اور پوچھتے ہیں کہ اسلام کا وہ غلبۂ کفار پر عذاب اور قیامت کا معاملہ کب ہوگا؟ تو آپ ان سے کہہ دیں میرا کام تمھیں آگاہ کرنا ہے، وقت بتانا میرا کام نہیں نہ مجھے معلوم ہی ہے کہ وہ وقت بالکل قریب آ چکا ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی اور مدت مقرر کرتا ہے۔

میں رہیں گے) یہاں تک کہ جب وہ چیز دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو جان لیں گے کہ کون ہے جس کے مددگار کمزور ہیں اور جو تعداد میں کم ہے؟ ﴿۲۴﴾

قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

کہہ دے میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے قریب ہے یا میرا رب اس کے

آیت ﴿۲۶﴾ یعنی یہ جاننا کہ کل کیا ہوگا اور قیامت کب آئے گی؟ غیب میں شامل ہے اور غیب جاننے والا صرف اور صرف میرا رب ہے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴾ (لقمان:۳٤) ”بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا؟ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا؟ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا ہے، پوری خبر رکھنے والا ہے۔“

آیت ﴿۲۷﴾ (اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا) لیکن اگر وہ اپنے غیب کی کوئی بات بتانا چاہے تو ہر ایک کو نہیں بتاتا بلکہ صرف اسی کو بتاتا ہے جسے وہ رسول کے طور پر پسند کرلے۔ رسول کا معنیٰ ہے وہ شخص جسے پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہو، یعنی وہ غیب کی بات کسی کو عالم الغیب بنانے کے لیے نہیں بلکہ اسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے بتاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس چنے ہوئے رسول کو بھی جب غیب کی کسی بات کی اطلاع دیتا ہے تو اس کے چاروں طرف شہاب ثاقب اور فرشتوں کا زبردست پہرا لگا دیتا ہے تاکہ شیطان اس وحی میں نہ اپنی کوئی بات داخل کرسکیں نہ وقت سے پہلے معلوم کرکے کاہنوں کو اطلاع دے سکیں،

بلکہ کلام الٰہی محفوظ طریقے سے رسول تک اور رسول کے ذریعے لوگوں تک پہنچے۔

آیت ۲۸ فائدہ 1 اس سارے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ رسولوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر اس چھوٹی اور بڑی چیز کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہے اور ہر ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے۔ رسولوں کی مجال نہیں (خواہ وہ فرشتے ہوں جیسے جبریل علیہ السلام یا انسان ہوں جیسے تمام رسول) کہ اللہ کے پیغامات میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی ہر چیز کا علم رکھتا ہے، پھر یہ فرمانے کا کیا مطلب کہ ''تاکہ وہ جان لے'' اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک وہ پہلے ہی سب کچھ جانتا ہے کہ اس طرح ہوگا مگر اللہ تعالیٰ نے یہ سب انتظام اس لیے کیا ہے، تاکہ رسول اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیں اور اللہ تعالیٰ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں۔

فائدہ 2 بعض لوگ ان آیات سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول بھی عالم الغیب ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ انھیں غیب پر مطلع کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے اللہ تعالیٰ کا علم غیب ذاتی ہے اور انبیاء کا علم غیب عطائی یعنی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، مگر یہ بات درست نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے: ﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (النمل: ٦٥) ''کہہ دیجیے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کے علاوہ غیب نہیں جانتا یعنی عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر وہ کسی رسول کو کوئی بات بتا دے تو اس سے وہ عالم الغیب نہیں بن جاتا، کیونکہ ایک تو رسولوں کو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے جتنی بتائی جاتی ہے، وہ ہر بات نہیں جانتے اور یہ عالم الغیب کی شان کے خلاف ہے کہ اسے کچھ خبریں معلوم ہوں اور کچھ معلوم نہ ہوں۔

دوسرے جب کسی کو غیب کی کوئی بات بتانے سے معلوم ہو تو وہ عالم الغیب نہیں ہوتا، ورنہ ہم سب عالم الغیب ہو جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو غیب کی جو باتیں بتائیں وہ لوگوں کو پہنچانے کے لیے بتائیں، قیامت، جنت، دوزخ اور حوض کوثر وغیرہ یہ سب غیب کی باتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بتانے سے ہمیں معلوم ہیں تو کیا ہم بھی عالم الغیب ہیں؟ ظاہر ہے ایسا نہیں، سو حق یہی ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے دوسرا کوئی عالم الغیب نہیں، نہ ذاتی نہ عطائی۔

لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ
عَدَدًا ۟

مگر کوئی رسول جسے وہ پسند کرلےتو بے شک وہ اس کے آگے اور پیچھے پہرا لگا دیتا ہے۔ ﴿۲۷﴾

تاکہ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے ہیں اور اس نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہیں اور ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے۔ ﴿۲۸﴾

رکوعہا ۲ (۷۳) سُوْرَۃُ الْمُزَّمِّلِ مَکِّیَّۃٌ (۳) اٰیاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝

اے کپڑے میں لپٹنے والے! ①

تفسیر سورۃ المزمل

آیت ① فائدہ ① ﴿ الْمُزَّمِّلُ ﴾ اصل میں اَلْمُتَزَمِّلُ تھا تا کو زا سے بدل کر زا میں ادغام کر دیا۔ کپڑے میں لپٹنے والا۔

فائدہ ② ''اے کپڑے میں لپٹنے! والے'' ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان آیات کے اترنے کے وقت رسول اللہ ﷺ کپڑے میں لپٹ کر لیٹے ہوئے تھے،اس خطاب میں رسول اللہ ﷺ سے بہت لطف و کرم اور محبت کا اظہار ہے کیونکہ اہل عرب کا طریقہ ہے کہ وہ مخاطب سے نرمی اور محبت سے بات کرنا چاہتے ہوں تو ایسے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں جو مخاطب کی اس وقت کی حالت پر دلالت کر رہا ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ((قُمْ اَبَا تُرَابٍ)) ''مٹی والے! اٹھ کھڑا ہو۔''

فائدہ ③ آپ ﷺ کے چادر میں لپٹنے کی وجہ کیا تھی؟ اس میں تین قول ہیں، پہلا یہ کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ پہلی وحی: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ کے نزول کے موقع پر جب فرشتے نے آپ کو تین مرتبہ زور سے دبایا تو آپ گھر میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: ((زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ)) مجھے چادر اڑھا دو مجھے چادر اڑھا دو۔'' (صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی حدیث:۳) اسی طرح جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ عرصہ تک وحی بند رہنے کے بعد رسول اللہ ﷺ پر جب وحی اتری تو آپ نے اس کے متعلق بیان فرمایا کہ میں چلا جا رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی میں نے نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو حرا میں

میرے پاس آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا، میں اس سے ڈر گیا اور واپس آ کر کہا: ((**زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ**))'' تو اللہ عزوجل نے ﴿ **يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ** ﴾ سے لے کر ﴿ **وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ** ﴾ تک آیات اتاریں۔ (صحيح بخاری، حدیث: ٤)

ان دونوں موقعوں پر ((**زَمِّلُوْنِيْ**)) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر فرشتے کی ملاقات اور وحی کے اترنے سے جو رعب اور خوف طاری ہوتا تھا اس کی وجہ سے آپ کپڑا لپیٹ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے اس بارگراں کو اٹھانے کے لیے تیار کرنے کی خاطر آپ کو قیام اللیل کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اللیل کے ساتھ آپ کو وحی کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، چنانچہ بعد میں وحی تسلسل اور کثرت سے اترنے لگی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ''اے چادر میں لپٹ کر سونے والے! سستی اور سونے کا وقت گیا، رات کو قیام کر الخ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ قریش مکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے لیے کوئی ایسا نام طے کرنے لگے جس کو سن کر لوگ آپ کے پاس آنے سے باز رہیں۔ کسی نے کہا کاہن ہے، کچھ دوسرے کہنے لگے کاہن نہیں ہے۔ کسی نے دیوانہ کہا، اس کی بھی تردید ہوگئی۔ کچھ بولے جادوگر ہے، دوسروں نے کہا جادوگر نہیں ہے۔ غرض مشرکین اس قسم کی باتیں کرکے چلے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ باتیں پہنچیں تو آپ (کو بہت صدمہ ہوا اور اس پریشانی اور غم کی حالت میں چادر لپیٹ کر لیٹ گئے۔ جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا: ﴿ **يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ** ﴾ ، ﴿ **يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ** ﴾ مقصد یہ ہے کہ آپ ان کی باتوں سے بددل اور رنجیدہ ہو کر چادر لپیٹ کر نہ لیٹ جائیں بلکہ رات کو قیام کریں، اس سے آپ میں یہ بارگراں اٹھانے کی قوت پیدا ہوگی۔ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کریں اور ان سے اچھے طریقے سے علیحدگی اختیار کریں۔

ابن کثیر نے یہ قول جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بزار سے نقل کیا ہے مگر اس کی سند میں ایک راوی معلیٰ بن عبدالرحمٰن ہے جس کے متعلق تقریب میں ہے: ''**مُتَّهَمٌ بِالْوَضْعِ وَقَدْ رُمِيَ بِالرَّفْضِ**'' اس پر احادیث گھڑنے کی تہمت ہے اور رافضیت کا الزام بھی ہے۔

قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۙ﴿۳﴾

رات کو قیام کر مگر تھوڑا۔ ② آدھی رات (قیام کر) یا اس سے تھوڑا کم کر لے۔ ③

ایت ②،③ فائدہ ① ﴿قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا﴾ تھوڑا حصہ چھوڑ کر ساری رات کا قیام کر (نِّصۡفَهٗۤ) یہ (الَّيۡلَ) سے بدل ہے مگر اس اللیل سے جس میں سے ''قَلِيۡلًا'' کا استثناء ہو چکا ہے۔ قَلِيۡلًا کا لفظ چونکہ مجمل ہے اس لیے اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر جس حصے کا قیام کرنا ہے وہ کتنا ہونا چاہیے، فرمایا: رات کا نصف قیام کریں یا نصف سے کچھ کم کر لیں یا نصف سے زیادہ کر لیں۔ اس سورہ کی آخری آیت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ان آیات کے نزول کے بعد رات کی دو تہائی کے قریب اور رات کے نصف اور رات کی تہائی کے برابر قیام کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نصف سے کچھ کم کا مطلب ثلث اور نصف سے زیادہ کا مطلب دو ثلث کے قریب ہے۔ مِنۡهُ اور عَلَيۡهِ کی ضمیریں نِصۡفَهٗ کی طرف لوٹ رہی ہیں۔

اس تقریر سے وہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ ﴿اِلَّا قَلِيۡلًا﴾ کے بعد ﴿اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا﴾ میں تکرار ہے۔ اس سوال کا ایک اور حل یہ ہے کہ ﴿قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا﴾ کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ رات کا قیام کر مگر کسی رات رہ جائے تو مضائقہ نہیں ''نِّصۡفَهٗۤ'' سے یہ بیان شروع ہوتا ہے کہ رات کا کتنا حصہ قیام میں گزارنا ہے، یہ تفسیر بھی درست ہے۔

فائدہ ② ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو قیام اللیل کا حکم دے کر اس کی تاکید فرمائی ہے، تہجد، وتر قیام رمضان اور تراویح سب قیام اللیل ہی کے نام ہیں۔ اہل علم میں اختلاف ہے کہ یہ نماز فرض ہے یا سنت اور اگر فرض ہے تو صرف رسول اللہ ﷺ پر فرض تھی یا پوری امت پر فرض ہے؟ قرطبی میں ہے کہ حسن اور ابن سیرین اس بات کے قائل ہیں کہ رات کو نماز ہر مسلم پر فرض ہے خواہ بکری کا دودھ دوہنے کے برابر پڑھے مگر اکثر علماء فرماتے ہیں اور صحیح بھی یہی ہے کہ قیام اللیل امت پر فرض نہیں بلکہ یہ ایسی سنت ہے جس کی بہت تاکید کی گئی۔

سورہ مزمل کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعۡلَمُ ..... الی قولہ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ مَعَكَ﴾ یعنی آپ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ اتنا قیام کرتی ہے۔ اس

سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ صحابہ کی صرف ایک جماعت قیام کرتی تھی اگر یہ فرض ہوتا تو ایک جماعت کی بجائے تمام صحابہ قیام کرتے۔

صحیحین میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سائل کو ارکان دین بتائے، نمازوں میں سے دن رات میں صرف پانچ نمازیں فرض بتائیں، اس نے پوچھا کہ کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی فرض ہے تو آپ نے فرمایا نہیں الا یہ کہ اپنی خوشی سے پڑھو۔ بخاری، حدیث : ٤٦ ۔ مسلم، حدیث : ١٠٠ ۔

صحیحین ہی میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک رمضان میں تین راتیں لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جماعت کی صورت میں قیام میں شریک ہوتے رہے۔ چوتھی رات آپ باہر تشریف نہیں لائے اور فرمایا میں اس بات سے ڈرا کہ تم پر فرض نہ ہو جائے دیکھیے بخاری، حدیث : ١١٢٩، ومسلم حدیث : ١٧٨٠ ۔ اگر قیام اللیل فرض ہوتا تو آپ اس کے ان پر فرض ہو جانے سے کیوں ڈرتے؟ رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ پر قیام اللیل فرض تھا یا نہیں؟ تو اس کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل آیت:۷۹ کی تفسیر۔

فرض نہ ہونے کے باوجود قیام اللیل کی تاکید و فضیلت قرآن و حدیث میں بہت آئی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فرض نماز کے بعد سب سے افضل رات کی نماز ہے۔(صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل صوم المحرم حدیث : ٢٧٧)اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن اور متقی بندوں کی شان میں فرمایا: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ (سجدہ:١٦) ''ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں، اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴾ (الذاریات:١٧) ''وہ رات کے تھوڑے حصے میں سویا کرتے تھے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ (بنی اسرائیل: ٧٩) ''اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے۔''

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دس آیات کے

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ؕ

یا اس سے زیادہ کرلے اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ ④

ساتھ قیام کرے وہ غافلین میں نہیں لکھا جاتا، جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے وہ قانتین (عبادت گزاروں) میں لکھا جاتا ہے اور جو ہزار آیات کے ساتھ قیام کرے وہ مقنطرین (خزانے والوں) میں لکھا جاتا ہے۔ (ابو داؤد، حدیث : ۱۳۹۸۔ و صححه الالبانی)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جو رات کو اٹھا' نماز پڑھی اور اپنی بیوی کو جگایا اور اس نے بھی نماز پڑھی اگر اس نے انکار کیا تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم کرے جو رات کو اٹھی اور نماز پڑھی، خاوند کو جگایا اس نے بھی نماز پڑھی، اگر اس نے انکار کیا تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ (ابوداؤد حدیث : ۱۳۰۸۔ نسائی حدیث : ۱۶۱۱۔ وابن ماجه : ۱۳۳۶۔ و صححه الالبانی فی صحیح الجامع الصغیر)

رات کے اوقات میں سے بھی رات کے آخری حصے میں قیام کی فضیلت زیادہ ہے۔
عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ الْآخِرِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَكُوْنَ مِمَّنْ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْ تِلْكَ السَّاعَةِ فَكُنْ)) (ترمذی، حدیث : ۳۵۷۹۔ نسائی، و صححه الالبانی فی صحیح الجامع)
''رب تعالیٰ بندے کے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصے میں ہوتا ہے اگر تو یہ کر سکے کہ اس وقت اللہ کا ذکر کرنے والوں میں سے ہو تو یہ کام کر۔''

قیام اللیل کا سب سے بہتر طریقہ داؤد علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو نمازوں میں سب سے محبوب داؤد علیہ السلام کی نماز ہے وہ رات کا نصف سو جاتے اس کا تیسرا حصہ قیام کرتے اور چھٹا حصہ سو جاتے۔'' (بخاری، کتاب الصلاۃالتهجد، باب من نام عِند السحر، حدیث : ۱۱۳۱۔ مسلم، حدیث : ۲۷۳۱)

آیت ④ فائدہ ① ﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ ﴾ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ ﴿ تَرْتِيْلًا ﴾ مصدر تاکید

کے لیے ہے ''خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ''اس میں بتایا ہے کہ رات کے قیام میں پڑھنا کیا ہے؟ سو حکم ہوا کہ قرآن پڑھیں اور خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ترتیل میں کئی چیزیں شامل ہیں، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ ٹھہر ٹھہر کر پورے غور و فکر کے ساتھ تلاوت کی جائے رسول اللہ ﷺ اس حکم کے مطابق خوب ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کیا کرتے تھے۔

حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ﴿وَ كَانَ يَقْرَأُ بِالسُّورَةِ فَيُرَتِّلُهَا حَتَّى تَكُونَ أَطْوَلَ مِنْ أَطْوَلَ مِنْهَا﴾ (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ المسافرین، باب جواز النافلة قائما و قاعداً، حدیث: ۱۷۰۹) ''آپ ﷺ سورہ کی تلاوت کرتے اور اسے اتنا ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے کہ وہ اس سے لمبی سورہ سے بھی لمبی ہو جاتی۔''

دوسری چیز جو ترتیل میں شامل ہے، یہ ہے کہ ہر لفظ الگ الگ سمجھ میں آئے، چنانچہ یعلی بن مملک نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی قراءت اور نماز کے متعلق سوال کیا، انھوں نے پہلے آپ کی رات کی نماز کا حال بیان کیا: ﴿ثُمَّ نَعَتَتْ قِرَاءَتَهُ فَإِذَا هِيَ تَنْعَتُ قِرَاءَةً مُفَسَّرَةً حَرْفًا حَرْفًا﴾(ترمذی و صححه ابواب فضائل القرآن، حدیث: ۲۹۲۳) ''پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی قراءت کی صفت بیان کی تو انھوں نے ایسی قراءت بیان کی جس کا ایک ایک حرف واضح کیا گیا تھا۔

تیسری چیز ہر آیت پر ٹھہرنا ہے بعض لوگ ایک ہی سانس میں وقف کے بغیر آیت کے ساتھ آیت ملائے جاتے ہیں اور اسے کمال سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سنت کے خلاف ہے جیسا کہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

﴿كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَطِّعُ قِرَاءَتَهُ وَفِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ: ﴿يُقَطِّعُ قِرَاءَتَهُ آيَةً آيَةً يَقْرَأُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ثُمَّ يَقِفُ ثُمَّ يَقْرَأُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثُمَّ يَقِفُ﴾

(ترمذی، ابواب القراءة، حدیث:۲۹۲۷۔ ابو داؤد، کتاب الحروف وصححه الالبانی فی صحیح الجامع الصغیر)

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝

یقیناً ہم تجھ پر ایک بھاری کلام نازل کریں گے۔ ⑤

''رسول اللہ ﷺ اپنی قراءت الگ الگ کر کے پڑھتے تھے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے آپ اپنی قراءت ایک ایک آیت الگ کر کے پڑھتے تھے آپ الحمدللہ رب العٰلمین پڑھتے پھر ٹھہر جاتے پھر الرحمان الرحیم پڑھتے پھر ٹھہر جاتے۔''

چوتھی چیز یہ ہے کہ حروف مدہ کو لمبا کر کے پڑھا جائے۔ قتادہ فرماتے ہیں:

((سُئِلَ أَنَسٌ كَيْفَ كَانَتْ قِرَاءَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَانَتْ مَدًّا ثُمَّ قَرَأَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ يَمُدُّ بِبِسْمِ اللّٰهِ وَ يَمُدُّ بِالرَّحْمٰنِ وَيَمُدُّ بِالرَّحِيْمِ)) (صحيح بخاری، كتاب فضائل القرآن، باب قدر القراءة ، حديث : ٥٠٤٦)

''انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی قراءت کیسی تھی؟ انھوں نے فرمایا آپ کی قراءت کھینچ کھینچ کر ہوتی تھی۔ پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی بسم اللہ کو لمبا کر کے پڑھتے تھے اور الرحمان کو لمبا کر کے پڑھتے اور الرحیم کو لمبا کر کے پڑھتے تھے۔''

پانچویں یہ کہ قرآن کو خوبصورت لہجے اور خوش آوازی سے پڑھا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ((مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا)) (بخاری، حديث : ٧٥٢٧) ''جو شخص قرآن کو خوبصورت لہجے اور خوش آوازی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔''

غرض ترتیل کا مطلب یہ ہے قرآن مجید کو خوب غور و فکر کے ساتھ، ٹھہر ٹھہر کر، الفاظ کی واضح ادائیگی کے ساتھ حروف مدہ کو لمبا کر کے جس قدر خوش آوازی کے ساتھ ہو سکے پڑھا جائے۔

آیت ⑤ فائدہ ① اس آیت میں اور اس کے بعد والی دو آیتوں میں رات کے قیام کے حکم کی حکمت بیان فرمائی گئی ہے کہ وحی الٰہی کا بھاری بوجھ اٹھانے کی استعداد پیدا کرنے کے لیے رات کا قیام اور اس میں پورے غور و فکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت نہایت ضروری ہے۔

فائدہ ② بھاری کلام سے مراد وحی الٰہی ہے جو اترتے وقت بھی بھاری ہے۔ ہر کلام اور ہر چیز

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝٦

بلاشبہ رات کو اٹھنا (نفس کو) کچلنے میں بہت سخت اور بات کرنے میں بہت درست ہے۔ ⑥

سے بھاری ہے۔ اس پر عمل بھاری ہے۔ اور اسے تمام دنیا تک پہنچانے کا فریضہ بھی بہت بھاری ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے۔

الف: نزول وحی کے وقت آپ ﷺ پر بہت بوجھ پڑتا تھا جسے برداشت کرنا آپ پر بہت بھاری تھا۔ عائشہ ﷝ فرماتی ہیں کہ سخت سردی کے دن آپ پر وحی نازل ہوتی، جب وہ حالت ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی سے پسینا ٹپک رہا ہوتا۔(بخاری، کتاب بدء الوحی: ۲)

زید بن ثابت ﷛ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ کی ران میری ران پر تھی قریب تھا کہ وہ میری ران کو کچل دے۔ عائشہ ﷝ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہوتے، آپ پر وحی اترتی تو اونٹنی زمین پر گردن رکھ دیتی۔

ب: یہ کلام دوسرے تمام کلاموں سے بھاری ہے، باقی سب کلام اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

ج: اس کے احکام پر عمل کرنا بھاری ہے۔فرائض پنجگانہ اور دوسرے احکام بجالانا اور اس کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کرنا نفس پر بہت بھاری ہے۔

د: یہ اس لیے بھی بھاری ہے کہ اسے تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانے کا حکم ہے جو کہ نہایت دشوار کام ہے اس کے لیے آپ کو لوگوں کی مخالفت، طعن و ملامت، ٹھٹھا مذاق، گالی گلوچ، جسمانی ایذا، قتل کی سازشیں، ہجرت و جہاد سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔

آیت ⑥ فائدہ ① ﴿ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ ﴾ (رات کا اٹھنا) نَشَأَ يَنْشَأُ (ف،ک) کا مصدر ہے بروزن عافیة کاذبة نَشَأَ مِنْ مَكَانِهِ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ﴿ وَطْئًا ﴾ وَطِئَ يَطَأُ (س) کا مصدر ہے، پاؤں سے روندنا، کچلنا۔ ﴿ أَقْوَمُ ﴾ زیادہ سیدھا، زیادہ درست، قِيلًا۔ قَوْلًا کی طرح مصدر ہے۔

فائدہ ② یعنی رات کا اٹھنا طبیعت پر بہت بھاری اور نفس کو کچلنے میں دوسری تمام چیزوں سے

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا ؕ

بلاشبہ تیرے لیے دن میں ایک لمبا کام ہے۔⑦

بڑھ کر ہے، واضح رہے کہ جو لوگ زیادہ سے زیادہ جسمانی ایذا برداشت کرتے ہیں، بے خوابی کی ایذا کے سامنے ان کے حوصلے بھی جواب دے جاتے ہیں۔ نیند جیسی مرغوب چیز چھوڑ کر قیام کا مشکل ترین عمل کرنے سے نفس میں مشقت اٹھانے کی اتنی قوت پیدا ہوگی کہ وہ وحی الٰہی کو اٹھانے اور تبلیغ رسالت کے بھاری بوجھ کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

﴿ اَقۡوَمُ قِيۡلًا ﴾ رات کو جب ہر طرف خاموشی ہوتی ہے اور لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت اٹھ کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس مبارک وقت میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کی توجہ خراب کرے، اس وقت منہ سے نکلنے والے الفاظ زبان اور دل دونوں سے نکل رہے ہوتے ہیں اور اس عمل میں کسی دکھاوے یا سناوے کی آمیزش بھی نہیں ہوتی، کیونکہ کوئی دوسرا نہ دیکھتا ہے نہ سن رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے بات کرنے میں زیادہ درست قرار دیا۔ پھر رات کا آخری حصہ خاص قبولیت کا وقت بھی ہے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، جب رات کا آخری ثلث باقی ہوتا ہے، اور فرماتا ہے: کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی دعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اسے عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش کی درخواست کرے اور میں اسے بخشوں۔ (صحیح بخاری، کتاب التھجد، باب الدعاء والصلاۃ من آخر اللیل، حدیث: ۱۱۴۵، و مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب الترغیب فی الدعاء)

آیت ⑦ ﴿ سَبۡحًا ﴾ و سباحۃ کا اصل معنی تیرنا ہے (باب ف) جیسے فرمایا ﴿ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ﴾ مراد ادھر ادھر آنا جانا، کام کاج اور مشغولیت ہے یعنی دن کے وقت آپ کو گھر کے کام، فکر معاش، تبلیغ دین، مہمان نوازی، مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح، جہاد فی سبیل اللہ غرض بے شمار مشغولتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا مشغول وقت گزارا ہے ایسا

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝

اور اپنے رب کا نام ذکر کر اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا۔ ⑧ وہ مشرق ومغرب کا رب ہے، اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سو اسی کو (اپنا) وکیل بنا لے۔ ⑨

مشغول وقت گزارنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ایسی مشغولیت میں دن کے وقت ذکر الٰہی قیام اور تلاوت کے لیے الگ وقت نکالنا ممکن نہیں تھا اس لیے خاص ان کاموں کے لیے رات کو اٹھنے کی تاکید فرمائی۔

آیت ⑧ بَتَلَ يَبْتُلُ (ن،ض) قطع کرنا تَبَتُّلٌ منقطع ہونا۔ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ رات کو خاص طور پر اٹھ کر قیام تلاوت اور ذکر الٰہی کے علاوہ دن رات کے ہر وقت میں بھی اللہ کا ذکر جاری رکھ اور اپنی تمام تر توجہ مخلوق سے ہٹا کر اپنے رب ہی کی طرف رکھ۔ اس مطلب کا قرینہ یہ ہے کہ اس میں ذکر وتبتل کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا اور عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهِ)) (مسلم، حدیث: ۸۲۵) ''یعنی رسول اللہ ﷺ اپنے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔''

دوسرا مطلب یہ ہے کہ دن کی لمبی چوڑی مشغولیتوں سے فارغ ہو کر رات کو خاص طور پر اپنے رب کا ذکر کر اور ہر کام سے کلی طور پر منقطع ہو کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جا، جیسا کہ سورۃ الانشراح میں فرمایا: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾ (الانشراح: ۷، ۸) ''جب تو فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کر۔'' اس مطلب کا قرینہ شروع سورہ سے آیات کا سیاق ہے، دونوں مطلب ہی درست ہیں۔ پہلے مطلب کی صورت میں عام ذکر وتبتل مراد ہوگا جو دوسرے اشغال کے ساتھ بھی جاری رہتا ہے۔ دوسرے میں خاص جو دوسرے کام چھوڑ کر رات کی تنہائی میں یکسوئی سے ادا ہوتا ہے۔

آیت ⑨ یعنی مشرق ومغرب کا مالک ومربی وہی ہے، ہر وقت اسی کا ذکر کر، عبادت بھی اسی

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ
وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾

اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ان سے خوبصورت طریقے سے الگ ہو جا۔ ⑩ اور چھوڑ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو جو خوشحال ہیں اور انھیں تھوڑی مہلت دے۔ ⑪

کی کرو اور بھروسا بھی اسی پر رکھو، جب وہ معبود اور وکیل ہے تو تمام دنیا سے بے پروا ہو جانے میں فکر کس بات کی؟ عبادت و توکل دونوں کو اللہ کے لیے خاص کرنے کا حکم کئی آیات میں آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ ”اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو اور فرمایا: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ (الفاتحه : ٤) ”ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔“

﴿ وَكِيْلًا ﴾ وَكَلَ يَكِلُ (ض) سپرد کرنا۔ وکیل وہ ہے جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے یعنی اپنی پوری جدوجہد کے باوجود اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر رکھو اور اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دو۔

آیت ⑩ یعنی ایک اللہ کو اپنا سہارا بنانے، ان کے معبودوں کو یکسر چھوڑنے اور اس عمل کی دعوت و تبلیغ پر یہ آپ کو جو کچھ بھی کہیں آپ صبر کریں خواہ یہ آپ کو جھوٹا کہیں یا دیوانہ یا کاہن یا شاعر، یا محمد کی بجائے مذمم کہیں، غرض کچھ بھی کہیں یا جو بہتان بھی باندھیں آپ صبر کریں۔ انتقام کے چکر میں نہ پڑیں نہ ان کی بدسلوکی کا شکوہ کریں۔

خوبصورت طریقے سے الگ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ لڑ جھگڑ کر اور بدزبانی کر کے نہیں بلکہ نہایت حسن سلوک‘ صبر اور شرافت کے ساتھ ان سے کنارہ کشی اختیار کریں، دوسری بات یہ کہ ایسی علیحدگی نہ ہو کہ ان سے بائیکاٹ کر دیں اور بول چال ختم کر کے دعوت ہی سے کنارہ کش ہو جائیں۔ تیسری یہ کہ ظاہری کنارہ کشی کے باوجود ان کی خیر خواہی و ہمدردی اور ہدایت و راہنمائی میں کسی قسم کی کمی نہ کریں۔

آیت ⑪ یعنی جب تم نے مجھے اپنا وکیل بنا لیا اور اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا تو ان خوشحال

إِنَّ لَدَيْنَآ أَنكَالًا وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ﴿١٤﴾

بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور سخت بھڑکتی ہوئی آگ۔⑫ اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب۔⑬ جس دن پہاڑ اور زمین کانپنے لگیں گے اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔⑭

جھٹلانے والوں کا معاملہ بھی مجھ پر چھوڑ دو جن کی نعمت وخوشحالی ایمان لانے کی بجائے ان کے انکار کا باعث بن گئی ہے۔ میں خود ان سے نمٹ لوں گا، آپ انھیں تھوڑی مہلت دیں۔ تھوڑی مہلت سے مراد دنیا میں ہی تھوڑی مہلت ہے جیسا کہ کفار مکہ کو جھٹلانے کی سزا جلد ہی میدان بدر میں مل گئی۔اس کے علاوہ اگر زیادہ سے زیادہ مہلت بھی ہو تو دنیا میں زندہ رہنے تک ہے جو یقیناً بالکل کم ہے پھر اس کے بعد میں جانوں اور یہ جانیں، آپ ایک طرف ہو جائیں۔

آیت ⑫،⑬ ﴿أَنكَالًا﴾ نِكْلٌ (بکسر النون) کی جمع ہے جانور کے پاؤں کی زنجیر اور لگام کے لوہے والے حصے کو کہتے ہیں۔ ﴿الْجَحِيمِ﴾ جَحْمَةٌ آگ کا سخت بھڑکنا) سے مشتق ہے (راغب) ''ذَا غُصَّةٍ'' جو گلے میں پھنس جائے۔ نہ نگل سکے، نہ اگل سکے۔

آیت ⑭ ﴿كَثِيبًا﴾ ریت کا ٹیلہ ﴿مَّهِيلًا﴾ (گرایا ہو) هَالَ يَهِيْلُ هَيْلًا سے اسم مفعول ہے۔ ''هَالَ التُّرَابَ اَوِ الرَّمْلَ'' اس نے مٹی یا ریت کو گرایا، یعنی وہ عذاب اس دن ہو گا جب سخت زلزلے سے پہاڑ لرز اٹھیں گے، پھر اس زلزلے کی شدت سے ان کی سختی اور ذرات کی باہمی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ ٹھوس پہاڑوں کی بجائے ریت کے ٹیلوں کی صورت میں بدل جائیں گے جو خود بخود اس طرح نیچے گر رہی ہو گی جیسے کوئی اسے گرا رہا ہو۔

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر پہاڑوں پر اس کے بعد گزرنے والی کیفیات بھی ذکر ہوئی ہیں کہ وہ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے پھر بادلوں کی طرح اڑنے لگیں گے پھر زمین چٹیل میدان بن جائے گی۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۥ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿١٥﴾
فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ ٱلرَّسُولَ فَأَخَذْنَٰهُ أَخْذًا وَبِيلًا ﴿١٦﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ
يَوْمًا يَجْعَلُ ٱلْوِلْدَٰنَ شِيبًا ﴿١٧﴾ ٱلسَّمَآءُ مُنفَطِرٌۢ بِهِۦ ۚ كَانَ وَعْدُهُۥ مَفْعُولًا ﴿١٨﴾

بلاشبہ ہم نے تمھاری طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا۔ ⑮ سو فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے سخت گرفت میں پکڑ لیا۔ ⑯ پھر اگر تم کفر کرو گے تو اس دن کس طرح بچو گے جو بچوں کو بوڑھے کر دے گا۔ ⑰ جس میں آسمان پھٹ جانے والا ہے اس کا وعدہ ہمیشہ سے پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ ⑱

آیت ⑮ تا ⑱ فائدہ ① ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو دو طرح سے ڈرایا ہے ایک فرعون کا قصہ یاد دلا کر کہ اگر تمھاری سرکشی فرعون کی طرح جاری رہی تو تمھارا انجام بھی فرعون اور اس کے لشکروں جیسا ہو گا دوسرا یہ کہ اگر تم دنیا کے عذاب سے بچ بھی گئے تو قیامت کے اس عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟

فائدہ ② ﴿ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ ﴾ رسول اللہ ﷺ اس بات کی شہادت دیں گے کہ انھوں نے حق تعالیٰ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا اور یہ بھی کہ کس نے اسے مانا اور کس نے انکار کیا یاد رہے آپ انھی لوگوں کے متعلق یہ شہادت دیں گے جو آپ کی زندگی میں موجود تھے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت کے کچھ آدمی لائے جائیں گے اور انھیں بائیں طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا: اے میرے رب! یہ تو میرے ساتھی ہیں، کہا جائے گا آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا نیا کام کیا تھا تو میں وہی کہوں گا جو عبد صالح (عیسی علیہ السلام) کہیں گے: ﴿ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ..... الخ﴾ ”کہ میں ان پر اس وقت تک شہادت دینے والا تھا جب تک میں ان میں موجود تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو خود ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر شہادت دینے والا ہے۔“ کہا جائے گا کہ جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ لوگ اس وقت سے اپنی ایڑیوں پر پھرے رہے۔“

﴿ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾

یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ بنالے۔ ⑲

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب و کنت علیهم شهیداً : ٤٦٢٥)

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ﴿ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ ﴾ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے تمام احوال دیکھتے سنتے اور جانتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر شہادت ہو نہیں سکتی، ان لوگوں کا استدلال درست نہیں علاوہ ازیں شہادت کے لیے خود دیکھنا اور سننا بھی ضروری نہیں بلکہ اگر ایسے ذریعے سے کوئی بات معلوم ہو جس میں شک کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس پر بھی شہادت دی جاسکتی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ کی تفسیر)

فائدہ ③ ﴿ شِيْبًا ﴾ اَشْيَبُ کی جمع ہے، سفید بالوں والا شَابَ يَشِيْبُ شَيْبًا (ل) سفید بالوں والا ہونا ولدان و لید کی جمع ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کی ہولناکی سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آدم علیہ السلام سے کہیں گے کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کی جماعت نکالو، وہ پوچھیں گے: اے رب! جہنم کی جماعت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے' تو اس وقت حاملہ اپنا حمل گرا دے گی اور بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور تو لوگوں کو دیکھے گا کہ بے ہوش ہیں حالانکہ وہ بے ہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔'' یہ بات لوگوں پر بہت گراں گزری حتیٰ کہ ان کے چہروں کے رنگ بدل گئے تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''یاجوج و ماجوج میں سے نو سو ننانوے اور تم میں سے ایک ہوگا۔ لوگوں کے مقابلے میں تمھاری تعداد اس طرح ہے جیسے سفید بیل کے پہلو میں ایک سیاہ بال یا سیاہ بیل کے پہلو میں ایک سفید بال ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ حج : ٤٧٤١)

آیت اور حدیث میں بچوں کا بوڑھا ہونا اس دن کی سختی اور ہولناکی سے کنایہ ہے کیونکہ غم فکر کی شدت آدمی کو بوڑھا کر دیتی ہے۔

فائدہ ④ ﴿ اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ﴾ '' بَاء '' '' فِيْ '' کے معنیٰ میں ہے یعنی اس دن میں آسمان

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ
الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ
فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ
يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا
حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ
أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠﴾

بلاشبہ تیرا رب جانتا ہے کہ تو رات کے دو تہائی کے قریب اور اس کا نصف اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتا ہے اور ان لوگوں کی ایک جماعت بھی جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم ہرگز اس کی طاقت نہیں رکھو گے، سو اس نے تم پر مہربانی فرمائی تو قرآن میں سے جتنا آسانی سے ہو سکے پڑھو۔ اسے معلوم ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ زمین میں سفر کر رہے ہوں گے (جو) اللہ کا فضل تلاش کر رہے ہوں گے اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہوں گے، پس اس میں سے جتنا آسانی سے ہو سکے پڑھ لو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو، اچھا قرض دینا اور جو نیکی بھی تم اپنی جانوں کے لیے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں بہتر اور ثواب میں بڑا پاؤ گے اور اللہ سے بخشش مانگو، بلاشبہ اللہ نہایت بخشنے والا، بے حد رحم والا ہے۔ ﴿٢٠﴾

پھٹ جائے گا یا باء **سببیہ** ہے یعنی اس دن کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اس دن کی شدت سے آسمان جیسی عظیم مخلوق پھٹ جائے گی تو دوسری چیزوں کا کیا حال ہوگا؟ اور اگر کفر پر قائم رہے تو تم اس دن سے کس طرح بچو گے؟ آسمان کے مقابلے میں تمھاری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔

آیت ﴿٢٠﴾ فائدہ ﴿1﴾ **شان نزول**: سعد بن ہشام فرماتے ہیں، میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے

پوچھا آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے قیام کے متعلق بتائیں، انھوں نے فرمایا: تم ﴿ يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴾ نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کے شروع حصے میں قیام اللیل فرض فرمایا تو نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ ایک سال قیام کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا آخری حصہ بارہ ماہ تک آسمان میں روکے رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کے آخری حصے میں تخفیف نازل فرمائی اور قیام اللیل فرض ہونے کے بعد نفل ہو گیا۔
(صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب جامع صلاۃ اللیل حدیث: ۱۷۳۹)

سورۂ مزمل کے اول اور آخر کے نزول کے متعلق سند کے لحاظ سے یہی بات سب سے زیادہ صحیح ہے۔ صحیح مسلم کی اسی روایت کے آخر میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات کو درست قرار دیا، اس لیے بعض روایات میں آٹھ ماہ یا سولہ ماہ کا جو ذکر آیا ہے وہ مرجوح ہیں اور سعید بن جبیر (تابعی) کا قول کہ سورہ مزمل کا آخری حصہ دس سال بعد نازل ہوا ابن عباس اور عائشہ ﷺ جیسے جلیل القدر صحابہ کے ثابت شدہ فرمان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

ہمارے دور کے بعض لوگوں نے ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے صحیح قول کو چھوڑ کر ایک تابعی سعید بن جبیر کے قول کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ سورۂ مزمل کے آغاز کے مضمون سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی، جب کہ آخری آیت میں جہاد اور زکاۃ کا ذکر ہے جو مدینہ میں فرض ہوئے اس لیے اس کے اول و آخر میں دس سال کی مدت کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ بات ہی غلط ہے کہ مکی سورتوں میں جہاد یا زکوۃ کا ذکر نہیں، اگرچہ عملاً جہاد مدینہ میں شروع ہوا اور زکاۃ کا نصاب وغیرہ مدینہ میں مقرر ہوا مگر مکی سورتوں میں جہاد کا ذکر بھی ہے اور زکاۃ کا بھی۔ دیکھیے اسی آیت کا فائدہ ⑦، ⑧۔

فائدہ ② رسول اللہ ﷺ ایک سال تک تقریباً دو تہائی رات یا نصف یا ثلث قیام کرتے رہے صحابہ کی ایک جماعت بھی آپ کے اتباع میں اتنا قیام کرتی، گھڑیاں موجود نہیں تھیں اسی

خیال سے کہ حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہ ہو جائے زیادہ سے زیادہ قیام کی کوشش کرتے مگر رات کے نصف یا ثلث کا صحیح اندازہ ان کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو دن رات کا خالق ہے اور جسے دن رات کا خوب اندازہ ہے کہ رات کبھی لمبی ہوتی ہے کبھی چھوٹی، کبھی گرمی میں آتی ہے کبھی سردی میں، وہ خوب جانتا ہے کہ تم ہمیشہ یہ عمل ہرگز نہیں کرسکو گے اس لیے اس نے مہربانی فرما کر آسانی فرما دی، اب جتنا آسانی سے قیام کر سکتے ہو کرو۔

فائدہ 3 جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہرگز یہ طاقت نہیں رکھتے کہ ہمیشہ رات کا دو ثلث یا نصف یا ثلث قیام کرسکیں تو پھر بعض بزرگوں کے متعلق جو حکایات بیان کی جاتی ہیں کہ انھوں نے چالیس سال تک عشاء اور فجر کی نماز ایک وضو سے پڑھی ان کے متعلق غور کرنا چاہیے کہ جس کام کی طاقت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ میں بھی ہرگز نہیں وہ ان لوگوں میں کیسے آ گئی؟

پھر رسول اللہ ﷺ تو رات کو گیارہ یا تیرہ رکعات پڑھتے تھے مگر ان بزرگوں کا کمال بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہر رات ہزار ہزار رکعت پڑھتے تھے۔ اب یا تو ان حکایات کو جھوٹا ماننا پڑے گا یا ماننا پڑے گا کہ ان بزرگوں کی پوری کوشش تھی کہ ہر کام میں رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھ کر دکھائیں۔

فائدہ 4 ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ یعنی ”فَصَلُّوْا مَا تَيَسَّرَ لَكُمْ مِنْ قِيَامِ اللَّيْلِ“ ”یعنی فاقرء وا کا مطلب یہ ہے کہ رات کا قیام جتنا ہوسکتا ہے اتنی نماز پڑھو، قراءت کا لفظ بول کر نماز مراد لی گئی ہے جیسا کہ اس کے دوسرے ارکان مثلاً قیام رکعت بول کر نماز مراد لی جاتی ہے۔“ جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کرو۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ”جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لو“ کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ضروری نہیں کہ سورہ فاتحہ ہی پڑھی جائے، آسانی سے جو آیت بھی پڑھ سکتا ہے پڑھ لے، نماز ہوجائے گی، مگر یہ بات درست نہیں یہاں یہ ذکر ہی نہیں کہ نماز میں آسانی سے جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھ لو، بلکہ آیت

کے سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ ''مِنَ الْقُرْآنِ'' سے مراد رات کا قیام ہے یعنی تم اتنا لمبا قیام نہیں کر سکتے تو آسانی سے جتنا قیام کر سکتے ہو کر لو۔ نماز کے متعلق جزء بول کر کل مراد لینا عام ہے مثلاً قیام، رکعت، سجدہ سب نماز کے اجزا ہیں مگر ان میں سے ہر لفظ بول کر پوری نماز مراد لی جاتی ہے۔ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ میں بھی قرآن بول کر نماز مراد لی گئی ہے۔ صاحب روح المعانی آلوسی حنفی لکھتے ہیں: ''اَيْ فَصَلُّوْا مَا تَيَسَّرَ لَكُمْ مِنْ قِيَامِ اللَّيْلِ عُبِّرَ عَنِ الصَّلَاةِ بِالْقِرَاءَةِ كَمَا عُبِّرَ عَنْهَا بِسَائِرِ اَرْكَانِهَا'' صرف الفاظ کو لیا جائے تو یہ معنی ہو گا کہ تم اتنے لمبے قیام کی طاقت ہرگز نہیں رکھتے اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو خواہ نماز میں یا نماز کے بغیر، اتنا ہی رات کو پڑھ لیا کرو۔ صاحب روح المعانی نے اس معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے مگر پہلا معنی ہی زیادہ درست ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ کوئی بھی آیت پڑھ لیں تو نماز ہو جاتی ہے تو رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں اور تقریباً حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ ((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) ''جو شخص سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہے۔'' ہاں اگر کسی شخص کو سورہ فاتحہ بھی یاد نہیں تو ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ)) پڑھتا رہے اور رکوع میں چلا جائے۔'' (ابوداؤد، حدیث : ۸۳۲)

فائدہ ⑤ ﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ..... الخ﴾ قیام اللیل میں تخفیف کی وجہ پہلے یہ بیان فرمائی تھی کہ رات کے دو ثلث' نصف یا ثلث کے اندازے کے ساتھ ہمیشہ اتنا لمبا قیام کرنا تمھاری طاقت سے باہر ہے۔ اس لیے جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کرو، اب طاقت سے باہر ہونے کی تین وجہیں بیان فرمائیں جو ہر شخص کو پیش آ سکتی ہیں، پہلی وجہ بیماری ہے اس میں بڑھاپا اور ہر قسم کی جسمانی معذوری شامل ہے، دوسری وجہ اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرنے کے لیے سفر ہے اس میں طلب علم، زیارت احباب اور دوسرے تمام جائز

مقاصد کے لیے سفر شامل ہے، تیسری وجہ اللہ کی راہ میں لڑائی ہے، اس میں جنگ کے علاوہ اس کی تیاری اور پہرا سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ اسباب بیان کرنے کے بعد دوبارہ فرمایا: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ یعنی ان اعذار کی وجہ سے جتنا قیام آسانی سے کرسکو، کرو۔

فائدہ ⑥ ﴿ تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ کی تعیین میں وہ حدیث بہت مناسب معلوم ہوتی ہے جو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ((مَنْ قَامَ بِعَشْرِ آيَاتٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ وَ مَنْ قَامَ بِمِائَةِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ وَ مَنْ قَامَ بِأَلْفِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقَنْطِرِيْنَ)) جو شخص دس آیات کے ساتھ قیام کرے وہ غافلوں سے نہیں لکھا جاتا، جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے وہ قانتین (عبادت گزاروں) میں لکھا جاتا ہے۔ جو ہزار آیات کے ساتھ قیام کرے وہ بڑے خزانے والوں میں لکھا جاتا ہے۔ (ابو داؤد، ابو اب قراءۃ القرآن، باب تحزیب القرآن، حدیث: ۱۳۹۸ و صححہ الالبانی)

اس آیت اور حدیث سے تخفیف کے باوجود کم از کم دس آیات کے ساتھ قیام اللیل کی تاکید صاف ظاہر ہو رہی ہے۔

فائدہ ⑦ ﴿ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی کچھ دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں لڑائی کر رہے ہوں گے۔'' کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ آیت بلکہ ساری سورہ مکہ میں اتری جب کہ جہاد شروع نہیں ہوا تھا اس وقت یہ پیشگوئی غیب کی ایک خبر ہے جو ایک نبی کے ذریعے ہی دی جاتی ہے۔

فائدہ ⑧ ﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ سے معلوم ہوا کہ مکہ میں زکاۃ فرض ہو چکی تھی اگرچہ مختلف چیزوں کے نصاب کی تعیین مدینہ میں جا کر ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ قیام اللیل جتنا آسانی سے ہو سکے کرو مگر فرض نماز اور زکاۃ کی ادائیگی میں کوتاہی ہرگز نہ کرو۔

فائدہ ⑨ ﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا .... الخ ﴾ زکاۃ کے بعد قرض حسنہ سے مراد نفلی صدقات ہیں پھر زکاۃ ہو یا نفلی صدقات یا خیر کا کوئی بھی عمل ہو قیامت کے دن سات سو گنا

بلکہ اس سے بھی زیادہ کی صورت میں واپس ملیں گے۔

فائدہ ⑩ ﴿ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ﴾ یعنی کوئی بھی عمل ہو اس کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو عمل پر پھول مت جاؤ۔ سورۃ الذاریات میں متقین کے متعلق فرمایا: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ ﴾ ”یعنی وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور سحریوں کے وقت استغفار کرتے تھے۔“

ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے سلام پھیرتے تو تین دفعہ استغفار کرتے۔ (مسلم، حدیث: ۱۳۳۳)

رکوعاتہا ۲ (۷۴) سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ (۴) اٰیاتہا ۵۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ

اے کمبل میں لپٹنے والے!①

شان نزول

رسول اللہ ﷺ پر سب سے پہلی وحی: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ نازل ہوئی، اس کے بعد وحی کچھ عرصہ کے لیے رک گئی اور رسول اللہ ﷺ غمگین رہنے لگے، جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما نے وحی رک جانے کے اس عرصہ کے متعلق ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا اس حالت میں کہ میں چلا جا رہا تھا میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا زمین اور آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا میں اس سے ڈر گیا اور واپس آ کر کہا مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ سے ﴿ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴾ تک، پھر وحی گرم ہوگئی اور مسلسل آنے لگی۔ (صحيح بخاری، باب بد الوحی، حديث ۳، ٤ و كتاب التفسير سورة المدثر و سورة اقرأ و صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بدء الوحی)

اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ﴾ نازل ہوئی اور وحی رک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۃ المدثر نازل ہوئی۔ سورہ مزمل میں صرف پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ سورۂ مدثر میں لوگوں کو ڈرانے اور دوسری باتوں کا حکم دیا گیا۔

آیت ① ﴿ الْمُدَّثِّرُ ﴾ اصل میں اَلْمُتَدَثِّرُ تھا تا کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کر دیا گیا جو کپڑا جسم کے ساتھ ملا ہوا ہو اسے شعار اور جو اس کے اوپر پہنا جائے اسے دثار کہتے ہیں۔

قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

اٹھ کھڑا ہو اور ڈرا۔ ② اور صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ ③

اس خطاب کی وجہ کے لیے دیکھیے سورہ مزمل کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت ② اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیات میں رسول اللہ ﷺ کو دعوت کے آغاز کا حکم ہوا ﴿ اِقْرَاْ ﴾ میں آپ کو وہ وحی پڑھنے کا حکم ہوا تھا جو آپ پر نازل ہوئی، اب وحی کے احکام کے مطابق لوگوں کو نصیحت کرنے اور ڈرانے کا حکم ہوا اور وہ اوصاف اختیار کرنے کا حکم دیا گیا جو داعی کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز سستی اور غفلت چھوڑ کر کمر ہمت باندھنا اور اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کی پرستش کرنے والوں کو اس کے وبال سے ڈرانا ہے۔

آیت ③ ﴿ وَرَبَّكَ ﴾ کو پہلے لانے سے یہ معنیٰ پیدا ہو گیا کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر ﴿ فَكَبِّرْ ﴾ میں فا پہلے "قم" کے جواب ہی میں ہے۔ یعنی "قُمْ فَكَبِّرْ رَبَّكَ" اسی طرح ﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ ﴾ میں بھی فا اسی قم کے جواب میں ہے۔

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ کے الفاظ میں صرف اپنے رب کو بڑا جان اور صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر، دونوں معنیٰ موجود ہیں۔ یعنی دعوت دیتے وقت کوئی کتنا بڑا سردار یا مالدار یا بادشاہ یا بدمعاش ہو اس کی بڑائی تمھاری دعوت کے لیے رکاوٹ نہ بنے بلکہ صرف اپنے رب کو بڑا جانو جب تمھارے دل و دماغ میں اور تمھاری آنکھوں کے سامنے صرف وہی بڑا ہو گا تو ساری مخلوق تمھاری نظروں میں ہیچ ہو گی اور تمھیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے احکام پہنچانے میں کسی کی بڑائی مانع نہیں ہو گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا وصف بیان فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ ﴾ (الاحزاب: ۳۹)

"کہ وہ اللہ کے پیغام پہنچاتے ہیں اور صرف اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے"

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝

اور اپنے کپڑے پاک رکھ۔ ④ اور پلیدگی سے دور رہ۔ ⑤

دوسرا معنیٰ ہے، صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر، یعنی جاہل اور مشرک لوگ جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں ان سب کی نفی کر دو اور صاف اعلان کر دو کہ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ کی شان ہے، اس کے علاوہ بڑا بننا کسی کا حق ہی نہیں۔ اس لیے عبادت کے لائق بھی صرف اسی کی ہستی ہے۔

آیت ④ فائدہ 1 کافر لوگ کتنے بھی صاف ستھرے ہوں اپنے کپڑے پاک نہیں رکھتے نہ انھیں پیشاب سے پرہیز ہوتا ہے نہ استنجا کی فکر نہ غسل جنابت کا خیال، حکم ہوا کہ آپ اپنے کپڑے پاک رکھیں۔ جب کپڑے پاک رکھنے ضروری ہیں تو جسم پاک رکھنا تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوا۔ آیت کے ظاہری الفاظ کا تقاضا یہ ہے اور سب سے پہلے مراد بھی یہی ہے۔ ہاں محاورہ میں پاک دامنی سے مراد گناہوں کی آلودگی سے پاک ہونا بھی ہوتا ہے اس لیے یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھو۔ طبری رحمہ اللہ نے پہلا معنیٰ زیادہ ظاہر قرار دیا ہے۔

فائدہ 2 ''اپنے کپڑے پاک رکھو'' میں ٹخنے سے اوپر کپڑا اٹھا کر رکھنے کا حکم بھی داخل ہے کیونکہ لٹکانے کی صورت میں اس کے پلید ہونے کا خطرہ بالکل ظاہر ہے۔

آیت ⑤ لفظی معنیٰ ہے ''اور پلیدگی کو چھوڑ دو'' مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی پلیدگی سے علیحدہ رہو۔ رجز اور رجس ایک ہی چیز ہے، اس کا سب سے پہلا مصداق بت اور غیر اللہ کے آستانے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾ (الحج: ۳۰) ''یعنی پلیدگی سے بچو کہ جو بت ہیں علاوہ ازیں الرجز (پلیدگی) میں ہر قسم کے فاسد اعتقاد، برے اخلاق، جھوٹے اقوال، قبیح اخلاق اور نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی تمام نجاستیں شامل ہیں۔ ان دونوں آیتوں میں داعی کو خود ہر لحاظ سے پاک صاف رکھنے کی تاکید ہے کیونکہ اگر وہ

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝

اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے۔⑥ اور اپنے رب ہی کے لیے صبر کر۔⑦ سو جب صور میں پھونکا جائے گا۔⑧ تو اس دن، وہ ایک مشکل دن ہے۔⑨

خود ہی ناپاک یا آلودہ ہوگا تو اس کی دعوت کیا اثر کرے گی؟

آیت⑥ مَنَّ يَمُنُّ (احسان کرنا۔ اِسْتَكْثَرَ (استفعال) زیادہ طلب کرنا۔ اِسْتَكْثَرَ الشَّيْءَ معنیٰ کسی چیز کو زیادہ سمجھنا بھی آتا ہے۔ یعنی آپ کسی پر احسان کریں تو اس نیت سے نہیں کہ مجھے اس سے زیادہ ملے گا۔ نہ راہ حق کی طرف رہنمائی کے احسان پر کسی سے یہ توقع رکھیں، نہ کسی کو کچھ دے کر اس سے زیادہ حاصل ہونے کی طلب رکھیں۔ توقع اور طلب صرف اپنے پروردگار سے رکھیں۔

اور یہ معنیٰ بھی درست ہے کہ آپ کسی پر جتنا بھی احسان کریں اسے زیادہ نہ سمجھیں۔ اس آیت میں داعی کو ہر قسم کے طمع اور لالچ سے اجتناب کا حکم ہے کیونکہ یہ چیز دعوت الی اللہ کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

آیت⑦ یعنی آپ کسی پر جو احسان کریں یا عطیہ دیں اس کی جزا صرف اپنے رب ہی سے لینے کے لیے صبر کریں۔ ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾ میں یہ معنیٰ بھی داخل ہے کہ آپ کو حق کا پیغام پہنچانے میں بہت سے مصائب و مشکلات کا سامنا ہوگا، عرب و عجم سے لڑائی درپیش ہوگی، آپ ان تمام مصائب پر صبر کریں اور یہ صبر صرف اور صرف اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے ہو۔ اس ہمت اور اولو العزمی کے بغیر دعوت کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا، لقمان نے اپنے بیٹے کو فرمایا تھا: ﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (لقمان: ۱۷) "اور نیکی کا حکم کر اور برائی سے منع کر اور جو تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کر یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔"

آیت⑧، ⑨ ﴿النَّاقُورِ﴾۔ نَقَرَ يَنْقُرُ (ن) سے فاعول کے وزن پر ہے جس کا معنیٰ ہے

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝

جو کافروں پر آسان نہیں۔⑩ چھوڑ مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔⑪

پھونکنا، آواز کرنا۔ ایسی ضرب لگانا کہ سوراخ ہو جائے، مراد صور ہے۔

شروع سورہ میں ڈرانے کا حکم ہے، اب اس کی تفصیل ہے کہ جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور ہر چیز فنا ہونے کے بعد دوبارہ سب لوگ قبروں سے نکل کر اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو وہ ایک مشکل دن ہوگا۔

آیت ⑩ پہلے فرمایا: ﴿يَوْمٌ عَسِيْرٌ﴾ وہ ایک مشکل دن ہے، پھر فرمایا: ﴿عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ﴾ کافروں پر آسان نہیں ہے، اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشکل ہوتا ہی وہ ہے جو آسان نہ ہو تو اس صراحت کا مطلب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مشکل دن میں کوئی نہ کوئی آسانی بھی ہوسکتی ہے یا ممکن ہے شروع میں مشکل ہو مگر پھر آسانی ہو جائے اس لیے فرمایا کفار کے لیے تو اس دن کوئی آسانی نہیں نہ شروع میں نہ بعد میں ہاں اہل ایمان کے لیے آسانی ہوگی: ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ﴾ (الانبیاء: ۱۰۳) ''یعنی وہ سب سے بڑی گھبراہٹ انھیں غمگین نہیں کرے گی'' اور اگر شروع میں کچھ شدت محسوس ہوئی بھی تو بعد میں آسانی ہو جائے گی۔

آیت ⑪ فائدہ ﴿1﴾ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو جھٹلانے میں سب سے پیش پیش مکہ کے بڑے بڑے سردار تھے۔ جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خوشحال اور دنیوی نعمتیں عطا فرمائی ہوئی تھیں۔ مگر انھوں نے مال، اولاد، جاہ وحشمت اور اقتدار پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بجائے اس کے رسول ﷺ کو جھٹلا دیا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کی بجائے اسے جادو اور انسانی کلام قرار دیا۔ ان لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کو مجھ پر چھوڑ دیں میں جانوں اور یہ جانیں ان کا بندوبست میں خود کروں گا۔

ان آیات سے اکثر مفسرین نے اگرچہ ایک خاص شخص ولید بن مغیرہ مراد لیا ہے مگر

﴿ مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴾ میں ''مَنْ '' کا لفظ واحد ہونے کے باوجود معنیٰ کے لحاظ سے عام ہے اور آیت میں مذکور مال و دولت اور اولاد و اقتدار صرف ولید ہی کے پاس نہ تھا نہ وہ اکیلا قرآن کو جادو اور انسانی کلام قرار دیتا تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والے اکثر متکبرین کا یہی حال تھا، اس لیے ان آیات میں ان سب کو تنبیہ کی گئی ہے۔

ہاں یہ درست ہے کہ آیات ولید بن مغیرہ پر بھی صادق آتی ہیں اور وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے جو ان آیات سے مراد ہیں اور ان آیات کے اس کے متعلق نازل ہونے کا مطلب بھی یہی ہے مگر وہ اکیلا ان آیات کا مصداق نہیں بلکہ ان سے ولید بن مغیرہ کے علاوہ ان صفات والے تمام متکبر مراد ہیں خواہ وہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا دنیا کے کسی دوسرے خطہ میں رہنے والے ہوں۔

فائدہ 2 مستدرک حاکم وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک صحیح روایت کا ماحصل یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ نے اسے قرآن کی کچھ آیات پڑھ کر سنائیں، وہ کچھ نرم ہو گیا۔ یہ خبر ابو جہل کو پہنچی، اس نے ولید بن مغیرہ سے کہا کہ قوم کے لوگ تم سے ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک قرآن کے بارے میں تم ان کی مرضی کے موافق کوئی بات نہ کہو گے' ولید بن مغیرہ نے جواب دیا کہ اچھا میں سوچ کر اس کے متعلق کچھ کہوں گا پھر اس نے اپنے وعدہ کے موافق لوگوں کے سامنے قوم کو خوش کرنے کے لیے یہ بات کہی جس کا ذکر ان آیتوں میں ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں آدمی کا کلام ہے مگر جادو کی وجہ سے اس میں یہ تاثیر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ (احسن التفاسیر) (مکمل روایت کے لیے دیکھیے، مستدرک حاکم، تفسیر سورۂ مدثر، حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے)

فائدہ 3 ﴿ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴾ کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ میں نے اسے اس حال میں پیدا کیا کہ وہ اکیلا تھا، نہ اس کی خدمت میں حاضر رہنے والے بیٹے تھے نہ کوئی مال و متاع۔ ہر انسان ماں کے پیٹ سے اکیلا آتا ہے مال، اولاد، فوج لشکر اور سامان وغیرہ کچھ ساتھ نہیں لاتا۔ ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ (الانعام: ۹۴) ''اور بے شک

وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ
اَنْ اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾

اور اسے لمبا چوڑا مال عطا کیا۔ ⑫ اور حاضر رہنے والے بیٹے عطا کیے۔ ⑬ اور اس کے لیے ہر قسم کے اسباب ہموار کر دیے۔ ⑭ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور دوں گا۔ ⑮ ہرگز نہیں یقیناً وہ ہماری آیات کا سخت مخالف رہا ہے۔ ⑯

تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آگئے جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔“

دوسرا یہ کہ میں نے اکیلے ہی اسے پیدا کیا اور اسے یہ سب کچھ عطا کیا اسے پیدا کرنے میں یا یہ مال و اولاد عطا کرنے میں کوئی دوسرا میرے ساتھ شریک نہ تھا۔

آیت ⑫ تا ⑭ ﴿مَّمْدُوْدًا﴾ مَدَّ يَمُدُّ (ن) سے اسم مفعول ہے پھیلایا ہوا یعنی مال مویشی، کھیت، باغات، کاروبار اور تجارت وغیرہ ہر قسم کا لمبا چوڑا مال عطا کیا۔ ﴿شُهُوْدًا﴾ شاہد کی جمع ہے ہر وقت خدمت میں حاضر بیٹے عطا کیے۔ بیٹے اللہ کی نعمت ہیں اور پاس رہ کر سارا کام سنبھال لیں اور خدمت کے لیے مستعد رہیں تو مزید نعمت ہیں۔ ﴿وَّمَهَّدْتُّ﴾ (تفعیل) بچھانا، مہیا کرنا، یعنی مال و اولاد کے ساتھ جاہ و حشمت اور سرداری کے تمام اسباب اس کے لیے ہموار کر دیے۔

آیت ⑮ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور دوں گا، یعنی اتنا کچھ ملنے کے باوجود دنیا میں اس کی حرص ختم نہیں ہوئی بلکہ آخرت میں اسے مزید ملنے کی توقع ہے۔ کفار کا کہنا تھا کہ اگر واقعی قیامت قائم ہوئی تو مال و اولاد وہاں بھی ہمیں کو ملیں گے۔ وہ دنیا میں ملنے والے مال و اولاد اور جاہ و حشمت کو آزمائش کی بجائے اللہ تعالیٰ کے ان پر راضی ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے۔ (دیکھیے سورہ مریم: ۷۷ تا ۸۰)

آیت ⑯ ﴿عَنِيْدًا﴾ (ن،ض) حق کو پہچانتے ہوئے ضد کی وجہ سے مخالفت کرنے والا۔ كَانَ سے ہمیشگی کا مفہوم نکل رہا ہے ”كَلَّا“ ہرگز نہیں، یعنی اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی مزید

سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ﴿١٧﴾ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾

ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾

إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾

میں اسے ایک دشوار گھاٹی چڑھنے کی تکلیف دوں گا۔⑰ اس نے غور و فکر کیا اور بات بنائی۔⑱ پس وہ مارا جائے، اس نے کس طرح بات بنائی!⑲ پھر مارا جائے، اس نے کس طرح بات بنائی!⑳ پھر اس نے (دوبارہ) غور کیا۔㉑ پھر تیوری چڑھائی اور برا منہ بنایا۔㉒ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔㉓ اور کہنے لگا یہ تو جادو کے علاوہ کچھ نہیں، جو نقل ہو کر آ رہا ہے۔㉔ یہ انسان کے قول کے علاوہ کچھ نہیں۔㉕

نوازش و مہربانی کا حقدار تو تب تھا جب وہ ہماری بات مانتا، وہ تو ہمیشہ سے ہماری آیات کا شدید مخالف رہا ہے۔

آیت ⑰ ﴿سَأُرْهِقُهُ﴾ أَرْهَقَ يُرْهِقُ (افعال) کسی کو ایسے کام کی تکلیف دینا جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو صَعُوْدٌ صَعِدَ يَصْعَدُ (س) چڑھنا۔(صعود: سخت دشوار گھاٹی)

یعنی میں اسے قیامت کے دن ایک دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے کے لیے مجبور کروں گا۔ قیامت کے دن کی اور جہنم کی مصیبتیں جھیلنے پر مجبور کرنے کو دشوار چڑھائی کی تکلیف دینے کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ترمذی میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ''صعود'' آگ کا ایک پہاڑ ہے جس پر کافر ہمیشہ ستر برس چڑھتا رہے گا اور اتنا عرصہ ہی اترتا رہے گا مگر اس کی سند کمزور ہے۔

آیت ⑱ تا ㉕ کفار کو مشکل یہ درپیش تھی کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید سے دور رکھنے کے لیے اس کے متعلق جو کچھ بھی کہتے کوئی اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا خود ان کے دل اس سے انکار کرتے تھے۔ وہ قرآن کو شعر، کہانت اور جادو کہہ کر اس سے متنفر کرتے تھے، مگر جانتے اور مانتے تھے کہ نہ اس میں شاعروں کے شعر کا مبالغہ یا جھوٹ ہے، نہ کاہنوں کی تک بندی

سَاُصۡلِيۡهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبۡقِيۡ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾

میں اسے جلد ہی سقر میں داخل کروں گا۔ ﴿۲۶﴾ اور تجھے کس چیز نے بتایا کہ سقر کیا ہے۔ ﴿۲۷﴾ وہ نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے۔ ﴿۲۸﴾

ہے نہ جادوگروں کے ٹونے ٹوٹکے، اس لیے ان کے بڑے سے بڑے سرداروں نے جن میں ولید بن مغیرہ بھی شامل تھا اپنے دماغ کا پورا زور صرف کر کے جو نتیجہ نکالا وہ دو باتوں پر مشتمل تھا ایک یہ کہ یہ وہی جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آیا ہے کیونکہ یہ قرآن اتنا پر تاثیر ہے کہ بھائی کو بھائی سے اور باپ کو بیٹے سے جدا کر دیتا ہے، حالانکہ وہ جادو اور جادوگروں سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ ہر موثر کلام جادو نہیں ہوتا، دوسرا نتیجہ قرآن کی عظمت گھٹانے کے لیے یہ نکالا کہ یہ ربانی کلام نہیں بلکہ انسان کا کلام ہے، حالانکہ ان کے سامنے یہ چیلنج موجود تھا کہ اگر یہ انسانی کلام ہے تو تم اس جیسی ایک سورہ ہی بنا کر لے آؤ۔ آج بھی یورپ و امریکہ اور دوسرے ممالک کے تحقیقی ادارے مسلمان طالب علموں کو بھاری وظیفے دے دے کر اپنے اداروں میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرواتے ہیں کہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، حالانکہ اتنی محنت کی بجائے یہی کافی تھا کہ وہ تین آیات ہی کی کوئی ایک سورہ پیش کر دیتے جو وہ نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔

﴿ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴾ سے ﴿ ثُمَّ اَدۡبَرَ وَاسۡتَكۡبَرَ ﴾ تک ان کیفیات کا ذکر ہے جن کا اظہار کر کے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے دماغ کی آخری قوت صرف کر کے یہ نتیجہ نکال رہے ہیں حالانکہ ان کے تیوری چڑھانے، برا منہ بنانے اور تکبر سے پیٹھ پھیر کر بات کرنے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ بات انصاف سے نہیں کہہ رہے بلکہ اس کا باعث صرف اور صرف عناد اور تکبر تھا۔

آیت ﴿۲۶﴾ سقر جہنم کا ایک نام ہے، علم اور مونث ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

آیت ﴿۲۸﴾ ﴿ لَا تُبۡقِيۡ ﴾ اَبۡقٰى يُبۡقِيۡ (افعال) باقی رکھنا۔ ''اَبۡقٰى عَلَيۡهِ'' رحم کرنا۔

یعنی وہ ان کی کوئی چیز جلانے سے باقی نہیں رکھے گی، اس پر بھی انھیں چھوڑے گی نہیں

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۚۖ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۞ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۙ وَمَا
جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ
الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ۙ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۙ وَلِيَقُولَ

کھالوں کو جلا دینے والی ہے۔ ⑳ اس پر انیس مقرر ہیں۔ ㉚ اور ہم نے جہنم کے محافظ فرشتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں بنائے اور ان کی یہ تعداد صرف کافروں کی آزمائش کے لیے بنائی ہے، تا کہ وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے اچھی طرح یقین کر لیں اور جو ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں خوب اضافہ ہو جائے اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے اور جو ایمان والے ہیں وہ

کہ ان کا قصہ تمام ہو جائے بلکہ انھیں دوبارہ پہلے کی طرح بنا دیا جائے گا اور جہنم پھر انھیں جلائے گی، جیسے فرمایا: ﴿ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ﴾ (النساء: ٥٦) ''جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم انھیں ان کے علاوہ اور کھالیں بدل دیں گے تا کہ وہ عذاب چکھیں۔'' ﴿ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴾ (الاعلی: ۱۳) اگر ''لَا تُبْقِي'' کے بعد ''عَلَيْهِمْ'' مقدر مانیں تو معنیٰ ہوگا نہ وہ ان پر رحم کرے گی، نہ انھیں چھوڑے گی، یہ معنیٰ بھی درست ہے۔

آیت ⑳ ﴿ لَوَّاحَةٌ ﴾ لَاحَ يَلُوحُ (ن) اور لَوَّحَ يُلَوِّحُ (تفعیل) کا معنیٰ جلانا، متغیر کرنا بھی آتا ہے اور ظاہر ہونا اور چمکنا بھی آتا ہے۔ (البشر) بَشَرَةٌ کی جمع ہے (کھالیں) یا بشر بمعنیٰ آدمی ہے، پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ وہ کھالوں کو جلا کر سیاہ کر دینے والی ہے، کھالوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ آدمی کو اپنے جس حسن و جمال پر ناز ہوتا ہے وہ اسی کھال کی وجہ ہی سے ہوتا ہے یا وہ آدمیوں کو جلا دینے والی ہے۔ دوسری صورت میں معنیٰ یہ ہے کہ وہ جسم پر چمکتی ہوئی نظر آئے گی۔ شاہ عبد القادر صاحب لکھتے ہیں جیسے لوہا دہکتا سرخ نظر آتا ہے آدمی کے پنڈے پر وہ سرخ نظر آئے گی۔ (موضح)

آیت ㉚، ㉛ فائدہ ① اللہ تعالیٰ نے جب جہنم پر مامور اشخاص کی تعداد انیس بتائی تو ساتھ ہی اس ٹھٹھے اور مذاق کا جواب بھی ذکر کر دیا جو کافر اڑا سکتے تھے اور انھوں نے اڑایا بھی، کہ انیس

الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۟

شک نہ کریں اور جن لوگوں کے دل میں بیماری ہے اور جو کافر ہیں وہ کہہ دیں کہ اللہ نے یہ مثال بیان کرنے سے کیا ارادہ کیا ہے؟ اسی طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور یہ باتیں بشر کی نصیحت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ (۳۱)

شخص ہم ہزاروں لاکھوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ فرمایا: ہم نے جہنم پر جن لوگوں کو مقرر کیا ہے وہ فرشتے ہیں اور فرشتہ تو ایک بھی ہو تو تم سب کے لیے کافی ہے۔

فائدہ (2) جہنم کے فرشتوں کی تعداد بتانے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ کافروں کی آزمائش ہوجائے گی، انھوں نے اپنے خبث باطن کا جو اظہار کرنا ہے کرلیں گے، جو مذاق اڑانا ہے اڑالیں گے اور اہل کتاب کو اس کے حق ہونے کا یقین ہوجائے گا کیونکہ یہ تعداد ان کی کتاب کے مطابق ہے یا وہ اپنی کتابوں کی وجہ سے فرشتوں کی غیر معمولی قوتوں کو جانتے ہیں اور ایمان والوں کا ایمان مزید بڑھ جائے گا اور اہل کتاب اور ایمان والوں کو اس کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں رہے گا ہاں کفار اور وہ لوگ جن کے دلوں میں حسد اور بغض کا مرض ہے یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مثال بیان کرنے سے کیا مقصد ہے؟ فرمایا دیکھ لو ایک ہی بات ہے مگر کسی کے حصے میں اس سے انکار آیا اور کسی کو ایمان و یقین کی دولت نصیب ہوگئی، یہ سب اللہ کی مشیت سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے مچھر اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال بیان کرنے پر ایمان والے تو اس کے حق ہونے کی تصدیق کریں گے کافر یہی کہیں گے اس قسم کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے؟ (دیکھیے بقرہ: ۲۶) اور اہل ایمان تو قرآن کی محکم و متشابہ ہر قسم کی آیات پر بلا چون و چرا ایمان لائیں گے مگر جن

کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی کے لیے متشابہات کے پیچھے لگے رہیں گے۔ (دیکھیے آل عمران:۷)

معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کا تقاضا ہم سے یہ ہے کہ جو بات اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آئے اس پر یقین کریں اور ایمان لائیں خواہ اس کی حکمت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو، جب یہ اعتراض فضول ہے کہ انسان کو مٹی سے کیوں بنایا؟ جنوں کو آگ سے کیوں بنایا؟ بچہ ماں کے پیٹ میں نو ماہ کیوں رہتا ہے؟ انڈے سے بچہ اکیس دنوں میں کیوں نکلتا ہے؟ کچھوے کی عمر طویل کیوں ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ تو یہ اعتراض کیوں کہ جہنم پر انیس فرشتے کیوں مقرر کیے ہیں؟ ایمان والوں کے پاس اس قسم کی تمام باتوں کا ایک ہی جواب ہے کہ مالک کی مرضی ہے جو چاہے کرے۔ اس مقام پر بعض مفسرین نے جہنم پر مامور فرشتوں کی تعداد انیس ہونے کی حکمت اپنی عقلی موشگافیوں سے بیان کی ہے جو سراسر تکلف ہے۔

یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اہل ایمان کا ایمان آیات الٰہی سننے سے بڑھ جاتا ہے تعجب ہے ان لوگوں پر جو قرآن کی صاف آیات کے باوجود کہتے ہیں کہ ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم۔ اب قرآن کی صاف آیات کے بعد انھیں قائل کرنے کے لیے کون سی چیز پیش کی جائے۔

﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ﴾ یہ اس لیے فرمایا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کارکنوں کی کمی ہے یعنی فرشتے تو اس کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہیں۔ اللہ کے پاس اتنے لشکر ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی انھیں جانتا ہی نہیں، پھر ان لشکروں میں سے ہر ایک کی تعداد بھی وہی جانتا ہے۔ حدیث معراج میں ساتویں آسمان کا ذکر کرتے ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر البیت المعمور میرے سامنے ظاہر کیا گیا، میں نے جبریل سے پوچھا تو انھوں نے بتایا: کہ یہ البیت المعمور ہے، اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں جب نکل جاتے ہیں تو اپنے آخری وقت تک دوبارہ یہاں نہیں آسکتے۔ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة، حدیث: ۳۲۰۷)

﴿ وَمَا هِيَ ﴾ سے مراد وہ آیات ہیں جن میں "**سقر**" کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۙ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۙ﴿۳۴﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۙ﴿۳۵﴾ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ۙ﴿۳۶﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿۳۷﴾

ہرگزنہیں، قسم ہے چاند کی۔ ۞۳۲ اور رات کی جب وہ جانے لگے! ۞۳۳ اور صبح کی جب وہ روشن ہو! ۞۳۴ یقیناً وہ (جہنم) بہت بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔ ۞۳۵ بشر کے لیے ڈرانے والی ہے۔ ۞۳۶ اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے۔ ۞۳۷

آیت ۳۲ تا ۳۷ ”كَلَّا“ ہرگز نہیں، یعنی جہنم یا اس پر مامور فرشتوں کی تعداد سے انکار ہرگز درست نہیں۔ اس کے بعد تین چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جہنم یقیناً بہت ہی بڑی چیز ہے۔ ان قسموں کی مناسبت جوابِ قسم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہنم کا انکار کرنے والوں کا انکار اس لیے ہے کہ وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور ان کے خیال میں اتنی بڑی ہولناک اور عظیم الشان چیز کا موجود ہونا ممکن نہیں، فرمایا اس کائنات میں چاند کو دیکھو وہ ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال ہونے تک روزانہ جن مراحل سے گزرتا ہے ان پر غور کرو رات کو دیکھو جب وہ رخصت ہوتی ہے اور کائنات میں روزانہ ایک عظیم انقلاب رونما ہوتا ہے، پھر صبح کو دیکھو جب روشن ہوتی ہے تو رات کی ظلمت اپنا بوریا بستر سمیٹ لیتی ہے۔ ان میں سے ہر چیز اللہ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے، ان میں سے کوئی بھی چیز اگر تم نے دیکھی نہ ہوتی اور تمھیں اس کے متعلق بتایا جاتا تو تم اسی طرح انکار کر دیتے جس طرح جہنم سے انکار کر رہے ہو؟ جب اتنی بڑی بڑی حقیقتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور تمھیں ان کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں تو ان چیزوں کا پیدا کرنے والا تمھیں بتا رہا ہے کہ یقیناً جہنم بھی اس کی بہت بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے، اس میں تمھیں شک کیوں ہے؟

ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ تمھارا یہ جلدی مچانا بھی بے محل ہے کہ اگر سچے ہو تو ابھی لاؤ وہ قیامت اور جہنم جس سے ڈراتے ہو، فرمایا چاند کا ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال تک پہنچنا، رات کا جانا اور صبح کا روشن ہونا اور کائنات کے بڑے بڑے انقلابات میں سے ہر انقلاب

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّآ أَصْحَٰبَ ٱلْيَمِينِ ۝ فِى جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ۝

عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ۝

ہر شخص نے جو کمایا اس کے بدلے گروی رکھا ہوا ہے۔ ۳۸ مگر دائیں طرف والے۔ ۳۹
جنتوں میں سوال کریں گے۔ ۴۰ مجرموں سے۔ ۴۱ تمھیں کس چیز نے سقر میں داخل کر دیا۔ ۴۲

اپنے مقرر وقت پر آتا ہے، کبھی وقت سے پہلے نہیں آتا۔ اسی طرح تم یقیناً درجہ بدرجہ قیامت کی طرف جا رہے ہو اور بہت جلد جہنم تمھارے سامنے آ جائے گی۔ ﴿ فَلَآ أُقْسِمُ بِٱلشَّفَقِ ..... الخ﴾ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے (دیکھیے تفسیر سورۃ الانشقاق: ۱۶ تا ۱۹)

﴿ ٱلْكُبَرِ ﴾ کبریٰ کی جمع ہے، جو اکبر کی مونث ہے۔ ﴿ نَذِيرًا ﴾ ڈرانے والی، فعیل کا وزن مذکر، مونث، واحد، تثنیہ، جمع سب کے لیے آ جاتا ہے۔

یعنی یہ انسانوں کو ڈرانے والی ہے، ان انسانوں کو جنھیں اختیار ہے کہ یہ جہنم سے ڈرانے والی آیات سن کر چاہیں تو ایمان قبول کر کے جنت کی طرف بڑھ جائیں اور چاہیں تو پیچھے رہ کر جہنم کے سزاوار بن جائیں۔ جس طرح فرمایا: ﴿ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (الکہف: ۲۹) ''یعنی ایمان و کفر دونوں کا اختیار ہے، ہاں کفر کی اجازت نہیں نہ وہ اللہ کو پسند ہے ﴿ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ ٱلْكُفْرَ ﴾ (الزمر: ۷) ''اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ۳۸، ۳۹ یعنی جس طرح کوئی گروی رکھی ہوئی چیز اس وقت تک نہیں چھوٹتی جب تک وہ حق ادا نہ کر دیا جائے جس کے بدلے اسے گروی رکھا گیا ہے، اسی طرح ہر شخص اپنے عمل کے عوض گروی اور گرفتار ہو گا جب تک وہ عمل پیش نہ کرے جس کی ادائیگی اس پر واجب تھی، رہائی نہیں پا سکتا۔ ہاں جنھیں دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا وہ گرفتار نہیں ہوں گے بلکہ اعمال صالحہ کی وجہ سے رہا ہو جائیں گے جس طرح حق ادا کرنے سے گروی چھوٹ جاتی ہے۔

آیت ۴۰ تا ۴۲ فائدہ ﴿1﴾ ﴿ يَتَسَآءَلُونَ ۝ عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴾ یعنی اصحاب الیمین جنتوں میں ایک دوسرے سے مجرموں کے بارے میں سوال کریں گے کہ فلاں مجرم کا کیا بنا؟ اور فلاں

کدھر گیا؟ ذرا جہنم میں ہی انھیں تلاش کریں، پھر جہنم میں جھانک کر دیکھیں گے اور وہ انھیں وہاں نظر آئیں گے تو ان سے کہیں گے: ﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴾ تمھیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا؟

آیات کی یہ تفسیر ﴿ يَتَسَاءَلُونَ ﴾ (باب تفاعل) اور ''عن'' کے اس ترجمے کے مطابق ہے جو اکثر استعمال ہوا ہے ﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴾ سے پہلے ﴿ يَقُولُونَ لَهُمْ ﴾ مقدر ہے۔ سورہ صافات میں اس سے ملتا جلتا منظر مذکور ہے:

﴿ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ۝ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَدِينُونَ ۝ قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ قَالَ تَاللَّهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ ۝ ....الخ ﴾ (الصافات: ۵۰، ۶۱) ''پھر وہ (جنتی) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے، ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا بات یہ ہے کہ میرا ایک ساتھی تھا جو (مجھے) کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی ماننے والوں میں سے ہو؟ کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا ہمیں بدلہ دیا جانے والا ہے۔ کہے گا کیا تم جھانک کر دیکھو گے پھر وہ جھانکے گا تو اسے جہنم کے عین درمیان میں دیکھے گا، کہے گا: اللہ کی قسم! تم تو قریب تھے کہ مجھے ہلاک ہی کر دیتے......الخ۔''

آیات کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ﴿ يَتَسَاءَلُونَ ﴾ يَسْأَلُونَ کے معنی میں ہے اور عن زائد ہے۔ '' أَيْ يَسْأَلُونَ الْمُجْرِمِينَ '' یعنی اصحاب الیمین مجرموں سے سوال کریں گے کہ تمھیں کس چیز نے جہنم میں داخل کر دیا؟

اصحاب الیمین کا جہنمیوں سے یہ سوال پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ انھیں ذلیل و خوار اور شرمندہ کرنے کے لیے ہوگا۔

فائدہ ② ان آیات سے معلوم ہوا کہ جنت و جہنم کے درمیان بے حساب دوری کے باوجود جنتی جہنمیوں کو دیکھیں گے اور ان سے سوال و جواب بھی کریں گے۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝

وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے۔ ۞۴۳ اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔ ۞۴۴ اور بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی فضول بحث کیا کرتے تھے۔ ۞۴۵ اور ہم جزا کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے۔ ۞۴۶

آیت ۞۴۳ تا ۞۴۶ جہنمی اپنے جہنم میں جانے کے چار اسباب بیان کریں گے پہلا یہ کہ وہ نماز ادا کرنے والوں میں شامل نہ ہوئے، دوسرا یہ کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، تیسرا یہ کہ دین کی باتوں کو مذاق کرنے اور جھٹلانے کے لیے وہ مجلسوں میں بیٹھ کر فضول بحث کیا کرتے تھے، چوتھا یہ کہ وہ روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔

(۱) صلاۃ ایمان کے ان ارکان میں سے ہے جن کے بغیر کوئی شخص اسلامی برادری میں شامل ہی نہیں ہوسکتا، نہ اسے ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ والی اخوت دینی حاصل ہوسکتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ (التوبۃ: ۱۱) ”پھر اگر وہ کفر سے توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ ادا کریں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔“

بلکہ جب تک کوئی شخص ایمان قبول کر کے صلاۃ و زکاۃ ادا نہ کرے، اس سے جنگ کا حکم ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَائَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ

(صحیح بخاری، عن ابن عمر، کتاب الایمان حدیث: ۲۵)

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑتا رہوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں

اور زکاۃ ادا کریں پھر جب وہ یہ کام کریں تو انھوں نے اپنے خون اور مال مجھ سے محفوظ کر لیے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔“

(۲) جہنمیوں کا یہ اقرار کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں مساکین کو کھانا کھلانا کس قدر ضروری ہے۔

(۳) اللہ کی آیات سے مذاق کرنا ان کے متعلق فضول بحث کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اگر کوئی مسلمان اس کا ارتکاب کرے تو وہ بھی کافر ہو جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۭ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ﴾ (التوبة: ٦٥، ٦٦)

”اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہیں گے ہم تو صرف بحث اور دل لگی کر رہے تھے۔
کہہ دے کیا اللہ کے ساتھ، اس کے رسول اور اس کی آیات کے ساتھ ہی تمھیں ہنسی مذاق کرنا تھا، بہانے مت بناؤ یقیناً تم ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے ہو۔“

(۴) قیامت پر یقین ایمان کی بنیادی شرط ہے، اس کے بغیر آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا، حدیث جبرئیل میں رسول اللہ ﷺ نے ایمان کی تعریف یہ فرمائی کہ ((أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَ شَرِّهِ)) ”ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ اور تقدیر پر خواہ اچھی ہو یا بری ایمان لاؤ۔“ (صحیح بخاری عن ابی ھریرة، الایمان، باب(۳۷) حدیث ۵۰۔ ومسلم عن عمر بن الخطاب، الایمان، باب (۱) حدیث: ۹۳)

فائدہ ③ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کفار اسلام کے تفصیلی احکام کے مخاطب نہیں ہیں نہ اللہ کی طرف سے انھیں اسلام کے احکام مثلاً نماز و زکاۃ وغیرہ بجا لانے کا حکم ہے، بلکہ ان سے مطالبہ ایمان کا ہے اور مؤاخذہ بھی اسی پر ہو گا کیونکہ ایمان کے بغیر وہ کوئی عمل کریں بھی تو بے فائدہ

﴿حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ؕ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ؕ﴾

یہاں تک کہ ہمیں یقین آ گیا۔﴿۴۷﴾ پس ان لوگوں کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی۔﴿۴۸﴾

ہے مگر ان آیات سے معلوم ہوا کہ کفار کے جہنم میں جانے کا باعث اعمال کا ترک بھی ہے اور وہ اسلام کے تمام اعمال بجا لانے کے مکلّف ہیں۔ ایمان لانے سے پہلے انھیں اعمال سے مستثنیٰ قرار دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ وضو کے بغیر چونکہ نماز قبول نہیں ہوتی اس لیے جب تک کوئی شخص وضو نہ کرلے وہ ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ کا مخاطب ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بے وضو شخص ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ کا مخاطب ہے اور اسے حکم ہے کہ وضو کر کے صلاۃ ادا کرے اسی طرح کفار بھی ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور دوسرے تمام احکام کے مخاطب ہیں اور انھیں حکم ہے کہ ایمان لا کر یہ تمام احکام ادا کریں۔

آیت ﴿۴۷﴾ یقین سے مراد موت ہے کیونکہ اس کے آنے پر تمام شکوک وشبہات دور ہو کر حقیقت سامنے آ جائے گی، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (الحجر: ۹۹) ''اور اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آ جائے۔'' اس سے مراد بھی موت ہے۔ دنیا میں کسی کو آخرت پر کتنا بھی یقین ہو اس یقین کے برابر نہیں ہو سکتا جو موت آنے پر حاصل ہوگا۔

آیت ﴿۴۸﴾ فائدہ ① کیونکہ کفار کے حق میں سفارش کی اجازت ہی نہیں ہوگی اگر کوئی کرے گا بھی تو کافر کے حق میں قبول نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے حق میں سفارش کریں گے تو قبول نہیں ہوگی یاد رہے کہ کفار کو سفارشیوں کی سفارش کا فائدہ نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سفارش سے جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔ البتہ تخفیف عذاب کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ابو طالب کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔

فائدہ ② اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مومن موحد ہیں مگر اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے انھیں سفارش فائدہ دے گی۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے انبیاء وشہداء وصلحاء ان

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿۴۹﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾
بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾

تو انھیں کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں۔ ﴿۴۹﴾ جیسے وہ سخت بد کے ہوئے گدھے ہیں۔ ﴿۵۰﴾ جو شیر سے بھاگے ہیں۔ ﴿۵۱﴾ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں۔ ﴿۵۲﴾

کی سفارش کریں گے اور وہ ان کی سفارش سے جہنم سے نکل آئیں گے، جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔

آیت ﴿۴۹﴾ تا ﴿۵۱﴾ ﴿مُّسْتَنفِرَةٌ﴾ باب استفعال سے اسم فاعل ہے بمعنی **نافرة** جیسے **عَجِبَ** اور **اِسْتَعْجَبَ**، **سَخِرَ** و **اِسْتَسْخَرَ** ہم معنی ہیں۔ **قَسْوَرَةٌ** **قَسْرٌ** سے ہے جس کا معنیٰ غلبہ اور قہر ہے چونکہ شیر اپنے شکار کو مغلوب و مقہور کرتا ہے اس لیے اسے قسورہ کہتے ہیں۔ شکاریوں کی جماعت کو بھی **قسورہ** کہتے ہیں۔ لوگوں کے شور و غل کو بھی **قسورہ** کہتے ہیں۔

کفار کے نصیحت اور آیات قرآنی سننے سے بھاگنے کو ان جنگلی گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو شیر کی آہٹ یا شکاریوں کے خطرے سے بدک کر بے تحاشا بھاگتے ہیں۔

آیت ﴿۵۲﴾ یعنی قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کا حق ہونا واضح ہو جانے کے باوجود ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے تازہ لکھی ہوئی تحریر دی جائے جو ابھی تہ بھی نہ کی گئی ہو اور ان کے ہر ہر شخص کو با قاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خط آئے کہ محمد ﷺ ہمارے رسول ہیں انھیں مان لو۔

دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں اتنے بڑے بن رہے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کے لیے تیار ہی نہیں بلکہ ان کی خواہش اور تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو نبی بنا دیا جائے۔ اسے کتاب عطا ہو اور وہ بھی خرق عادت کے طور پر کاغذ پر لکھی ہوئی سب کے سامنے کھلی ہوئی حالت میں ان پر نازل ہو، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ہی کو نبوت و کتاب عطا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن

كَلَّا ۖ بَلْ لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ ﴿۵۳﴾ نہیں نہیں! یقیناً یہ تو ایک یاد دہانی ہے۔ ﴿۵۴﴾ تو جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔ ﴿۵۵﴾ اور یہ لوگ نصیحت حاصل نہیں کریں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ وہی لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور لائق ہے کہ بخش دے۔ ﴿۵۶﴾

نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ﴾ (الانعام: ۱۲۴)
''اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے، کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمیں اس جیسی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے اس جگہ کو جہاں وہ اپنی رسالت رکھے۔'' اس سے ملتا جلتا مضمون سورۃ الفرقان آیات ۲۱ میں بیان ہوا ہے۔

آیت ﴿۵۳﴾ ﴿كَلَّا﴾ یعنی ایسا تو ہرگز ہو نہیں سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کو کتاب دی جائے اور ان کے انکار کی وجہ بھی یہ نہیں بلکہ ان کے نصیحت سے بھاگنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا آخرت پر ایمان نہیں اور تمام خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ جب تک یہ لوگ دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے رہیں گے آپ ان کو ان کے تقاضوں کے مطابق کوئی معجزہ بھی دکھا دیں تو وہ اسے جادو قرار دے کر ماننے سے انکار کر دیں گے۔ (دیکھیے: سورۃ الانعام: ۷)

آیت ﴿۵۴﴾، ﴿۵۵﴾ یعنی ان مشرکین نے جو قرآن کو جادو یا انسانی کلام قرار دیا ہے یہ بات ہرگز درست نہیں بلکہ یہ قرآن تو اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے، اب جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

آیت ﴿۵۶﴾ یعنی انسان کو اگرچہ اختیار ہے کہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا برائی کی مگر اس کا یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کے چاہنے کے تحت ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ہدایت حاصل کرنا چاہے مگر اللہ کا ارادہ نہ ہو تو اسے ہدایت حاصل ہو ہی جائے گی یا گمراہ ہونا چاہے مگر اللہ کی مشیت نہ ہو تو ضرور گمراہ

ہو کر ہی رہے گا پھر جب سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے تو وہی اس لائق ہے کہ ہر وقت اس سے ڈرا جائے اور اسی کی شان ہے کہ جو اس سے ڈرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اسے بخش دے۔

رکوعاتہا ۲ (۷۵) سُورَةُ الْقِيَامَةِ مَكِّيَّةٌ (۳۱) آیاتہا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝

نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں! ① اور نہیں، میں بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں! ②

تفسیر سورۃ القیامۃ

آیت ①، ② **مفردات**: ﴿ اَلْقِيٰمَةِ ﴾ قیام مصدر ہے (کھڑا ہونا) تا 'ایک دفعہ' کا معنیٰ ادا کرنے کے لیے ہے، یعنی آدمی کا ایک دفعہ کھڑا ہونا۔ یہاں یہ تنبیہ کرنے کے لیے لائی گئی ہے کہ قیامت کا وقوع دفعتاً ہوگا (راغب) یوم القیامۃ کا معنیٰ ہوگا ایک ہی دفعہ اٹھ کھڑے ہونے کا دن۔ اَللَّوَّامَةُ لَامَ يَلُوْمُ سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت ملامت کرنے والا۔ جیسے عَلَّامَةٌ ، فَهَّامَةٌ

فائدہ ① ﴿ لَآ اُقْسِمُ ﴾ کا معنیٰ یہ نہیں کہ میں قسم نہیں کھاتا بلکہ لَا الگ ہے اور اُقْسِمُ الگ، اور معنیٰ یہ ہے کہ نہیں' میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔ عرب کے ہاں یہ محاورہ عام ہے ﴿ لَا وَاللّٰهِ ﴾ جب کوئی شخص انکار کر رہا ہو تو پہلے اس کے انکار کی نفی ''لَا'' سے کی جاتی ہے پھر اپنی بات کی تاکید کے لیے قسم ذکر کی جاتی ہے، اردو میں بھی مخاطب کے غلط خیال کی تردید کے لیے ایسے ہی کہا جاتا ہے کہ نہیں' اللہ کی قسم! بات اس طرح ہے۔ کئی مفسرین نے فرمایا کہ ''لَا'' زائدہ ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں مگر زائدہ ماننے کی بجائے بامعنیٰ قرار دینا بلاغت قرآن کے زیادہ لائق ہے جب کہ معنیٰ بھی درست ہو رہا ہے اور پرزور ہو رہا ہے۔

فائدہ ② قرآن میں انسانی نفس کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک وہ جو اسے گناہ پر ابھارتا

ہے اس کا نام ''امّارہ'' ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ ﴾ (یوسف: ۵۳) یعنی نفس تو برائی کا حکم دینے والا ہے۔ دوسرا وہ نفس جو برائی پر آدمی کو ملامت کرتا ہے، کوئی بھی شخص خواہ نیک ہو یا بد، نیک کام میں کوتاہی اور برے کام کے ارتکاب پر خود اس کا نفس اسے ملامت کرتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اسے عام طور پر اردو میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تمام باتوں پر یقین ہو اور ان کے حق ہونے پر اسے پورا اطمینان اور تسلی ہو۔ منافقین کی طرح شک وشبہ میں مبتلا نہ ہو یہ نفس مطمئنہ ہے۔

فائدۃ ③ **یوم القیامۃ** اور **نفس لوامہ** کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہاں لفظوں میں مذکور نہیں مگر بعد میں آنے والی آیات سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ یہ ہے کہ ہم یقیناً انسان کی ہڈیاں اکٹھی کر کے اسے دوبارہ زندہ کریں گے۔

فائدۃ ④ قسم سے مراد اس بات کی تاکید ہوتی ہے جس کے لیے قسم کھائی جاتی ہے پھر بعض اوقات تاکید کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز نہایت عظیم الشان ہوتی ہے جس کی قسم کھائی گئی ہے اور اس کی عظمت ہی بات کی تاکید کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات قسم اپنے جواب قسم کی دلیل ہوتی ہے جس سے اس کی تاکید ہوتی ہے۔

یہاں قیامت کے دن کی قسم قیامت کے حق ہونے کی تاکید کے لیے اٹھائی گئی ہے، اس کی وجہ قیامت کی عظمت بھی ہے اور یہ بھی کہ روز قیامت اپنی دلیل خود ہے، جیسے ﴿ صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ﴾ میں قرآن کے حق ہونے کے لیے خود قرآن کی قسم کھائی ہے۔

اور نفس لوامہ کی قسم اس لیے کہ یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ اس کا نفس برے کام پر اسے ملامت کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کے نزدیک اچھائی یا برائی کا معیار کیا ہے اور قطع نظر اس سے کہ وہ ضمیر کی اس ملامت کی پروا کرتا ہے یا نہیں؟ ملامت کرنے والا یہ نفس اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر حجت ہے کہ جس طرح تمھارا اپنا نفس خود تم سے باز پرس کر رہا ہے لازم ہے کہ ایک ایسا وقت آئے جب تمھارا پیدا کرنے والا تم سے باز پرس کرے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ ۝

کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔③ کیوں نہیں؟ ہم قدرت رکھنے والے ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پورے درست کرکے بنا دیں۔④

آیت ③،④ فائدہ① ﴿ قَادِرِينَ ﴾ حال ہے۔ اس سے پہلے فعل محذوف ہے ﴿ بَلَىٰ نَجْمَعُهَا قَادِرِينَ ﴾ یعنی کیوں نہیں ہم انھیں جمع کریں گے، اس حال میں ہم اس بات پر قادر ہیں کہ......الخ۔"

فائدہ② قیامت کے منکرین یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ جب ان کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر ذرات کی صورت میں بکھر جائیں گی تو انھیں پھر دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (انسان اگر یہ خیال کرے کہ اس کی ہڈیاں خود بخود جمع نہیں ہوسکتیں یا مخلوق میں سے کوئی انھیں دوبارہ جمع نہیں کرسکتا تو اسے یہ سمجھنے کا حق ہے مگر) کیا وہ ہمارے متعلق گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کرسکیں گے۔ پہلی دفعہ جب اس کا نام ونشان تک نہ تھا ہم نے اسے پیدا کردیا تو اب اس کی ہڈیاں کیوں جمع نہیں کرسکتے یقیناً ہم انھیں جمع کریں گے اور بڑی ہڈیاں ہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی قدرت رکھتے ہیں کہ اس کے پورے جو نہایت باریک اور نازک ہڈیوں پر مشتمل ہیں دوبارہ درست کرکے بنا دیں۔ (سورہ یاسین آیات: ۷۷ تا ۷۹ اور بنی اسرائیل آیات: ۴۹ تا ۵۱ میں یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے)

فائدہ③ ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ قیامت کے دن جسم دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور وہ بھی حساب، عذاب اور ثواب میں روح کے ساتھ شریک ہوں گے۔ صحیح بخاری میں بنی اسرائیل کے ایک آدمی کا ذکر آیا ہے جس کے بیٹوں نے اس کے کہنے کے مطابق اسے مرنے کے بعد جلا کر ہڈیوں کو پیس کر، کچھ راکھ ہوا میں اڑا دی کچھ پانی میں بہادی، اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دے کر اس کے ذرات اکٹھے کرکے اسے دوبارہ زندہ کردیا الخ۔ اگر روح ہی سے باز پرس ہوتو ذرات جمع کرکے اسے دوبارہ سامنے کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝٥ يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ۝٦ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝٧

بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے (آنے والے دنوں میں بھی) نافرمانی کرتا رہے۔⑤ وہ پوچھتا ہے اٹھ کھڑے ہونے کا دن کب ہوگا؟⑥ پھر جب آنکھ پتھرا جائے گی۔⑦

آیت ⑤، ⑥ ﴿ لِيَفْجُرَ ﴾ فَجَرَ (ن) فُجُورًا جھوٹ بولنا، گناہ کرنا، زنا کرنا۔

یعنی قیامت کے انکار کی کوئی اور وجہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے یعنی آنے والے دنوں میں بھی نافرمانی اور گناہ کرتا رہے۔ اب اگر وہ قیامت پر ایمان لائے تو اس کا تقاضا ہے کہ گناہ چھوڑ دے جسے چھوڑنے پر وہ آمادہ نہیں گویا وہ عقل کی وجہ سے قیامت کا انکار نہیں کر رہا بلکہ ہوس نے اسے اندھا کر رکھا ہے اس لیے وہ تیاری کے لیے نہیں بلکہ مذاق اڑانے اور جھٹلانے کے لیے پوچھتا ہے کہ وہ دفعتاً اٹھ کھڑے ہونے کا وقت کب ہوگا؟

آیت ⑦ ﴿ بَرِقَ الْبَصَرُ ﴾ (س، ن) بَرَقًا و بُرُوقًا۔ آنکھ کا حیرت سے کھلا رہ جانا یا دہشت زدہ ہو کر کچھ نہ دیکھ سکنا۔ (قاموس)

اللہ تعالیٰ نے قیامت کی تاریخ اور قیامت بتانے کی بجائے اس دن واقع ہونے والی چند چیزیں بیان فرما دیں: ﴿ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴾ یعنی قیامت کے دن کے عجیب و غریب حوادث و واقعات کو دیکھ کر آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جائیں گی اور خوف و دہشت کے مارے ان سے کچھ دکھائی نہ دے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۚ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۝ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۖ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ۝ ﴾ ''اور ہرگز خیال نہ کر کہ اللہ تعالیٰ ان کاموں سے بے خبر ہے جو ظالم لوگ کر رہے ہیں وہ تو انھیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جب آنکھیں کھلی رہ جائیں گی حال یہ ہوگا کہ سر اٹھاتے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے ان کی نگاہیں ان کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گی اور دل ہوا ہو رہے ہوں گے۔ (ابراھیم: ۴۲، ۴۳)

وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰

كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲ يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝۱۳

اور چاند گہنا جائے گا۔ (۸) اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ (۹) اور انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ (۱۰) نہیں نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں۔ (۱۱) اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے۔ (۱۲) اس دن انسان کو بتایا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا۔ (۱۳)

آیت (۸) چاند گہنا جائے گا یعنی بے نور ہو جائے گا۔

آیت (۹) یعنی یہ نظام فلکی جس میں چاند، سورج سے لاکھوں میل کے فاصلے پر ہے، درہم برہم ہو جائے گا اور سورج و چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكَوَّرَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) قیامت کے دن سورج اور چاند لپیٹے ہوئے ہوں گے۔'' (صحيح بخارى، كتاب بدء الخلق، باب صفة الشمس و القمر، حديث : ۳۲۰۰)

آیت (۱۰) تا (۱۲) یہ انسان جو آج پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا؟ اس دن ایسا حیران اور خوف زدہ ہوگا کہ بھاگنے کے لیے جگہ تلاش کرے گا مگر اس دن کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی اور سب لوگوں کو اپنے رب کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔

آیت (۱۳) ''جو آگے بھیجا'' سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس نے موت سے پہلے کیے اور ''جو پیچھے چھوڑا'' سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل جاری رہتے ہیں۔ صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔ (صحيح مسلم، عن ابى هريرة، كتاب الوصية، باب ما يلحق الا نسان من الثواب بعد وفاته)

اور فرمایا: ''جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کرے پھر اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کیا جائے اس کے لیے ان لوگوں کی مثل اجر لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے، ان کے

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌۙ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗؕ۝

بلکہ انسان اپنے آپ کو خوب دیکھنے والا ہے۔ ⑭ اگرچہ وہ اپنے بہانے پیش کرتا رہے۔ ⑮

ثواب سے بھی کچھ کم نہیں ہوگا اور جو شخص اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کرے پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا جائے اس پر ان لوگوں کے گناہ کی مثل لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے گناہ میں سے بھی کچھ کم نہیں ہوگا۔ (مسلم، عن ابی هريرة، كتاب العلم، باب من سن سنة حسنة او سيئة)

﴿ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اس نے کیا اور جو کرنا تھا مگر نہیں کیا، تیسرا معنیٰ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے پہلے وقت میں کیا اور جو بعد میں کیا سب تاریخ اور وقت کے ساتھ اسے بتایا جائے گا۔

آیت ⑭، ⑮ ﴿ بَصِيْرَةٌ ﴾ بَصُرَ (ک) سے صفت کا صیغہ ہے 'تا' مزید مبالغہ کے لیے ہے۔ جیسے علّامۃ میں ہے، یہ تاءِ تانیث نہیں ہے۔ ''خوب دیکھنے والا''۔

﴿ مَعَاذِيْرَهٗ ﴾ مَعْذِرَةٌ کی جمع ہے، یعنی اس دن انسان کو پہلے اور پچھلے اعمال بتائے جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کرتا رہا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے متعلق خوب معلوم ہے کہ وہ اچھا کام کر رہا ہے یا برا۔ پھر دوسروں کے سامنے اپنے کفر و شرک، خالق کی نافرمانی، اس کی مخلوق پر ظلم و ستم اور اپنی خواہش پرستی کے جواز کے لیے مجبوری یا مصلحت کے لاکھ بہانے گھڑے مگر خود اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور بہانہ بازی کر رہا ہے۔ اس کے نفس کی ملامت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے کرتوتوں سے آگاہ ہے۔ نامۂ اعمال پیش کیے جانے کا مطلب تو اس پر حجت تمام کرنا ہے۔ اور یہ حجت صرف نامۂ اعمال کے ذریعے نہیں بلکہ اس کے ہر ہر عضو کو بلوا کر اور زمین کے ہر اس حصے کو بلوا کر جس پر اس نے نافرمانی کی تھی، پوری کی جائے گی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖؕ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗۚۖ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗؕ

تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے کہ اسے جلدی حاصل کر لے۔ ⑯ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور (آپ کا) اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ ⑰ تو جب ہم اسے پڑھیں تو تو اس کو پڑھنے کے پیچھے پیچھے چلا آ۔ ⑱ پھر بلاشبہ اسے واضح کرنا ہمارے ذمے ہے۔ ⑲

آیت ⑯ تا ⑲ فائدہ ① ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید اترتے وقت بہت تکلیف محسوس کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ساتھ ساتھ ہونٹ ہلاتے جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ”تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے کہ اسے جلدی حاصل کرے بلاشبہ اس کو جمع کرنا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا) اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے آپ کے سینے میں جمع کرنا اور آپ کا اسے پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ تو جب ہم اسے پڑھیں تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ﴾ پھر یہ ہمارے ذمے ہے کہ آپ اسے پڑھیں گے۔ اس کے بعد جب جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آتے آپ کان لگا کر سنتے رہتے، جب وہ چلے جاتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح پڑھ لیتے جیسے جبریل علیہ السلام نے پڑھا تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث:۵)

﴿جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ سے اولین مراد یہی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے قرآن جمع کرنے اور اسے پڑھنے کی تمام صورتیں اس میں شامل ہیں اور اس کے جمع ونشر کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے، چنانچہ خلفاء کا قرآن مجید کو جمع کرنا، لکھوانا، حفاظ کا حفظ کرنا۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، پریس اور کمپیوٹر کے ذریعے قرآن کا جمع اور نشر ہونا بھی اس میں شامل ہے۔

فائدہ ② ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ﴾ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی وضاحت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ

نے خود اٹھایا ہے اور یہ وضاحت رسول اللہ ﷺ کے ذریعے فرمائی ہے، جو حدیث وسنت کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے، مثلاً قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نماز قائم کرنے کا حکم دیا تو اس کی تشریح رسول اللہ ﷺ کے عمل اور فرمان کے ساتھ کر دی کہ نمازوں کے اوقات کیا ہیں؟ نمازیں کتنی ہیں؟ ان کی رکعات، قیام، رکوع، سجود وغیرہ کی ترتیب، ان میں پڑھے جانے والے اذکار غرض یہ سب کچھ قرآن کا بیان ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾

(النحل: ٤٤)

’’اور (اے رسول!) ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس (ذکر) کی وضاحت اور تشریح کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور وفکر کریں۔‘‘

معلوم ہوا کہ حدیث قرآن ہی کا بیان ہے اس لیے اس پر عمل کرنا بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن پر واجب ہے۔

فائدہ 3 ﴿ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ ﴾ میں ’’جب ہم اسے پڑھیں‘‘ سے مراد یہ ہے کہ جب جبریل علیہ السلام پڑھ رہے ہوں کیونکہ ان کا پڑھنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، اس لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف فرمائی۔

فائدہ 4 سورہ کے شروع میں منکرین حشر وقیامت کا ذکر ہے۔ سورہ کے آخر میں بھی یہی ذکر ہے۔ درمیان میں یہ آیات ہیں جن کا بظاہر ماقبل اور مابعد سے کوئی ربط نہیں، اس لیے بعض شیعہ مفسرین نے یہاں تک لکھ دیا کہ اس سورہ میں کچھ آیات رہ گئی ہیں مگر یہ بات غلط ہے کیونکہ اس کا رد خود ان آیات میں موجود ہے کہ قرآن کا جمع کرنا اللہ کے ذمہ ہے پھر اس میں سے آیات کس طرح رہ سکتی ہیں؟ اور یہ بات بھی صحیح سندوں سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کی آیات کی یہ ترتیب خود رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی ہے، جیسا کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝

نہیں نہیں، بلکہ تم جلدی ملنے والی کو پسند کرتے ہو۔ ⑳ اور بعد میں آنے والی کو چھوڑ دیتے ہو۔ ㉑

فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر ایک وقت میں کئی سورتیں نازل ہو رہی ہوتی تھیں، جب کوئی چیز نازل ہوتی آپ کسی وحی لکھنے والے کو بلا کر فرماتے یہ آیات اس سورہ میں لکھو جس میں فلاں فلاں بات کا ذکر ہے، جب آپ پر کوئی آیت اترتی تو فرماتے اسے اس سورہ میں لکھ دو جس میں فلاں فلاں بات کا ذکر ہے (ترمذی تفسیر سورہ توبہ، ابوداؤد، نسائی، احمد، مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان میں بھی یہ حدیث موجود ہے)

اگرچہ بعض مفسرین نے ان آیات کا ربط ماقبل اور مابعد کے ساتھ بنانے کی کوشش کی ہے مگر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے بعد جو بہترین سندوں کے ساتھ امام بخاری نے نقل فرمائی ہے خودساختہ ربط کی تکلیف اٹھانا' سراسر تکلف ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے وقت اور سورہ طٰہٰ کی آیت: ﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ﴾ نازل ہونے کے وقت رسول اللہ ﷺ کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ پڑھنے کا موقع پیش آیا اور اس وقت ممانعت کا یہ حکم نازل ہوا اور اس مقام پر قرآن میں لکھ دیا گیا۔ اس کی مثال ایسے ہی سمجھیں جیسے کوئی استاذ شاگرد کو کوئی چیز پڑھا رہا ہو۔ درمیان میں اس کی کسی حرکت کی اصلاح کے لیے کہے "ایسا مت کرو" اور پہلا سلسلہ کلام جاری کر دے تو ٹیپ ریکارڈ میں یہ بات بھی ریکارڈ ہو جائے گی اور لفظ بلفظ تحریر میں بھی اسی طرح نقل ہو گی، درمیان میں آنے والی اس بات کا معنوی ربط و تعلق ماقبل و مابعد سے جوڑنا تکلف ہو گا، مگر اس بات کو بے محل نہیں کہہ سکتے یقیناً اس موقع پر یہی بات ضروری تھی اور یہ بھی ربط کی ایک صورت ہے کہ موقع محل کے تقاضے سے یہ الفاظ درمیان میں آ گئے۔

آیت ⑳، ㉑ یہاں سے پھر وہی سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے جو: ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ ﴾ سے پہلے چل رہا تھا۔ فرمایا تمھارے قیامت کا انکار کرنے کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾

اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ (۲۲) اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔ (۲۳)

دنیا سے محبت کرتے ہو اور اس کی محبت میں آخرت کو چھوڑ ہی بیٹھے ہو کیونکہ دنیا جلدی ملنے والی اور نقد ہے جب کہ آخرت بعد میں آئے گی اور ادھار ہے، حالانکہ اس نقد کی راحتیں اور رنج عارضی ہیں اور آخرت ہمیشہ رہنے والی اور کہیں بہتر ہے، جیسے فرمایا: ﴿ بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ۖ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى ﴾ (الاعلیٰ: ۱۶، ۱۷)

آیت (۲۲)، (۲۳) **مفردات**: نَاضِرَةٌ نَضَرَ الْوَجْهُ وَالشَّجَرُ وَاللَّوْنُ (ن، ک، س) چہرے یا درخت یا رنگ کا تروتازہ، خوبصورت اور بارونق ہونا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن نیک بندوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور اس خوشی میں ان کے چہرے تروتازہ اور چمک رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انسان ہوں یا حیوان، نباتات ہوں یا جمادات ایسا ایسا حسن و جمال ہے جسے دیکھ کر خوشی سے چہروں پر تازگی اور رونق آ جاتی ہے۔ جب حسن و جمال کے خالق کی ذات کو دیکھیں گے تو ان کی خوشی اور ان کے چہروں کی تازگی کا کیا ٹھکانا ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی سب سے بڑی نعمت ہی یہ ہوگی کہ جنتی اپنی آنکھوں سے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔

صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے، اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا تمھیں کوئی چیز چاہیے جو میں تمھیں مزید عطا کروں؟ وہ کہیں گے: کیا تو نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور آگ سے نجات نہیں دی؟ فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ پردہ ہٹا دے گا اور انھیں کوئی بھی چیز نہیں دی گئی ہوگی جو انھیں اپنے رب کو دیکھنے سے زیادہ پیاری ہو، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ ﴾ (یونس: ۲۶) جن لوگوں نے اچھے اعمال کیے، ان کے لیے اچھا اجر ہے اور مزید بھی (مزید سے رب تعالیٰ کا دیدار مراد ہے) (صحیح

وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌۙ۝۲۴ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌؕ۝۲۵

اور کئی چہرے اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے۔ ﴿۲۴﴾ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ ایسی سختی کی جائے گی جو کمر توڑنے والی ہوگی۔ ﴿۲۵﴾

مسلم حدیث: ٤٤٨، ٤٤٩ ـ کتاب الایمان)

جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا)) ''تم اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے صاف دیکھو گے۔'' (صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول لله تعالیٰ و جوه یو مئذ ناضرة، حدیث : ٧٤٣٤) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھیں چودھویں رات کا چاند دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا: ''نہیں'' فرمایا: ''کیا تمھیں سورج دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے جس کے سامنے بادل کی رکاوٹ بھی نہ ہو، کہا نہیں، فرمایا: ''یقین رکھو کہ تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے۔'' (صحیح بخاری حواله مذکور، حدیث: ٧٤٣٧ و مسلم، حدیث : ٤٥٠)

قرآن مجید میں فاجر لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿ كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَؕ ﴾ (المطففین: ١٥) ''کہ وہ اس دن اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائیں گے۔'' اللہ تعالیٰ نے ان کے دیدار الٰہی سے محروم رکھے جانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا اگر ابرار کو بھی اس دن رب کا دیدار نہ ہوا تو ان میں اور فجار میں کیا فرق رہا؟

بہت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اتنی واضح آیات و احادیث کے باوجود قیامت کے دن دیدار الٰہی کے منکر ہیں۔ اس انکار کا بدلہ یہی ہے کہ انھیں قیامت کے دن اس سب سے بڑی نعمت سے محروم ہی رکھا جائے۔

آیت ﴿۲۴﴾، ﴿۲۵﴾ **مفردات**: ﴿ بَاسِرَةٌ ﴾ بَسَرَ (ن) بُسُوْرًا تیوری چڑھانا، منہ بگاڑنا۔ ﴿ فَاقِرَةٌ ﴾ وہ سختی جو کمر توڑ دے یہ '' فَقَرَاتُ الظَّهْرِ '' سے نکلا ہے جس کا معنیٰ پیٹھ کے

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ وَقِيْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ۙ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ؕ

نہیں نہیں، (وہ وقت یاد کرو) جب ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی۔ ۲۶ اور کہا جائے گا کون ہے دم کرنے والا؟ ۲۷ اور وہ سمجھ لے گا کہ یقیناً یہ جدائی ہے۔ ۲۸ اور پنڈلی، پنڈلی کے ساتھ لپٹ جائے گی۔ ۲۹ اس دن تیرے رب ہی کی طرف روانگی ہے۔ ۳۰

مہرے ہیں۔ کہا جاتا ہے" فَقَرْتُ الرَّجُلَ میں نے اس آدمی کی پیٹھ کے مہرے توڑ دیے۔"

آیت ۲۶ تا ۳۰ **مفردات**: ﴿ بَلَغَتْ ﴾ کا فاعل نفس ہے جو محذوف ہے، یعنی جان ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی۔ ﴿ اَلتَّرَاقِیْ ﴾ تَرْقُوَۃٌ کی جمع ہے، سینے کی اوپر والی ہڈی جو گلے کے ساتھ ہے، ہنسلی۔ ﴿ رَاقٍ ﴾ رَقٰی یَرْقِیْ (باب ضرب) سے اسم فاعل ہے۔ دم کرنے والا۔ ﴿ وَّظَنَّ ﴾ ظَنَّ کا معنیٰ گمان کرنا ہے، اگر اس کے بعد اَنَّ ہو تو یقین کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ ﴿ اَلْمَسَاقُ ﴾ سَاقَ یَسُوْقُ سَوْقًا مصدر میمی ہے، ہانکنا، چلانا۔

فائدہ 2 ﴿ كَلَّآ ﴾ نہیں نہیں، یعنی تمھارا جلدی حاصل ہونے والی دنیا سے محبت کرنا اور آخرت کو چھوڑ دینا ہرگز درست نہیں، تمھارے سامنے کتنے لوگ دنیا سے رخصت ہوئے ان کا آخری وقت یاد کرو جب جان پیروں سے اور تمام جسم سے نکل کر ہنسلیوں تک پہنچ جاتی ہے اور حکیموں ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر کسی دم کرنے والے کی تلاش شروع ہوتی ہے کہ شاید دم ہی سے اچھا ہو جائے۔ ادھر بیمار کو زندگی سے ناامیدی ہو گئی، مرنے کا گماں قوی ہو گیا۔ پکے دنیا داروں کو جان بہت پیاری ہوتی ہے، مرنا نہیں چاہتے' آخری وقت تک ان کو زندگی کی توقع رہتی ہے اس لیے یقین کی جگہ گمان کا لفظ فرمایا، لیکن آخر یہ گمان یوں یقین کے درجے کو پہنچ گیا کہ پاؤں کا دم نکل گیا۔ پنڈلیاں سوکھ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں یہاں تک کہ ٹانگوں کو کوئی دوسرا آدمی سیدھا نہ کرے تو سمٹی ہوئی ہی رہ جائیں، آخر سارے جسم میں سے کھینچ کر جو جان حلق میں آ گئی تھی اس نے بھی جسم کو چھوڑ دیا اور پھر اس کی روانگی اس رب تعالیٰ

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ۙ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ۙ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝ؕ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ۙ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ؕ﴾

سو نہ اس نے سچ مانا اور نہ نماز ادا کی۔ ﴿۳۱﴾ اور لیکن جھٹلایا اور منہ پھیر کر چلا گیا۔ ﴿۳۲﴾ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چلا۔ ﴿۳۳﴾ یہی تیرے لائق ہے، پھر یہی لائق ہے۔ ﴿۳۴﴾ پھر تیرے لائق یہی ہے، پھر یہی لائق ہے۔ ﴿۳۵﴾

کی طرف ہوگئی جس نے پہلے جسم میں وہ جان ڈالی تھی۔ (خلاصہ احسن التفاسیر)

آیت ﴿۳۱﴾ تا ﴿۳۵﴾ **مفردات**: ﴿يَتَمَطّٰى﴾ ''م ط و '' سے تَمَطّٰی کا مضارع ہے ''مطا'' کا معنیٰ پیٹھ ہے یعنی اکڑتا ہوا۔ ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى﴾ ''و ل ی'' سے اسم تفضیل ہے زیادہ لائق، زیادہ حق دار، زیادہ قریب۔

فائدہ ① ''سو نہ اس نے سچ مانا' میں ضمیر اس انسان کی طرف جا رہی ہے جس کا اوپر'' کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے'' میں ذکر ہے۔'' یعنی یہ دیکھنے کے بعد کہ موت کے وقت انسان پر کیا گزرتی ہے اور کس طرح بے بس ہو کر اسے اپنے رب کی طرف روانہ ہونا ہے، حق تو یہ تھا کہ وہ آخرت کو سچ مانتا اور اس دن کی نجات کے لیے نماز ادا کرتا اور اللہ کی زمین پر عجز و بندگی اختیار کرتا مگر اس نے نہ عقیدہ کی اصلاح کی، نہ عمل کی، نہ لوگوں کے ساتھ اپنی روش درست کی، بلکہ آخرت کو اور پیدا کرنے والے کو جھٹلایا اور ماننے کی بجائے منہ پھیر کر چلا گیا اور عجز و بندگی اختیار کرنے کی بجائے گھر کو گیا تو اکڑتا ہوا گیا۔

فائدہ ② ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى﴾ اس آیت کی سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو حافظ ابن کثیر نے فرمائی ہے کہ اس کافر کو جس نے اپنے خالق سے کفر کیا اور متکبرانہ چال چلا' اللہ تعالیٰ کی طرف سے طنز اور دھمکی کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ جب تو نے جھٹلا دیا اور اپنے خالق سے کفر کی جرأت کر چکا تو تیرا حق بنتا ہے کہ یہ چال چلے اور یہی چال تیرے لائق ہے۔ ہم تمھاری چال دیکھ رہے ہیں اور تمھیں اس کا نتیجہ مل جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴿٣٩﴾ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ﴿٤٠﴾

کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے بغیر پوچھے ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ (۳۶) کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے۔ (۳۷) پھر وہ جما ہوا خون بنا پھر اللہ نے اسے پیدا اور درست بنا دیا۔ (۳۸) پھر اس سے دو قسمیں نر اور مادہ بنائیں۔ (۳۹) کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ (۴۰)

مُّجْرِمُونَ ﴾ ''یعنی کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ' تھوڑا' یقیناً تم مجرم ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُم مِّن دُونِهِ ﴾ یعنی اس اللہ کے علاوہ جس کی چاہو عبادت کرتے رہو۔'' اور فرمایا: ﴿ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ﴾ یعنی جو چاہو کرو۔ ﴿ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۝ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴾ میں تکرار مزید وعید کے لیے ہے۔ یہ معنیٰ اس لیے بھی بہتر ہے کہ ''اولیٰ'' کا معنیٰ زیادہ لائق' زیادہ حق دار، معروف ہے۔

فائدہ 3 بہت سے مفسرین نے ﴿ أَوْلَىٰ لَكَ ﴾ کا معنیٰ کیا ہے 'خرابی ہے تیرے لیے'' افسوس ہے تیرے لیے' ہلاکت ہے تیرے لیے کیونکہ ﴿ أَوْلَىٰ لَكَ ﴾ کلام عرب میں ﴿ وَيْلٌ لَكَ ﴾ کے معنیٰ میں بھی آتا ہے مگر یہ معنیٰ ﴿ أَوْلَىٰ لَكَ ﴾ کا لفظی معنیٰ نہیں ہے۔ لفظی معنیٰ زیادہ لائق، زیادہ حقدار، ہی ہے، کیونکہ ﴿ أَوْلَىٰ ﴾ کے اصلی حرف ''وَ' ل' ی'' ہیں۔'' و'ی' ل'' نہیں بلکہ یہ معنیٰ مرادی ہے اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ موقع محل کے مطابق ﴿ أَوْلَىٰ لَكَ ﴾ کا مبتدا ﴿ الْهَلَاكُ ﴾ یا ﴿ النَّارُ ﴾ محذوف مانا جائے یعنی ہلاکت ہی تیرے زیادہ لائق ہے یا آگ ہی تیرے زیادہ لائق ہے۔

آیت (۳۶) تا (۴۰) فائدہ 1 **مفردات** : ﴿ سُدًى ﴾ وہ اونٹ جو کھلے چھوڑ دیے جائیں انھیں ''إِبِلٌ سُدًى'' کہتے ہیں یعنی کھلا چھوڑا ہوا جس سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ ﴿ يُمْنَىٰ ﴾ أَمْنَىٰ يُمْنِي باب افعال سے مضارع مجہول ہے بمعنیٰ گرایا جاتا ہے، ٹپکایا جاتا ہے۔

فائدہ 2 حشر ونشر کے منکر اس بات کو ناممکن قرار دیتے تھے کہ بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ زندہ ہوں

گی اور ان کا محاسبہ ہوگا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوبارہ زندہ کرکے اس سے حساب لینے کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے پوچھے بغیر ہی رہنے دیا جائے گا؟ نہیں' یہ غلط سوچ ہے، جس قادر مطلق نے پانی جیسی پتلی چیز کی ایک بوند کو رحم مادر میں جمے ہوئے خون میں بدلنے کے بعد گوشت ہڈیاں اور تمام اعضا مکمل کرکے روح پھونک کر مرد یا عورت کی صورت والا زندہ انسان بنا دیا اس کے لیے اسی کی مٹی کو دوبارہ اصل شکل میں لے آنا کیا مشکل ہے؟

اس کے علاوہ اگر انسان اپنے اصل پر غور کرے کہ وہ ایک حقیر قطرہ تھا جو باپ کے ان اعضا سے ماں کے ان اعضا میں گرایا گیا جن کا نام بھی شرم و حیا کی وجہ سے نہیں لیا جاتا ﴿مِنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى﴾ پھر وہاں مختلف مراحل سے گزار کر اس کی مکمل صورت گری کے بعد اسی راستے سے واپس لایا گیا جس کا ذکر ہی موجب حیا ہے، اب کیا انسان کو یہ زیب دیتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سرکشی کرے، اکڑ کر چلے؟ اور یہ سمجھے کہ اسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں؟

رکوعاتہا ۲ (۷٦) سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَدَنِيَّةٌ (۹۸) اٰیاتہا ۳۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱

کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس کا (کہیں) ذکر ہوا ہو۔ ①

سورۃ الدہر کی فضیلت

اس سورت کو سورۃ الانسان، سورۃ الامشاج اور سورۃ ہل اتٰی بھی کہا جاتا ہے۔ (قاسمی)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن صبح کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ الم تنزیل (سجدہ) اور دوسری رکعت میں ﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝﴾ پڑھا کرتے تھے۔ (صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، حدیث : ۲۰۳۱)

تفسیر سورۃ الدہر

آیت ①، ② فائدہ ① ﴿ هَلْ ﴾ ''کیا؟'' پوچھنے کے لیے آتا ہے یہ پوچھنا کبھی تو کوئی خبر معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے ''هَلْ فِي الدَّارِ زَيْدٌ'' کیا گھر میں زید ہے؟ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہی نہیں، کبھی یہ سوال کسی بات کی نفی کے لیے ہوتا ہے، جیسے: ''وَهَلْ يَسْتَطِيْعُ ذٰلِكَ اَحَدٌ'' بھلا یہ کام کوئی کرسکتا ہے؟ یعنی نہیں کرسکتا، عربی میں اسے نفی کے علاوہ جحد بھی کہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ پوچھنا بات منوانے کے لیے ہوتا ہے، اسے عربی میں تقریر کہتے ہیں، جیسے آپ نے کسی کو کچھ دیا ہو یا اس کی عزت کی ہو تو اسے کہیں ''هَلْ اَعْطَيْتُكَ هَلْ اَكْرَمْتُكَ'' کیا میں نے تمھیں دیا؟ کیا میں نے تمھاری عزت کی؟ اس وقت یہ ''هَلْ'' بمعنیٰ ''قَدْ'' ہوتا ہے۔ یقیناً میں نے تمھاری عزت کی۔ اس آیت میں

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۲ ﴾

بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔ ②

”ھَلْ“ اس معنیٰ کے لیے آیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے اس کا ترجمہ ہی ”یقیناً“ یا ”تحقیق“ کیا ہے، لیکن ھَلْ کا معنیٰ اپنے اصل پر ”کیا“ ہو تب بھی مراد یہی ہے کہ یقیناً اس پر ایسا وقت گزرا ہے۔

فائدہ ② بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا، ان کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے خاک ہو جانے کے بعد اسے دوبارہ پیدا کیا جا سکے۔ یہاں ایسے لوگوں کو قائل کرنے کے لیے سوال ہے کہ کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے جب وہ کوئی ایسی چیز ہی نہ تھا جس کا ذکر ہوتا ہو، صاف ظاہر ہے کہ ان کا جواب یہ ہوگا کہ یقیناً انسان پر ایسا وقت گزرا ہے، تو جب اس وقت اللہ تعالیٰ نے اسے بنا لیا، جب یہ کچھ بھی نہ تھا بلکہ کہیں اس کا ذکر بھی نہ تھا تو پیدا کرنے کے بعد دوبارہ وہ کیوں نہیں بنا سکتا؟ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ۝ ﴾ (مریم: ٦٦، ٦٧) ”اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا مجھے زندہ کر کے (قبر سے) نکالا جائے گا؟ کیا اسے یاد نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اسے پیدا کیا جب وہ کوئی چیز ہی نہ تھا۔“

فائدہ ③ انسان سے مراد یہاں صرف آدم علیہ السلام نہیں بلکہ نسل انسانی ہے کیونکہ آئندہ آیت میں انسان کے نطفہ سے پیدا ہونے کا ذکر ہے۔

آیت ② فائدہ ① ﴿ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ﴾ یعنی انسان کی پیدائش صرف مرد یا عورت کے نطفہ سے نہیں ہوئی بلکہ دونوں کے ملے جلے نطفہ سے ہوئی ہے، کیونکہ دونوں کے ملنے سے ہی حمل منعقد ہوتا ہے۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ مَاءَ

﴿اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۝۳﴾

بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، اب خواہ شکر کرنے والا بن جائے یا ناشکرا۔ ③

الرَّجُلِ غَلِیظٌ أَبْیَضُ وَ مَاءُ الْمَرْءَةِ رَقِیقٌ أَصْفَرُ فَمِنْ أَیِّهِمَا عَلَا أَوْ سَبَقَ یَكُوْنُ مِنْهُ الشَّبَهُ (صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب ۳۰ حدیث : ۷۱۰) ''یعنی مرد کا پانی سفید گاڑھا اور عورت کا پانی پتلا زرد ہوتا ہے ان میں سے جو غالب آ جائے یا سبقت کر جائے اسی سے مشابہت ہوتی ہے۔''

فائدہ ② ﴿ نَّبْتَلِیْهِ ﴾ یعنی انسان کو پیدا کرنے کا مقصد اس کی آزمائش ہے کہ اچھے عمل کرتا ہے یا برے؟ جیسے فرمایا: ﴿ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ (الملک:۲) ''یعنی اللہ تعالیٰ نے موت و حیات کو اس لیے پیدا فرمایا تا کہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون عمل میں بہتر ہے۔''

فائدہ ③ (ہم نے اسے سننے والا' دیکھنے والا بنایا) اگرچہ جانور بھی سنتے اور دیکھتے ہیں مگر انھیں سمیع و بصیر نہیں کہا جاتا کیونکہ وہ عقل کی نعمت سے محروم ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو سننے اور دیکھنے کی ایسی قوتیں دی ہیں جن سے وہ اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہے اور بہت دور تک سوچ سکتا ہے گویا دوسرے جانور اس کے مقابل میں بہرے اور اندھے ہیں۔''

آیت ③ فائدہ ① ﴿ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ ﴾ یعنی ہم نے انسان کی آزمائش کرتے ہوئے اسے صرف سمع و بصر اور عقل کی نعمت عطا کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسے صحیح اور غلط راستہ بتانے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ نیکی و بدی کی یہ تمیز اس کی فطرت میں بھی رکھی ہے، جس کی وجہ سے اچھے کام اس کے لیے معروف (جانے پہچانے)، اور برے کام منکر (یعنی نہ پہچانے ہوئے ہیں) اور انبیاء کے ذریعے بھی نیکی و بدی کا راستہ بتایا ہے۔

فائدہ ② ﴿ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴾ سمع و بصر' عقل وفہم' فطرت انسانی اور انبیاء کے ذریعے ملنے والی آسمانی رہنمائی کے بعد انسان کے لیے صحیح راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اب اس کی مرضی ہے کہ اس راستے پر چل کر اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا بن جائے یا وہ راستہ ترک

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَلَٰسِلَا۟ وَأَغْلَٰلًا وَسَعِيرًا ۝ إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝

یقیناً ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ④
بلاشبہ نیک لوگ شراب کا ایسا جام پئیں گے جس میں کافور ملا ہوا ہوگا۔ ⑤

کر کے اس کی نعمتوں کی ناشکری اور کفر کرنے والا بن جائے۔

آیت ④ **مفردات** : ﴿سَلَٰسِلَا۟﴾ **سِلْسِلَةٌ** جمع ہے، زنجیریں۔ ﴿أَغْلَٰلًا﴾ **غُلٌّ** کی جمع ہے، طوق۔

انسان کی پیدائش کی ابتدا اور راہ حق کی طرف اس کی رہنمائی ذکر کرنے کے بعد ہدایت قبول کرنے سے انکار کرنے والوں کا اور نیک لوگوں انجام ذکر فرمایا کہ ہم نے کفار کے لیے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ کفار کے لیے اغلال اور سلاسل کا ذکر سورہ حاقہ آیات: ۳۰ تا ۳۳ میں اور حم المومن آیات: ۶۹ تا ۷۲ میں دیکھیے۔

آیت ⑤ **مفردات** : ﴿ٱلْأَبْرَارَ﴾ **بَارٌّ یا بَرٌّ** کی جمع ہے، نیکی کرنے والے۔ ﴿كَأْسٍ﴾ وہ برتن جس سے پیا جائے۔ عام طور پر کأس کا لفظ اس برتن پر بولتے ہیں جس میں شراب موجود ہو ﴿مِزَاجٌ﴾ آمیزش، ملونی۔ وہ چیز جو لذت یا خوشبو میں اضافے کے لیے مشروب میں ملائی جائے۔ ﴿كَافُورًا﴾ ایک خوشبو دار پودا۔ اس پودے سے نکلنے والی حاصل ہونے والی خوشبو جو تاثیر میں نہایت ٹھنڈی ہوتی ہے۔

فائدہ ② کفار کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا ذکر کرنے کے بعد نیک لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ شراب کے ایسے جام پئیں گے جن میں کافور کی آمیزش ہوگی، یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کی بجائے انھیں ایسی شراب ملے گی جس میں ٹھنڈی تاثیر اور خوشبودار کافور کی آمیزش ہوگی۔ واضح رہے کہ دنیا کے کافور اور جنت کے کافور میں صرف نام کی مشابہت ہے، جیسا کہ دنیا کی شراب اور جنت کی شراب میں صرف نام کی مشابہت ہے کہ جنت کی شراب میں سرور و نشاط

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝

وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے اُس سے شاخیں نکال کر لے جائیں گے۔ ⑥

وغیرہ کی وہ خوبیاں تو ہوں گی جو دنیا کی شراب میں ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوں گی مگر وہ دنیا کی شراب کی خرابیوں مثلاً بد بو، زوال عقل، خمار، اعضاء شکنی وغیرہ سے پاک ہوگی، اسی طرح جنت کے کافور میں وہ ٹھنڈک، لطافت اور خوشبو تو ہوگی جو دنیا کے کافور میں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگی مگر وہ دنیوی کافور کی خرابیوں مثلاً اس کی زہریلی تاثیر اور بو میں ایک ناگوار سے احساس سے پاک ہوگا۔ مزاج کا مطلب یہ ہے کہ ابرار کو ملنے والی شراب میں خوشبو اور لذت کے اضافہ کے لیے کافور کے چشمے سے آمیزش کی جائے گی جس سے اس کی تیزی اور حرارت اعتدال پر آ جائے گی۔

آیت ⑥ **مفردات** : ﴿ عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ اگرچہ سب لوگ ہی اللہ کے بندے ہیں مگر یہاں مراد اللہ کے خاص بندے ہیں، جیسا کہ عبادالرحمٰن ''رحمان کے بندے''، **ناقة اللّٰه** ''اللہ کی اونٹنی، بیت اللہ ''اللہ کا گھر'' میں خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔

یعنی اللہ کے یہ خاص بندے یعنی ابرار کافور کی آمیزش والا شراب کا جو جام پییں گے وہ ایک جام ہی نہیں ہوگا بلکہ کافور کی آمیزش والا ایک چشمہ ہوگا جس سے مومن جہاں چاہے گا شاخ نکال کر لے جائے گا۔

بعض مفسرین نے ابرار اور عباد اللہ کو الگ الگ قرار دے کر یہ معنیٰ کیا ہے کہ ابرار یعنی نیک لوگوں کو پلائے جانے والے جام شراب میں کافور نامی چشمے میں سے کچھ ملاوٹ ہوگی جس طرح جس کے شربت میں کوئی خوشبو دار شربت مثلاً روح افزا ملا دیا جائے۔ جب کہ عباداللہ یعنی اللہ کے مقرب بندوں کو کافور کے چشمے کی صرف آمیزش ہی نہیں بلکہ اس کا خالص پانی جتنا وہ چاہیں گے، ملے گا۔ مجھے پہلا معنیٰ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ﴿٧﴾ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴿٨﴾

جو اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔⑦ اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔⑧

آیت⑦ **مفردات** : ﴿نَذْر﴾ اپنے آپ پر وہ چیز واجب کر لینا جو واجب نہیں ہے۔ ﴿مُسْتَطِيرًا﴾ طَارَ يَطِيرُ۔ اڑنا۔ اِسْتَطَارَ يَسْتَطِيرُ باب استفعال میں الفاظ زیادہ ہونے کی وجہ سے معنیٰ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے یعنی ''بہت زیادہ اڑنے والا' مراد ہے بہت زیادہ پھیلنے والا، جیسے آگ یا صبح کی روشنی خوب پھیل جائے تو کہا جاتا ہے:'' اِسْتَطَارَ الْحَرِيقُ یا اِسْتَطَارَ الْفَجْرُ''

اس آیت میں اور اس کے بعد کی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں کی چند صفات بیان کی گئی ہیں ۔ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں، یعنی جو کام ان پر واجب نہیں جب اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ پر واجب کر لیتے ہیں تو انھیں پورا کرتے ہیں پھر جو کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی واجب ہیں ان پر کتنے اہتمام سے عمل کرتے ہوں گے۔ (نذر کے مسائل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ آیت:۲۷۰ اور سورہ حج آیت:۲۸) ان لوگوں کے نذر پوری کرنے کا باعث یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس سے ان صوفیوں کا رد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ جنت کے طمع یا جہنم کے خوف سے عبادت نہیں کرنی چاہیے۔

آیت⑧ فائدہ① ﴿عَلَىٰ حُبِّهِ﴾ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں اور دونوں درست ہیں، ایک یہ کہ خود کھانے کی خواہش و ضرورت کے باوجود وہ دوسرے مستحقین کو کھلا دیتے ہیں، دوسرا یہ کہ اللہ کی محبت کی وجہ سے ان لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ یہاں پہلا معنیٰ زیادہ موزوں ہے

کیونکہ دوسرا معنیٰ تو ﴿ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ﴾ ”ہم تو تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں“ میں آ ہی رہا ہے۔ تکرار سے بہتر ہے کہ الگ الگ مفہوم مراد لیا جائے۔ ﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (الحشر:۹) ”یعنی وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی میں ہوں۔

فائدہ 2 مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلانا ان اہم ترین مواقع میں سے ہے جہاں صدقہ کرنے کا حق ہے، کیونکہ مسکین وہ ہے جس کی کمائی سے اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، یتیم اس سے بھی عاجز ہے کیونکہ اس کا کمانے والا فوت ہو چکا ہے اور وہ کم عمر ہونے کی وجہ سے کمائی نہیں کر سکتا اور قیدی ان سب سے زیادہ عاجز ہے کیونکہ اسے کسی چیز کا اختیار ہی نہیں، وہ کلیۃً دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔

فائدہ 3 زمانہ جاہلیت میں اسیروں سے بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ انھیں بیڑیاں لگا کر ہر روز نکالا جاتا تاکہ وہ گدائی کے ذریعے اپنی ضرورت کی چیزیں لوگوں سے حاصل کریں، اللہ تعالیٰ نے اسیروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا اور ابرار کی صفت بیان فرمائی کہ وہ خود ضرورت مند ہونے کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابہ کو تاکید فرمائی کہ ان کا اکرام کریں، چنانچہ وہ کھانے کے وقت انھیں اپنے آپ پر مقدم رکھتے۔ (ابن کثیر)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اسیر کافر لوگ ہی تھے جو جنگ میں گرفتار ہو کر آتے تھے۔ آپ کے زمانے میں مسلمان اسیر نہیں رکھے جاتے تھے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے کوئی مشرک اسیر ہو یا کسی جرم یا مطالبہ میں گرفتار مسلم اسیر، سب سے حسن سلوک لازم ہے بلکہ مسلمان اسیروں سے احسان بالاولیٰ لازم ہے۔ اس کے علاوہ غلام بھی اسیر میں شامل ہے رسول اللہ ﷺ نے آخری وصیت میں فرمایا: «اَلصَّلَاةَ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ» ”نماز

اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا ۝۹

(اور کہتے ہیں) ہم تو صرف اللہ کی رضا کے لیے تمھیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ⑨

اور اپنے غلاموں کا خیال رکھنا۔“

فائدہ ④ اس آیت کی شان نزول میں علی و فاطمہ اور ان کی لونڈی فضّہ رضی اللہ عنہم کے حسنین کی صحت کے لیے تین روزوں کی نذر ماننے اور افطار کے وقت قرض لائے ہوئے جو سے تیار کردہ پانچ روٹیاں سب کی سب ایک دن مسکین، دوسرے دن یتیم اور تیسرے دن اسیر کو دے دینے کی جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ بالکل من گھڑت اور موضوع ہے۔ ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے اور قرطبی نے تفصیل سے اس پر جرح کی ہے۔ اہل بیت نبوت کے فضائل کا ثبوت اس قسم کی موضوع روایات کا محتاج نہیں۔ نہ یہ کوئی نیکی ہے کہ مسکین کو ایک کی بجائے پانچوں روٹیاں دے دی جائیں اور تین دن رات بچوں کو بھوکا رکھا جائے۔

فائدہ ⑤ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یتیموں، مسکینوں اور اسیروں کو کھانا کھلانے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے خواہ وہ مسلم ہوں یا مشرک۔ ہاں فرض زکاۃ صرف مسلمانوں پر خرچ ہوگی ((تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ فِي فُقَرَائِهِمْ)) ”صدقہ مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء پر خرچ کیا جائے گا۔“

آیت ⑨ ﴿ شُكُوۡرًا ﴾ مصدر ہے، بر وزن دخول و خروج، یعنی وہ کھانا کھلاتے ہوئے یہ بات دل میں کہتے ہیں یا زبان سے انھیں اطمینان دلانے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلا رہے ہیں تم سے نہ یہ خواہش ہے کہ تم اس کا بدلہ دو اور ہمارے کسی کام آؤ، نہ یہ کہ ہمارا شکریہ ادا کرو اور لوگوں کے سامنے ہماری سخاوت کا ذکر کرو تاکہ وہ اپنے آپ پر احسان کا بوجھ محسوس نہ کریں۔

إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿۱۰﴾ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿۱۱﴾

یقیناً ہم اپنے رب سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت منہ بنانے والا، سخت تیوری چڑھانے والا ہوگا۔ ⑩ پس اللہ نے انھیں اس دن کی مصیبت سے بچا لیا اور انھیں ایک تازگی اور خوشی عطا فرمائی۔ ⑪

آیت ⑩ ﴿عَبُوسًا﴾ تیوری چڑھانے والا ٗمنہ بنانے والا۔ ﴿قَمْطَرِيرًا﴾ سخت تیوری چڑھانے والا۔

فائدہ ① سوال یہ ہے کہ اس دن کو عبوس اور قمطریر کیوں کہا گیا، جبکہ تیوری چڑھانا اور منہ بگاڑنا آدمی کا کام ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس دن کی ہیبت اور سختی کی منظر کشی کے لیے اسے ایک ایسے شخص کی صورت میں پیش کیا ہے جس کے منہ اور ماتھے پر غصے کی وجہ سے سخت تیوری چڑھی ہوئی ہو، دوسرا یہ کہ جس طرح «نَهَارُهُ صَائِمٌ» (اس کا دن روزہ دار ہے) «وَلَيْلُهُ قَائِمٌ» (اس کی رات قیام کرنے والی ہے) میں صیام وقیام کی نسبت دن اور رات کی طرف کر دی ہے، حالانکہ روزہ رکھنا اور قیام کرنا آدمی کا کام ہے۔ اسی طرح یہاں بھی اگرچہ دن کو تیوری چڑھانے والا کہا ہے مگر مراد یہ ہے کہ اس دن میں کافر کا چہرہ سخت تیوری والا اور بگڑا ہوا ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ﴾ ”کئی چہرے اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے۔“ (القیامۃ: ۲۴)

فائدہ ② ہمیں اپنے رب سے اس دن کا خوف ہے جو نہایت سخت ہوگا۔ اس میں ان جاہل صوفیوں کا رد ہے جو قیامت یا جہنم کے خوف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اخلاص کے خلاف سمجھتے ہیں۔

آیت ⑪ اللہ تعالیٰ اخلاص اور خوف کے ساتھ مذکورہ اعمال کرنے والے ابرار کو اس دن کی برائی سے بچالے گا اور انھیں تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا۔ تازگی چہرے کی اور خوشی دل کی۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ۙ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَاۗىِٕكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ۚ

اور انھیں ان کے صبر کرنے کے عوض جنت اور ریشمی لباس کا بدلہ عطا فرمایا۔⑫ وہ اس میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، نہ اس میں سخت دھوپ دیکھیں گے اور نہ سخت سردی۔⑬

دل میں خوشی ہو تو چہرے پر تازگی آجاتی ہے۔(دیکھیے سورہ عبس آیت: ۳۸،۳۹) ان کے برعکس کفار و فجار کے چہرے بگڑے ہوئے اور دل غم و فکر سے بھرے ہوں گے۔(دیکھیے سورۃ عبس: ۴۰ تا ۴۲)

آیت⑫ اور انھیں ان کے صبر کے عوض جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے گا۔صبر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر صبر' اس کی حرام کردہ چیزوں سے صبر' اس کے دین کی دعوت پر صبر' آزمائشوں اور تکلیفوں پر صبر خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانے پر صبر، غرض مومن کی زندگی از اول تا آخر صبر ہی صبر ہے۔

آیت⑬ ﴿ شَمْسًا ﴾ سے مراد سخت دھوپ اور گرمی اور زمہریر سے مراد سخت سردی ہے، یعنی جنت کا موسم نہایت خوش گوار اور معتدل ہوگا اس میں نہ تکلیف دہ گرمی ہو گی نہ سردی، اس کے برعکس جہنم میں شدید گرمی یعنی آگ کا عذاب بھی ہوگا اور شدید سردی (زمہریر) کا بھی، بلکہ دنیا میں شدید گرمی اور شدید سردی کا اصل بھی جہنم ہی سے ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آگ نے اپنے رب کے پاس شکایت کی اور کہا: اے رب! میرے بعض حصے بعض کو کھا گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس نکالنے کی اجازت دے دی، ایک سانس گرمی میں اور ایک سردی میں، یہ وہی ہے جو تم سخت گرمی محسوس کرتے ہو اور جو تم سخت زمہریر (سردی) محسوس کرتے ہو۔(صحیح بخاری، باب مواقیت الصلاۃ حدیث:۵۳۷)

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿۱۴﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۟ ﴿۱۵﴾ قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾

اور اس کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے خوشے خوب جھکا کر ان کے تابع کردیے جائیں گے۔⑭ اور ان پر چاندی کے برتن اور آبخورے پھرائے جائیں گے، جو شیشے کے ہوں گے۔⑮ ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہوگا، بنانے والوں نے انھیں خوب اندازے سے بنایا ہوگا۔⑯

آیت ⑭ ﴿دَانِيَةً﴾۔ دَنَا يَدْنُوْ۔(نصر) سے اسم فاعل ہے، قریب۔ ذُلِّلَتْ تابع کیے جائیں گے، جھکا دیے جائیں گے۔ تَذْلِيلًا تاکید ہے، خوب جھکانا۔ قُطُوْف قِطْف کی جمع ہے، خوشہ، چُنا ہوا پھل یعنی جنت کے درختوں کے سائے نہایت گھنے اور جھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے پھلوں کے خوشے جنتیوں کے تابع اور ان کی دسترس میں ہوں گے۔ کھڑے، بیٹھے، لیٹے جس طرح چاہیں گے توڑ سکیں گے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں سوار سو برس تک چلتا رہے گا مگر اسے طے نہیں کر سکے گا۔“ (صحیح بخاری کتاب بدء الخلق حدیث:۳۲۵۱)

آیت⑮، ⑯ ﴿آنِيَةٌ إِنَاءٌ کی جمع ہے، بروزن أَفْعِلَةٌ ﴿أَكْوَابٍ﴾ كُوْبٌ کی جمع ہے، برتن جس کی نہ ٹونٹی ہو نہ دستی۔ آبخورے۔

یعنی ان کی مجلس میں چاندی کے ایسے برتنوں اور آبخوروں کا دور چلے گا جو شیشے کے ہوں گے۔ ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہوگا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایسے برتنوں کا دنیا میں کہیں وجود نہیں کیونکہ دنیا کی چاندی کو کوٹ کر مچھر کے پر کے برابر باریک کر دیا جائے تب بھی وہ شیشے کی طرح شفاف نہیں ہوگی۔ برتنوں کی یہ قسم جنت ہی میں ہوگی جو چاندی کی طرح سفید اور شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ ﴿قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا﴾ یعنی پینے والوں کی ضرورت کے عین اندازے کے مطابق بنے ہوئے ہوں گے نہ کم نہ زیادہ۔

وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾

اور اس میں انھیں شراب کا ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہوگی۔ ⑰ وہ جنت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل رکھا جاتا ہے۔ ⑱

آیت ⑰، ⑱ ﴿ كَاْسًا ﴾ پیالہ جس میں شراب ہو، خالی پیالے کو کاس نہیں کہتے۔ ﴿ مِزَاجُ ﴾ آمیزش، ملونی۔ وہ چیز جو لذت یا خوشبو میں اضافے کے لیے ملائی جائے ﴿ زَنْجَبِيْلًا ﴾ ادرک، سونٹھ۔ ﴿ سَلْسَبِيْلًا ﴾ (۱) آسانی سے حلق میں اتر جانے والا۔ (۲) تیزی سے بہنے والا۔ (۳) آسانی سے تابع ہونے والا کہ جدھر لے جانا چاہیں لے جائیں۔

عرب لوگ شراب کی لذت، حرارت، تلخی اور خوشبو میں اضافے کے لیے اس میں سونٹھ کی آمیزش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنتیوں کو جو جامِ شراب پلایا جائے گا۔ اس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی، گویا جنت میں ایک وہ شراب ہوگی جو ٹھنڈی ہوگی جس میں کافور کی آمیزش ہوگی ایک گرم ہوگی جس میں سونٹھ ملی ہوگی۔ واضح رہے کہ جنت کی نعمتوں کے ذکر کے وقت دنیا کی جن چیزوں کا ذکر آیا ہے ان سے بعینہ وہی چیزیں مراد نہیں بلکہ ان سے بے حد و حساب اعلیٰ چیزیں مراد ہیں جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ «لَيْسَ فِي الدُّنْيَا شَيْءٌ مِمَّا فِي الْجَنَّةِ إِلَّا الْأَسْمَاءُ» (قرطبی) دنیا میں جنت کی چیزوں میں سے ناموں کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔

صاحب احسن التفاسیر لکھتے ہیں: ''اگرچہ جنت میں کھانے پینے، پہننے برتنے کی جتنی چیزیں ہیں ان کے فقط نام دنیا کی چیزوں سے ملتے ہیں، لیکن جنت کی چیزوں اور دنیا کی چیزوں میں بڑا فرق ہے مثلاً دنیا میں ایسا دودھ کہاں ہے؟ جس کی ہمیشہ نہر بہتی ہو اور پھر دوسرے دن ہی وہ کھٹا نہ ہو جائے، وہ شہد کہاں ہے؟ جس کی نہر بہتی ہو اور مکھیوں کی بھنکار اس میں جم جم کر نہ مرے اور ہوا سے خاک اور کوڑا کرکٹ اس پر نہ پڑے، وہ شراب کہاں ہے؟ جس کی نہر ہو اور بدبو کے سبب سے اس نہر کے آس پاس کا راستہ کچھ دنوں میں بند نہ ہو جائے۔ انتہی

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿١٩﴾

اور ان کے ارد گرد لڑکے پھر رہے ہوں گے، جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ جب تو انھیں دیکھے گا تو انھیں بکھرے ہوئے موتی گمان کرے گا۔ ⑲

﴿ عَيْنًا ﴾ یہ كَأْسًا سے بدل ہے یا منصوب بہ نزع الخافض، یعنی يُسْقَوْنَ كَأْسًا مِنْ عَيْنٍ مطلب یہ کہ انھیں وہ جام شراب جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی، ایسے چشمے سے پلایا جائے گا جس کا نام سلسبیل ہے۔ یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا پانی نہایت خوش گوار رقیق اور آسانی سے حلق سے اترنے والا ہوگا، اس چشمے سے نکلنے والی نالیاں نہایت تیز رفتار اور اہل ایمان کے لیے نہایت تابع ہوں گی کہ وہ جدھر چاہیں گے، انھیں لے جائیں گے۔

آیت ⑲ فائدہ ① یعنی جنتیوں کی مجلس میں خدمت کے لیے ایسے لڑکے گردش کرتے رہیں گے جن میں دو وصف نمایاں ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے کیونکہ خدمت کے لیے بڑی عمر کے آدمی کی بجائے بچے زیادہ مستعد اور موزوں ہوتے ہیں اور انھیں خدمت کے لیے کوئی کام کہنے میں حجاب نہیں ہوتا۔

دوسرا یہ کہ وہ اتنے خوبصورت ہوں گے کہ جب تم انھیں آتے جاتے دیکھو گے تو گمان کرو گے کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ ان کی خدمت کے لیے ہر طرف پھیلے ہوئے ہونے کو موتیوں کے بکھرنے سے تشبیہ دی ہے۔

یہ لڑکے کوئی الگ مخلوق ہوگی، جو اللہ تعالیٰ اہل جنت کی خدمت کے لیے پیدا فرمائے گا یا جنتیوں کے اپنے لڑکے ہوں گے؟ اگرچہ پہلی بات بھی ممکن ہے مگر سورۂ طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتیوں کے اپنے ہی ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴾ (الطور: ۲۷) ”اور ان پر پھریں گے ان کے لڑکے گویا وہ چھپائے ہوئے موتی ہیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکے ان کے اپنے ہی بچے ہوں گے جو دنیا میں فوت ہو

وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝

اور جب تو وہاں دیکھے گا تو نعمت ہی نعمت اور بہت بڑی بادشاہی دیکھے گا۔ ⑳

گئے یا جنت میں اگر کسی کو اولاد کی خواہش ہوئی، جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے تو انھیں عطا کیے جائیں گے۔ یہ بچے خدمت کے لیے ان کے اردگرد پھریں گے اور ان کے لیے مزید راحت و مسرت کا باعث ہوں گے۔ واللہ اعلم

فائدہ ② عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے آخر میں جہنم سے نکل کر جنت میں جانے والے شخص کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہیں گے کہ تمھیں دنیا اور دنیا کے دس گنا کے برابر دیا جاتا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب آخر اھل النار خروجاً) ''جب آخری جنت کے ملک کا یہ حال ہے تو دوسروں کے عظیم الشان ملک کا کہنا ہی کیا ہے۔''

آیت ⑳ فائدہ ① اور نعمت کا حال کیا ہوگا؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلے گروہ کے لوگ جو جنت میں داخل ہوں گے، چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے، ان کے بعد جو لوگ جائیں گے وہ سب سے زیادہ روشن ستارے کی طرح چمک رہے ہوں گے۔ ان کے دل ایک ہی آدمی کے دل کی طرح ہوں گے ان میں نہ کوئی اختلاف ہوگا اور نہ بغض۔ ان میں ہر ایک آدمی کی دو بیویاں ہوں گی۔ حسن کی وجہ سے ان کی پنڈلی کا مغز گوشت کے پیچھے سے دکھائی دے گا۔ وہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کریں گے۔ نہ بیمار ہوں گے، نہ ناک سنکیں گے اور نہ تھوکیں گے۔ ان کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے ان کی کنگھیاں سونے کی۔ ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن ﴿اَلُوَّۃ﴾ (ایک خوشبودار لکڑی) ہوگی اور ان کا پسینا کستوری ہوگا۔ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة، حدیث: ۳۲۴۵، ۳۲۴۶)

پھر دوستوں کی ملاقاتیں، فرشتوں کی آمد و رفت، سلام اور اللہ تعالیٰ کا اہل جنت سے ہم کلام ہونا، سلام کہنا اور دیدار عطا فرمانا مزید نعمتیں ہیں، الغرض جنت میں وہ نعمتیں ہیں جو نہ کسی

﴿ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴾۝۲۱

ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز کپڑے اور گاڑھا ریشم ہوں گے اور انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب انھیں پاک شراب پلائے گا۔ ۲۱

آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی بشر کے دل میں ان کا خیال آیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے اہل جنت میں شامل فرمائے، آمین!

آیت ۲۱ **مفردات** : ﴿ سُنْدُسٍ ﴾ باریک ریشم۔ ﴿ اِسْتَبْرَقٌ ﴾ گاڑھا ریشم۔

﴿ حُلُّوْٓا ﴾ حِلْيَةٌ سے فُعِّلُوْا کے وزن پر ہے، اصل میں حُلِّيُوْا تھا، زیور پہنائے جائیں گے۔ ﴿ اَسَاوِرَ ﴾ سِوَارٌ کی جمع، کنگن۔ ﴿ شَرَابًا ﴾ مشروب، پینے کی چیز ﴿ طَهُوْرًا ﴾ جو پاک ہو اور پاک کرنے والی ہو، جس طرح فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴾ (الفرقان: ۴۸) ''اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا۔

فائدہ ① ﴿ عٰلِيَهُمْ ﴾ ان کے اوپر، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ جن نشستوں پر بیٹھے ہوں گے ان کے اوپر باریک سبز ریشم اور گاڑھے ریشم کے پردے لٹک رہے ہوں گے، جب پردے اتنے قیمتی ہوں گے تو ان کے لباس کا کیا کہنا، دوسرا یہ کہ انھوں نے باریک سبز ریشم اور گاڑھے ریشم کا لباس پہن رکھا ہوگا، جیسا کہ سورۃ الکہف: ۳۱ میں فرمایا: ﴿ وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ ﴾ کہ وہ باریک اور گاڑھے سبز ریشم کے کپڑے پہنیں گے، یہ معنیٰ زیادہ درست ہے، کیونکہ سورہ کہف کی آیات سے اس کی تائید ہو رہی ہے اور انس بن مالک، مجاہد اور قتادہ کی قراءت میں ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ ہے۔ (زاد المسیر لابن الجوزی) اس سے بھی دوسرے معنیٰ کی تائید ہوتی ہے، اگرچہ پہلا معنیٰ بھی غلط نہیں۔

فائدہ ② سورہ کہف میں فرمایا: ﴿ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ ﴾ ''کہ انھیں سونے

کے کنگن پہنائے جائیں گے، یہاں چاندی کے کنگن پہنائے جانے کا ذکر ہے۔ دونوں میں تطبیق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کئی جنتیں ہیں، جیسا کہ سورۃ الرحمان میں الگ الگ دو دو جنتوں کا ذکر ہے اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((جَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ آنِيَتُهُمَا وَ مَا فِيهِمَا وَ جَنَّتَانِ مِنْ فِضَّةٍ آنِيَتُهُمَا وَ مَا فِيهِمَا)) (صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث:٧٤٤٤) ”یعنی دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے سونے کا ہے اور دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے چاندی کا ہے“ اب جنتی کی مرضی ہے کہ سونے کے کنگن پہنے یا چاندی کے یا دونوں پہن لے اور بعض اہل علم نے فرمایا کہ شاید اہل جنت کی درجات کے لحاظ سے سونے کے کنگن مقربین کے لیے اور چاندی کے اصحاب الیمین کے لیے ہوں گے۔ (التسهيل) مگر یہ بات جزم سے نہیں کہی جا سکتی اس لیے پہلی بات ہی زیادہ درست ہے۔

فائدہ ③ یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کنگن وغیرہ عام طور پر عورتیں پہنتی ہیں جنت میں مردوں کو کنگن پہنانے کا کیا مقصد ہے؟ جواب یہ ہے کہ ریشمی لباس اور سونے چاندی کے کنگنوں سے مراد اہل جنت کے شاہانہ شان وشوکت بیان کرنا ہے، دنیا میں قدیم زمانے سے بادشاہ سونے چاندی کے کنگن پہنتے رہے ہیں جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر طعن کیا تھا کہ ﴿ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ ﴾ (الزخرف:٥٣) ”اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے؟“

فائدہ ④ ﴿ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴾ آیت کے اس ٹکڑے میں جنتیوں کے لیے کئی بشارتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انھیں ان کا رب خود شراب طہور پلائے گا۔ اس سے بڑی عزت افزائی کیا ہوسکتی ہے؟ دوسری یہ کہ وہ مشروب دنیا کے تمام سرور آور مشروبات کی ظاہری و باطنی نجاستوں سے اور ہر قسم کی خرابیوں سے پاک ہوگا، نہ اس میں نشہ ہوگا نہ دردسر، نہ متلی نہ قے، نہ اعضا شکنی نہ زوال عقل، وہ سراسر لذت وسرور ہوگا۔ تیسری یہ کہ طہور کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے پینے سے اہل جنت کے دل پاک ہو جائیں گے۔ ان سے حسد،

إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ
تَنزِيلًا ﴿٢٣﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴿٢٤﴾

بلاشبہ یہ تمھارے لیے بدلہ ہے اور تمھاری کوشش قدر کی ہوئی ہے۔ ﴿۲۲﴾ اے نبی! یقیناً ہم نے ہی یہ قرآن تجھ پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ ﴿۲۳﴾ پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور ان میں سے کسی گناہ گار یا ناشکرے کا کہنا مت مان۔ ﴿۲۴﴾

بغض اور تمام کدورتیں دور ہو جائیں گی۔

آیت ﴿۲۲﴾ ''یہ سب کچھ تمھارے اعمال کا بدلہ ہے اور تمھاری کوشش قدر کی ہوئی ہے'' یہ بات جنتیوں سے کہی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں تھوڑی سی عمر کے اعمال کے بدلہ میں ابدالآباد کی یہ نعمتیں عطا فرمائے گا۔ اس سے بڑھ کر قدر دانی کیا ہوسکتی ہے؟

آیت ﴿۲۳﴾ ﴿إِنَّا نَحْنُ ..... الخ﴾ سورہ کے شروع سے یہاں تک کفار و ابرار کے انجام کا ذکر فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو کفار کے اعتراضات کے جواب میں تسلی دی جا رہی ہے اور صبر و استقامت اور ذکر و تسبیح و سجود کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کفار رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کے لیے کہا کرتے تھے کہ آپ قرآن مجید اپنے پاس ہی سے بنا کر سناتے رہتے ہیں ورنہ یہ اکٹھا ہی کیوں نازل نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر اس کا جواب مذکور ہے، مثلاً دیکھیے الفرقان:۳۲ مگر یہاں نہایت زور دار لہجے میں فرمایا کہ یقیناً ہم ہی نے یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے آپ پر نازل کیا ہے، یعنی ہمارے علاوہ کوئی ایسا کلام بنا ہی نہیں سکتا، ورنہ تم سب مل کر ایک سورہ ہی بنا کر دکھا دو اور ہم ہی جانتے ہیں کہ حکمت کا تقاضا اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ہے۔ اس لیے آپ ان کے اعتراضات کی پروا نہ کریں۔

آیت ﴿۲۴﴾ یعنی وہ وقت آ رہا ہے جب آپ کا رب حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے گا آپ اس وقت کا انتظار کرتے ہوئے صبر کریں، یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ آپ جہاد کے لیے اپنے رب کا حکم آنے تک صبر کریں، یعنی خود بھی اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے رہیں، لوگوں کو بھی اسلام کی دعوت دیتے رہیں اور اس راہ میں آنے والی ہر آزمائش پر بھی صبر کریں

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٢٥﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿٢٦﴾
اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿٢٧﴾

اور اپنے رب کا نام صبح اور پچھلے پہر یاد کیا کر۔ ﴿۲۵﴾ اور رات کے کچھ حصہ میں بھی اس کے لیے سجدہ کر اور لمبی رات تک اس کی تسبیح کیا کر۔ ﴿۲۶﴾ یقیناً یہ لوگ جلد ملنے والی چیز سے محبت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ ﴿۲۷﴾

اور اس سے روکنے والے کسی شخص کے کہنے پر خواہ وہ کوئی گنہگار یعنی بدعمل ہو یا ناشکرا یعنی بد عقیدہ ہوں نہ اپنا عمل چھوڑیں نہ عقیدہ نہ اس کی دعوت۔

آیت ﴿۲۵﴾، ﴿۲۶﴾ دعوت کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرنے کے لیے قرآن مجید اللہ کے ذکر، صلاۃ اور تسبیح کا حکم دیتا ہے، کیونکہ انہی چیزوں سے انسان ثابت قدم اور حوصلہ مند رہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (البقرہ:٤٥) ''اور نماز اور صبر کے ساتھ مدد طلب کرو۔'' اور سورہ مزمل میں کلام الٰہی کی بھاری ذمہ داری اٹھانے کی استعداد کے لیے تہجد اور ذکر کا حکم دیا۔ یہاں بھی قرآن کی دعوت و تبلیغ کے راستے میں صبر کی تلقین کے ساتھ حکم دیا کہ صبح اور پچھلے پہر اپنے رب کا نام یاد کر اور رات کے کچھ حصے میں بھی اس کے لیے سجدہ کر۔ ذکر کی اعلیٰ ترین صورت نماز ہے۔ اوقات کی تعیین کے ساتھ ذکر کے حکم سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا بھی حکم دیا جا رہا ہے، چنانچہ ((بكرة)) میں صبح کی نماز اور ((اصيلا)) میں ظہر و عصر کی نمازیں اور رات کے کچھ حصے میں مغرب و عشاء کی نمازیں آجاتی ہیں اور ﴿ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴾ سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ یہ پانچوں نمازیں اگرچہ ان رکعات و متعین اوقات کے ساتھ معراج کی رات فرض ہوئیں، مگر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ذکر و صلاۃ کے اوقات یہی تھے۔

آیت ﴿۲۷﴾ اس آیت میں کفار و فجار کے کفر و فسوق کا اصل سبب بیان فرمایا کہ ان کے نصیحت قبول نہ کرنے کا سبب حب دنیا ہے، دنیا چونکہ جلد ہاتھ آنے والی چیز ہے، اس لیے یہ اسی کو چاہتے ہیں اور قیامت کے بھاری دن سے غافل ہیں، بلکہ اس کے آنے کا یقین ہی نہیں

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ ۚ وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَاۤ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا۝۲۸ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۝۲۹ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝۳۰

ہم ہی نے انھیں پیدا کیا اور ان (کے اعضا) کا بندھن مضبوط باندھا اور ہم جب چاہیں گے ان کو بدل کر ان جیسے اور لوگ لے آئیں گے۔ ۲۸ یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کر لے۔ ۲۹ اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ ہمیشہ سے خوب علم والا ، بہت حکمت والا ہے۔ ۳۰

رکھتے۔ سمجھتے ہیں کہ جب مرنے کے بعد گل سڑ گئے تو کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ آگے اس کا جواب ہے۔

آیت ۲۸ ﴿ اَسْرَهُمْ ﴾ **اَسْرٌ** کا معنی باندھنا ہے، اسیر بھی اس سے نکلا ہے، یعنی ہم نے ان کے اعضا کا بندھن مضبوطی سے باندھا ہے، ہڈیوں پٹھوں کے جوڑ نہایت مضبوط بنائے ہیں یعنی یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو عقل کے خلاف سمجھتے ہیں، اتنا نہیں سوچتے کہ ہم نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، ان کے نرم و نازک رگ و ریشے، گوشت پوست، جوڑوں اور ہڈیوں کو مضبوطی سے باندھ دیا تو ہم دوبارہ انھیں کیوں زندہ نہیں کر سکتے؟ ہم تو جب چاہیں انھیں ختم کر کے ان کی جگہ ان جیسے اور لوگ لا سکتے ہیں تو ان کا بنانا ہمیں کیا مشکل ہے؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴾ (النساء: ۱۳۳) ”اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور دوسرے لوگوں کو لے آئے اور اللہ تعالیٰ اس پر خوب قدرت رکھنے والا ہے۔“ (نیز دیکھیے سورہ ابراہیم آیت: ۱۹، ۲۰)

آیت ۲۹ یعنی یہ سورہ یا قرآن مجید نصیحت ہے، اس سے صحیح راستہ واضح ہو گیا، کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا، اب جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔

آیت ۳۰ مگر تمھارا چاہنا اللہ کے چاہنے کے تابع ہے، وہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

﴿ يُّدۡخِلُ مَنۡ يَّشَآءُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمِيۡنَ اَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴾

جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۳۱

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تقدیر کے منکروں کو اسی آیت سے لاجواب کیا تھا، خوارج کا ایک گروہ ان کے پاس آیا اور تقدیر کے انکار کی دلیل کے طور پر اسی سورت کی ابتدا میں سے آیت پڑھی: ﴿ اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ﴾ ”یعنی ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا ہے، اب چاہے تو شکر کرنے والا بن جائے، چاہے تو کفر کرنے والا۔“ عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا آگے پڑھتے جاؤ آخر میں یہ آیت آئی تو فرمایا بے شک انسان جو راستہ چاہے اختیار کرے مگر یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زبردست ہو کر کوئی شخص نہ نیک بن سکتا ہے نہ بد۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت اندھی مشیت نہیں ہے، بلکہ وہ علیم و حکیم ہے اور اس کی مشیت اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ انھی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے علم و حکمت کے مطابق اس کے اہل ہیں۔

آیت ۳۱ ”وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو ہدایت کیوں نہیں دی؟ فرمایا، ہدایت و رحمت کا مالک اللہ ہے، مالک اپنی چیز جسے چاہے دے، جسے چاہے نہ دے کوئی اسے پوچھ نہیں سکتا: ﴿ لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـَٔلُوۡنَ ﴾ (الانبیاء: ۲۳) اس سے اس چیز کے متعلق پوچھا نہیں جاتا جو وہ کرتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔ ﴿ وَالظّٰلِمِيۡنَ اَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴾ یعنی اس نے ظالموں کے لیے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔ یہاں ظالموں سے مراد مشرک ہیں کیونکہ سب سے بڑے ظالم وہی ہیں: ﴿ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴾ معلوم ہوا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے محروم انھی کو رکھتا ہے جو ظالم ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا ۙ وَّيَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِيۡنَ ۙ ﴾ (البقرۃ: ۲۶) ”وہ اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے

اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو۔‘‘

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی اپنی رحمت میں داخل فرمالے اور عذاب الیم سے محفوظ رکھے۔ آمین!

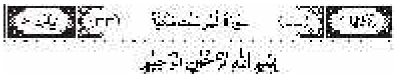

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

تفسیر سورۃ المرسلات

اس سورہ کی ابتدا میں چند قسموں کے بعد فرمایا: ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، یقیناً وہ ہو کر رہنے والی ہے'' یعنی یہ قسمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے ذکر کی گئی ہیں کہ قیامت برحق ہے۔

ان آیات میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان کا ذکر نام لے کر نہیں کیا گیا، بلکہ صرف ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ صفات کئی چیزوں میں پائی جاتی ہیں اس لیے مفسرین نے مختلف چیزیں ان کا مصداق قرار دی ہیں۔ اکثر مفسرین نے ان کا مصداق ہواؤں کو قرار دیا ہے بعض نے ان کا مصداق فرشتے قرار دیے ہیں۔ بعض نے پہلی چار صفات ہواؤں کی اور آخری صفت: ﴿فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا..... الخ﴾ فرشتوں کی بیان کی ہے، مگر کلام کے تسلسل کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ تمام صفات ایک چیز کی ہونی چاہییں اور زیادہ واضح یہی ہے کہ ان سے مراد ہوائیں ہیں، کیونکہ ان آیات میں جو صفات مذکور ہوئی ہیں قرآن مجید کے مختلف مقامات پر وہ ہواؤں کی صفات بیان ہوئی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ﴾ (الروم:۴۸)

''اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پھر وہ اسے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور اسے کئی ٹکڑے بنا دیتا ہے تو تم بارش کے

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝

قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو جانے پہچانے معمول کے مطابق چھوڑی جاتی ہیں! ① پھر جو تند ہو کر تیز چلنے والی ہیں! ② پھر جو (بادلوں کو اٹھا کر) خوب پھیلا دینے والی ہیں! ③ پھر جو (انھیں) پھاڑ کر جدا جدا کر دینے والی ہیں! ④ پھر جو (دلوں میں) یاد (الٰہی) ڈالنے والی ہیں! ⑤ عذر کے لیے یا ڈرانے کے لیے۔ ⑥ یقیناً تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ ہو کر رہنے والی ہے۔ ⑦

قطرے اس کے درمیان سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہو۔''

اور فرمایا: ﴿ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾ (الانبیاء: ۸۱) ''اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز و تند ہوا تابع کر دی اور وہ اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت کر دی۔''

علاوہ ازیں قیامت کے ثبوت کے لیے فرشتوں کے اوصاف پیش کرنے کی بجائے جو نظر ہی نہیں آتے ایسی چیز پیش کرنا زیادہ مناسب ہے جو ہر شخص کو نظر آتی ہے۔

آیت ① تا ⑦ ﴿ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴾ یہ الریاح کی صفت ہے، جو محذوف ہے۔ ﴿ اَلْمُرْسَلٰتِ ﴾ وہ ہوائیں جو چھوڑی گئی ہیں، بھیجی گئی ہیں۔ ﴿ عُرْفًا ﴾ یہ نُكْرٌ کی ضد ہے۔ جانی پہچانی چیز، بھلائی۔ گھوڑے کی گردن کے بالوں اور مرغ کی کلغی کو بھی عرف کہتے ہیں، یہ دونوں چیزیں ایک سطر میں یکے بعد دیگرے ہوتی ہیں، اس لیے ان کی مشابہت سے پے در پے آنے والی چیزوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً جَاءُوْا عُرْفًا وَاحِدًا ''وہ سب پے در پے آ گئے۔''

عرفاً کا معنیٰ اگر جانی پہچانی چیز کریں تو اس سے پہلے با مقدر ہو گی 'اَيْ وَالْمُرْسَلَاتِ بِالْعُرْفِ' یعنی ان ہواؤں کی قسم جو جانے پہچانے معمول کے مطابق چھوڑی جاتی ہیں؟

اگراس کا معنیٰ بھلائی کریں تو اس سے پہلے لام مقدر ہو گا اور یہ مفعول لہٗ ہو گا۔ آیٰ وَالْمُرْسَلَاتِ لِلْعُرْفِ یعنی ان ہواؤں کی قسم! جنھیں (لوگوں کی) بھلائی کے لیے چھوڑ اجاتا ہے! اور اگر پے در پے کریں تو عُرْفًا حال ہو گا، یعنی ان ہواؤں کی قسم! جو پے در پے چھوڑی جاتی ہیں! تینوں معنے درست ہیں۔

قرآن مجید میں مذکور قسمیں عام طور پر اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہیں جو بعد میں مذکور ہوتا ہے۔مطلب ان آیات کا یہ ہے کہ ان پانچ صفات والی ہواؤں میں زبردست شہادت ہے کہ قیامت جس کا وعدہ دیا جاتا ہے، ضرور آنے والی ہے۔آپ دیکھیں ہوائیں کبھی نرم رفتار سے چلتی ہیں، پھر کبھی تند وتیز ہو کر آندھیاں بن جاتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر لاتی اور پھیلا دیتی ہیں، پھر ان کے قطعے جدا جدا کر کے بارش برسانا شروع کر دیتی ہیں، کہیں ایک قطرہ برسائے بغیر ہی آگے گزر جاتی ہیں۔ہواؤں کے یہ مختلف اطوار کبھی آہستہ چلنا، پھر کبھی تند وتیز آندھی بن جانا، پھر بادلوں کو اٹھانا، انھیں پھیلا کر برسانا اور منتشر کر دینا، کہیں خوفناک طوفان کی صورت میں عذاب بن کر آنا، وغیرہ یہ سب کچھ دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آ جاتا ہے۔اسی طرح یہ ہوائیں دلوں میں اللہ کے ذکر کا القا کرتی ہیں اور اللہ کی طرف توجہ مبذول کرواتی ہیں، کبھی ترغیب کے ساتھ کبھی ترہیب کے ساتھ، ہوائیں اگر خوشگوار اور نفع بخش ہیں تو اللہ کی نعمت ہیں اور ان کا اثر بندے پر یہ پڑنا چاہیے کہ وہ شکر ادا کرے اور اپنے عمل کی کوتاہی کا عذر پیش کرے اور اگر اس کے برعکس خوفناک طوفان اور بجلیوں کی صورت میں ہیں تو ان کا اثر بندے پر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ڈر کر گناہوں سے توبہ کی طرف متوجہ ہو۔

ان مختلف اطوار والی ہواؤں کو پیدا کرنے والے اور ان کا بندوبست کرنے والے پروردگار کے لیے قیامت برپا کرنا اور تمام فوت شدہ لوگوں کو زندہ کر کے باز پرس کرنا کونسا مشکل کام ہے؟

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

پس جب ستارے مٹا دیے جائیں گے۔⑧ اور جب آسمان کھولا جائے گا۔⑨ اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کرکے اڑا دیے جائیں گے۔⑩ اور جب وہ وقت آ جائے گا جو رسولوں کے ساتھ مقرر کیا تھا۔⑪ (یہ سب چیزیں) کس دن کے لیے مؤخر کی گئی ہیں؟⑫ فیصلے کے دن کے لیے۔⑬ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟⑭ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔⑮

آیت⑧ تا ⑮ ﴿ اُقِّتَتْ ﴾ اصل میں وُقِّتَتْ تھا۔ التوقیت، وقت مقرر کرنا۔ یہاں سے اس دن کی کچھ نشانیاں بیان فرمائیں کہ اس دن تاروں کی روشنی جاتی رہے گی (دیکھیے سورۃ التکویر:۲، الانفطار:۲) آسمان کھول دیا جائے گا اور اس میں دروازے ہی دروازے نمودار ہو جائیں گے۔ (الانشقاق:۱، الانفطار:۱، النبا:۱۸، ۱۹، الفرقان:۲۵) اور پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا۔ (طٰہٰ:۱۰۵، الواقعہ:۱ تا ۶، الحاقہ:۱۳ تا ۱۵، المزمل:۱۴، القارعہ:۵)

اور وہ وقت آ جائے گا جو رسولوں کے ساتھ مقرر کیا گیا تھا کہ ایک دن انھیں جمع کیا جائے گا اور وہ اپنی اپنی امت کو دین حق پہنچانے کی شہادت دیں گے۔ (النساء:٤١ ـ المائدہ:١٠٩)

(یہ سب چیزیں) کس دن کے لیے موخر کی گئی ہیں؟ فیصلے کے دن کے لیے، پھر اس دن کی عظمت و ہیبت بیان کرنے کے لیے فرمایا: اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ وہ دن کتنا عظیم ہے کہ آپ کو بتا سکے۔ ہاں اللہ تعالیٰ خود کچھ بتا دے تو الگ بات ہے، مختصر یہ کہ وہ دن اتنا خوفناک ہے کہ جھٹلانے والوں کے لیے اس دن ویل یعنی خرابی اور بربادی ہے۔

اس سورہ میں ﴿ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ دس مرتبہ آیا ہے، تکرار سے مقصود اس دن

أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ﴿١٧﴾ كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿١٨﴾
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٩﴾ أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ
مَكِينٍ ﴿٢١﴾ إِلَىٰ قَدَرٍ مَعْلُومٍ ﴿٢٢﴾ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ ﴿٢٣﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ
لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٤﴾

کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کر ڈالا؟ ﴿۱۶﴾ پھر ان کے پیچھے دوسروں کو بھیجتے رہتے ہیں۔ ﴿۱۷﴾
ہم مجرموں کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں۔ ﴿۱۸﴾ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے
لیے۔ ﴿۱۹﴾ کیا ہم نے تمھیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا۔ ﴿۲۰﴾ پھر اسے ایک مضبوط ٹھکانے
میں رکھا۔ ﴿۲۱﴾ ایک معلوم اندازے تک۔ ﴿۲۲﴾ پس ہم نے اندازہ کیا تو ہم اچھے اندازے
کرنے والے ہیں۔ ﴿۲۳﴾ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ﴿۲۴﴾

سے زیادہ سے زیادہ ڈرانا ہے۔

آیت ﴿۱۶﴾ تا ﴿۱۹﴾ قوم نوح علیہ السلام سے لے کر فرعون تک کے لوگوں کو اولین فرمایا اور زمانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اس کے بعد کے لوگوں کو آخرین فرمایا، پہلے لوگوں کی بربادی کا سبب بھی یہ تھا کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس دنیا کی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ آخر کار تباہ و برباد ہو گئے۔ اب بھی یہی قانون ہے کہ جو قوم آخرت کا انکار کرے گی تباہ و برباد ہو گی، قیامت کے دن ایسے لوگوں پر جو ہلاکت آئے گی، وہ اس دنیاوی بربادی کے علاوہ ہے اور ان کی اصل بربادی کا دن وہی ہو گا۔

آیت ﴿۲۰﴾ تا ﴿۲۴﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حقیر پانی یعنی منی کے قطرے سے پیدا فرمایا پھر اسے ایک محفوظ ٹھکانے یعنی ماں کے رحم میں رکھا، جو تین اطراف سے ہڈیوں سے گھرا ہوا ہے حمل قرار پاتے ہی بچے کو اتنی مضبوطی سے رحم میں جمایا جاتا ہے اور اس کی حفاظت کا اتنا انتظام ہوتا ہے کہ شدید حادثے کے بغیر اس کا اسقاط نہیں ہو سکتا۔

آیت ﴿۲۲﴾ ﴿إِلَىٰ قَدَرٍ مَعْلُومٍ﴾ (اس اندازے تک جو معلوم ہے) یعنی نو ماہ یا اس سے کم یا

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنَاكُم مَّاءً فُرَاتًا ﴿٢٧﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٨﴾

کیا نہیں بنایا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی؟ ⑳ زندوں کو اور مردوں کو۔ ㉖ اور ہم نے اس میں بلند پہاڑ بنائے اور تمھیں نہایت میٹھا پانی پلوایا۔ ㉗ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ㉘

زیادہ جس کا اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ وہ اتنے مہینوں، دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں پیدا ہو گا کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں۔

آیت ㉓ ﴿ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ ﴾ ”یعنی ہم نے ایک ایسی مدت مقرر کی جس میں بچہ کی ساخت مکمل ہو جاتی ہے، نہ کوئی چیز ضرورت سے زائد بنتی ہے اور نہ کوئی ضروری چیز رہ جاتی ہے، جب تک اس کے لیے رحم کے اندر رہنا ضروری ہوتا ہے، وہ اس میں رہتا ہے اور جب باہر آنا ضروری ہوتا ہے تو وہ باہر آجاتا ہے۔ یہ مدت ہم نے مقرر کی ہے اور ہم کتنا ٹھیک اندازہ کرنے والے ہیں۔ ﴿قَدَرْنَا﴾ کا دوسرا ترجمہ ”ہم قادر ہوئے“ بھی ہو سکتا ہے یعنی ہم نے پانی کی ایک بوند کو بتدریج ترقی دیتے دیتے کامل و عاقل انسان بنا دیا اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ ہم کیا خوب قدرت رکھنے والے ہیں۔ (اشرف الحواشی)

آیت ㉔ ﴿ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴾ ایک حقیر قطرے سے اپنی تخلیق کو دیکھنے کے بعد جو لوگ آخرت کے دن کو ناممکن قرار دے کر جھٹلاتے ہیں، ان کے لیے اس دن بڑی ہلاکت اور بربادی ہے۔

﴿كِفَاتًا﴾ كَفَتَ يَكْفِتُ (ض) سمیٹنا، جمع کرنا، مصدر بمعنیٰ اسم فاعل ہے یعنی سمیٹنے والی۔ (رَوَاسِيَ رَاسِيَةٌ) جمع ہے۔ رَسَا يَرْسُو (ن) زمین میں گڑا ہوا ہونا۔ مراد پہاڑ ہیں۔ (شَامِخَاتٍ) بلند (فُرَاتًا) بہت ہی میٹھا۔

فائدہ ① ﴿ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ..... ﴾ الخ زمین زندوں کو سمیٹتی ہے، وہ اسی پر زندگی گزارتے ہیں، وہ ان کی غلاظتیں سنبھالتی ہے اور مردوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۚ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۙ لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ۭ اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۚ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۭ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ

چلو اس چیز کی طرف جسے تم جھٹلاتے تھے۔ ۲۹ چلو ایک سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ ۳۰ نہ سایہ کرنے والا ہے، نہ تپش سے کسی کام آتا ہے۔ (۳۱) بلاشبہ وہ آگ محل جیسے شرارے پھینکے گی۔ ۳۲ جیسے وہ زرد اونٹ ہوں۔ ۳۳ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۳۴

اگر زمین مرنے والے انسانوں اور دوسرے جانداروں کو نہ سمیٹتی تو تعفن سے زندگی دشوار ہو جاتی۔ اس آیت سے مردوں کو سنبھالنے کے لیے دفن کی دلیل ملتی ہے، جو قومیں اپنے مردوں کو جلاتی ہیں ان کی راکھ اور ہڈیاں بھی زمین ہی کے سپرد ہوتی ہیں۔ ﴿وَجَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ ......الخ﴾ زمین بجائے خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک بہت بڑا نشان ہے، پھر اس پر بلند و بالا پہاڑ اور انسان کے پینے کے لیے نہایت میٹھا پانی، اللہ کی قدرت کے اتنے بڑے عجائب ہیں کہ ان کو دیکھ کر بھی جو لوگ آخرت کو جھٹلاتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق کو دوبارہ بنانا ممکن نہیں ان لوگوں کے لیے قیامت کے دن بہت بڑی خرابی اور ہلاکت ہے۔

اٰیت ۲۹ تا ۳۴ ﴿شُعَبٍ﴾ شُعْبَةٌ جمع ہے، شاخیں۔ ﴿جِمٰلَةٌ﴾ جَمَلٌ کی جمع ہے، جیسے حِجَارَةٌ حَجَرٌ کی، یہ بات قیامت کے دن جھٹلانے والوں سے کہی جائے گی۔ اس دن جب متقی لوگوں کو عرش الٰہی کا اور جنت کے گھنے درختوں کا سایہ ملے گا تو جھٹلانے والوں کو ایسے سائے کی طرف جانے کا حکم ہو گا جو جہنم سے نکلنے والے دھویں کا ہو گا، جو پھیل کر تین تین شاخوں میں تقسیم ہو جائے گا، جس میں نہ سایہ ہو گا نہ ٹھنڈک۔ جہنم سے اتنی بڑی بڑی چنگاریاں اڑیں گی جیسے محل، اور اس طرح دکھائی دیں گی جیسے زرد رنگ کے اونٹوں کی جماعت۔ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بہت بڑی بربادی ہے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۙ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۞ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۞
هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ۞ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ۞ وَيْلٌ
يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۞

یہ دن ہے کہ وہ نہ بولیں گے۔ ۳۵ اور نہ انھیں اجازت دی جائے گی کہ عذر کریں۔ ۳۶ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۳۷ یہ فیصلے کا دن ہے، ہم نے تمھیں اور پہلوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ ۳۸ تو اگر تمھارے پاس کوئی خفیہ تدبیر ہے تو میرے ساتھ کرلو۔ ۳۹ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۰

آیت ۳۵ تا ۳۷ یہاں فرمایا کہ جھٹلانے والے لوگ قیامت کے دن نہ بولیں گے، نہ انھیں عذر کرنے کی اجازت ہوگی۔ جب کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر مذکور ہے کہ وہ اپنے عذر پیش کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ایک طویل دن ہے وقوع قیامت کے وقت وہ ہیبت سے بول نہیں سکیں گے، پھر اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹے عذر بہانے پیش کرنے لگیں گے۔ اپنے مجرم ہونے ہی سے انکار کر دیں گے، قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے کبھی شرک نہیں کیا، بلکہ مطالبہ کریں گے کہ ہمارے خلاف کوئی ثبوت ہو تو پیش کیا جائے، جب ان کے اعمالنامے پیش ہوں گے، ان کو حق پہنچانے والوں کی شہادتیں پیش ہوں گی، زبانوں پر مہر لگا کر انھی کے اعضا کی گواہی پیش کر دی جائے گی تو پھر ان کا بولنا بند ہو جائے گا اور اب اجازت نہیں ہوگی کہ خواہ مخواہ عذر گھڑتے جائیں۔

آیت ۳۸، ۴۰ مجرموں کو ذلیل وخوار کرنے کے لیے کہا جائے گا کہ آج فیصلے کا دن ہے، جس میں ہم نے تمھیں اور تم سے پہلے سب جھٹلانے والوں کو جمع کر دیا ہے۔ دنیا میں تم زبردست چالیں چلتے اور سازشیں کرتے تھے، اب سب مل کر اپنے بچاؤ کی کوئی خفیہ تدبیر کر سکتے ہو تو کرلو، جسمانی عذاب کے ساتھ یہ ذہنی عذاب ہوگا۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ ﴿٤١﴾ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٤٢﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٤٤﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٥﴾ كُلُوا
وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُجْرِمُونَ ﴿٤٦﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٧﴾

یقیناً پرہیز گار لوگ اس دن سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔ ﴿٤١﴾ اور پھلوں میں، جس قسم
میں سے وہ چاہیں گے۔ ﴿٤٢﴾ مزے سے کھاؤ اور پیو ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔ ﴿٤٣﴾
یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ ﴿٤٤﴾ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں
کے لیے۔ ﴿٤٥﴾ (اے جھٹلانے والو!) تھوڑا عرصہ کھالو اور فائدہ اٹھالو، یقیناً تم مجرم ہو۔ ﴿٤٦﴾
ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ﴿٤٧﴾

آیت ﴿٤١﴾ تا ﴿٤٥﴾ اب جھٹلانے والوں کے مقابلے میں متقین کو ملنے والی نعمتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ دھوئیں کے سائے کی بجائے گھنے درختوں اور جنت کے مکانوں کے ٹھنڈے سایوں، چشموں اور اپنی پسند کے پھلوں میں عیش کر رہے ہوں گے، انھیں کہا جائے گا کہ مزے سے کھاؤ پیو، اس عمل کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے۔ ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾ جھٹلانے والوں کے لیے اس دن بڑی ہلاکت ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ لوگ عیش و آرام میں ہوں گے جنھیں وہ تمام عمر مذاق کرتے رہے اور یہ ان کے سامنے آگ میں جل رہے ہوں۔

﴿هَنِيئًا﴾ جو کسی مشقت کے بغیر حاصل ہو جائے اور اسے کھانے کے بعد کسی قسم کی گرانی یا بدہضمی نہ ہو (راغب) دنیا کے پھل مشقت سے ملتے ہیں اور کبھی موافق ہوتے ہیں، کبھی ناموافق، جنت کے پھل سب موافق ہوں گے۔

آیت ﴿٤٦﴾، ﴿٤٧﴾ سورہ کے آخر میں قیامت کو جھٹلانے والوں کو پھر خطاب ہے کہ دنیا میں کھالو اور فائدہ اٹھالو، یہ سامان بالکل قلیل ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ ''کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے۔'' یقیناً تم مجرم ہو، قیامت کے دن تمھارے جیسے جھٹلانے والوں کے لیے بہت بڑی خرابی اور بربادی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿۴۹﴾ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۰﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھک جاؤ تو جھکتے نہیں۔ ﴿۴۸﴾ ویل ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ﴿۴۹﴾ پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ ﴿۵۰﴾

آیت ﴿۴۸﴾، ﴿۴۹﴾ رکوع کا معنیٰ جھکنا یعنی اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے اور رکوع بول کر نماز بھی مراد لی جاتی ہے کیونکہ رکوع اس کا ایک حصہ ہے یعنی ان مکذبین کے جھٹلانے کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں نہ وہ نماز پڑھنے پر آمادہ ہیں۔ یہی کبر ان کے انکار کا باعث بن گیا ہے۔ جس طرح شیطان کے لیے بنا تھا حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا اصل اللہ کے سامنے جھک جانا ہے اور کفر کا اصل اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار ہے اور ایسے لوگوں کے لیے قیامت کے دن بہت بڑی خرابی اور بربادی ہے۔

آیت ﴿۵۰﴾ یعنی قرآن جو اللہ کا اپنا کلام ہے اور جس کا انداز انتہائی موثر اور دلنشیں ہے جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا جواب کوئی پیش کر سکا ہے نہ کر سکے گا اس پر یہ کفار ایمان نہیں لاتے تو پھر وہ کون سی بات پر ایمان لائیں گے؟

رکوعھا ۲ | (۷۸) سورۃ النبا مکیۃ (۸۰) | آیاتھا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۗ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝

کس چیز کے بارے میں وہ آپس میں سوال کر رہے ہیں؟① (کیا) اس بڑی خبر کے بارے میں؟② جس میں وہ اختلاف کرنے والے ہیں۔③ ہرگز نہیں، عنقریب جان لیں گے۔④ پھر ہرگز نہیں، عنقریب جان لیں گے۔⑤

تفسیر سورۃ النبا

آیت ① تا ③ فائدہ 1 اس سورت میں قیامت کے حق ہونے کے دلائل اور اس کے کچھ احوال بیان کیے گئے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے توحید و رسالت پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ یہ بتایا کہ ایک دن تمھیں زندہ ہو کر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور تمام نیک و بد اعمال کی جزا ملنی ہے تو سننے والوں نے آپس میں سوال شروع کر دیے کیا واقعی قیامت ہو گی؟ آیا یہ ممکن بھی ہے؟ پھر وہ قیامت کس طرح ہو گی؟ وغیرہ، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔
فائدہ 2 ﴿ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴾ سے مراد قیامت ہے۔ اس میں اختلاف یہ ہے کہ کوئی تو مانتا ہی نہیں کہ قیامت ہو گی، کوئی مانتا ہے مگر اسے یقین نہیں، کوئی کہتا ہے مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتے ہیں؟ یہ تو عقل ہی کے خلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے جسم زندہ نہیں ہوں گے، سب خوشی اور غم روح پر ہی گزرے گا۔ وغیرہ وغیرہ

آیت ④، ⑤ فائدہ 1 ﴿ كَلَّا ﴾ کا لفظ عربی میں عموماً ''كَلَّا'' سے پہلے والے کلام کو غلط اور بعد والے کلام کو صحیح قرار دینے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ کہ قیامت کے متعلق اختلاف

﴿ اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ الۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۙ﴿۷﴾ وَّ خَلَقۡنٰكُمۡ اَزۡوَاجًا ۙ﴿۸﴾ ﴾

کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا۔⑥ اور پہاڑوں کو میخیں۔⑦ اور ہم نے تمھیں جوڑا جوڑا پیدا کیا۔⑧

ڈالنا، انکار کرنا یا شک کرنا بالکل غلط ہے اور اس کا آنا بالکل یقینی ہے۔

فائدہ ② ﴿ سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴾ ''عنقریب جان لیں گے''، یعنی اگر ان کی عقل قیامت کو نہیں مانتی اور اس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں تو مرنے سے تو نہ یہ انکار کر سکتے ہیں، نہ شک کر سکتے ہیں، نہ اس میں کسی کا اختلاف ہے، بس مرنے کی دیر ہے، اس کے ساتھ ہی قیامت اور دوسری تمام حقیقتیں جنھیں یہ لوگ خلاف عقل قرار دے رہے ہیں سب ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں گی۔ تاکید کے لیے دوبارہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴾ ''پھر عنقریب جان لیں گے''۔

آیت ⑥ فائدہ ① اللہ تعالیٰ نے قیامت کا یقین دلانے کے لیے اور ان کی عقلوں کو جھنجھوڑنے کے لیے اپنی قدرت کے چند عجائب پیش فرمائے ہیں کہ عقل سے پوچھو کہ اتنے بڑے بڑے کام کرنے والے کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے اور وہ عجائب بھی خود تمھارے گرد و پیش اور تمھاری ذات میں موجود ہیں۔

فائدہ ② فرمایا جہاں رہتے ہو، اسی کو دیکھ لو، کیا عقل میں آ سکتا ہے کہ اتنی بڑی زمین کو ہم نے کس طرح پیدا کیا اور کس طرح بچھونے کی طرح بچھا دیا ہے؟

آیت ⑦ اور زمین کا توازن قائم رکھنے اور مسلسل زلزلے کی کیفیت سے بچانے کے لیے اس میں پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ ﴿ اَوۡتَادًا ﴾ وَتَدٌ کی جمع ہے ''میخیں''۔

آیت ⑧ خود اپنے آپ کو دیکھ لو ہم نے تمھیں نر اور مادہ پیدا کیا، مختلف رنگوں، بے شمار شکلوں اور صورتوں میں پیدا کیا۔ پہلی دفعہ پیدا کرنے پر تمھاری عقل کو تعجب نہیں ہوا تو دوبارہ پیدا کرنے پر کیوں ہوتا ہے؟ ﴿ اَزۡوَاجًا ﴾ زَوۡجٌ کی جمع ہے۔ اس کے دو معنے آتے ہیں، کئی جوڑے اور کئی قسمیں۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۪ وَّبَنَيْنَا
فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۪ۙ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً
ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۭ

اور ہم نے تمھاری نیند کو (باعث) آرام بنایا۔⑨ اور ہم نے رات کو پردہ بنایا۔⑩ اور ہم نے دن کو روزی کمانے کے لیے بنایا۔⑪ اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے۔⑫ اور ہم نے ایک بہت روشن گرم چراغ بنایا۔⑬ اور ہم نے بدلیوں سے کثرت سے برسنے والا پانی اتارا۔⑭ تاکہ ہم اس کے ساتھ غلہ اور بوٹیاں اگائیں۔⑮ اور گھنے باغ۔⑯

آیت ⑨ تا ⑪ ﴿سُبَاتًا﴾ اور سَبْتٌ مصدر ہیں (باب نصر وضرب) راحت، سکون، قطع کرنا ۔ اپنی نیند کو دیکھ لو جو موت کی طرح تمھاری تمام حرکت قطع کر کے تمھیں مکمل سکون کی وادی میں لے جاتی ہے۔ ہر روز مرنے اور جی اٹھنے کا یہ منظر دیکھ کر بھی تمھیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے؟ علاوہ ازیں تمھارے جسم کی ٹوٹ پھوٹ اور تھکن دور کرنے کے لیے نیند کو راحت وسکون کا ذریعہ بنا دیا، روشنی راحت میں خلل انداز ہو سکتی تھی، ہم نے رات کو تاریک بنا دیا جو لباس کی طرح ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ پھر ہماری مہربانی دیکھو کہ مسلسل رات نہیں رکھی، بلکہ روزی کی تلاش کے لیے دن بنا دیا۔ اگر رات ہی رہتی تو تم روزی کس طرح تلاش کرتے؟

آیت ⑫، ⑯ فائدہ ① آدمی کے نیچے اور گردوپیش کے عجائب کے بعد اوپر کے عجائب کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔ جن میں نہ شگاف ہے نہ کوئی کمزوری، نہ گرتے ہیں، نہ وہاں کسی شیطان کا دخل ہے۔ ﴿شِدَادًا﴾ شدیدۃ کی جمع ہے، یعنی محکم، مضبوط۔

فائدہ ② ﴿وَّهَّاجًا﴾ ''وَهْجٌ'' سے مبالغہ ہے جس میں حرارت اور روشنی دونوں جمع ہوتی ہیں۔ ''بہت روشن اور گرم چراغ'' مراد سورج ہے۔ ایسا دہکتا ہوا چراغ کہ کروڑوں میل دور ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص تھوڑی دیر مسلسل اسے دیکھنے کی حماقت کر بیٹھے تو نظر ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

فائدہ ③ ﴿الْمُعْصِرٰتِ﴾ ''وہ بادل جو پانی سے بھرے ہوئے ہوں''۔ (ثَجٌّ) ''شدت اور

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ﴿١٧﴾ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ﴿١٨﴾ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴿١٩﴾

یقیناً فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے۔⑰ جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو تم فوج در فوج چلے آؤ گے۔⑱ اور آسمان کھولا جائے گا تو دروازے دروازے ہو جائے گا۔⑲

کثرت سے بہنا یا بہانا“۔ لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ﴿ثَجَّاجًا﴾ ”کثرت سے برسنے والا“۔ ﴿أَلْفَافًا﴾ اس کی واحد (لَفَّاء) ہے اور جمع (لُفّ) اور جمع الجمع (أَلْفَاف) گھنے، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے، جن میں کوئی فاصلہ نہیں۔

آیت ⑰ یعنی ہم نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنانے سے لے کر (آخر آیات تک مذکور) جو کچھ بنایا ہے، اگر دنیا کی پیدائش سے لے کر اس کے ختم ہونے تک اس میں جو نیکی یا بدی کی گئی ہے اس کی جزا و سزا کسی وقت بھی نہ ہو، نہ ظالم سے باز پرس ہو، نہ مظلوم کی داد رسی ہو تو یہ سب کچھ تو بے نتیجہ رہا۔ اس لیے یقین رکھو کہ دنیا میں کیے گئے تمام اعمال کے فیصلے کے لیے ایک دن مقرر ہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: ﴿وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (الجاثیة : ۲۲) ”اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تاکہ ہر جان کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

آیت ⑱ یہاں صور میں دوسری دفعہ پھونکے جانے کا ذکر ہے جس سے تمام لوگ قبروں سے نکل کر گروہ در گروہ میدان محشر میں آ جائیں گے۔

آیت ⑲ آسمان میں اب بھی دروازے موجود ہیں جیسا کہ الاعراف : ۴۰ میں ہے اور حدیث معراج میں بھی اس کا ذکر ہے، مگر اس وقت آسمان اس طرح پھٹے گا جیسے وہ سارے کا سارا دروازوں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اور یہ پھٹنا فرشتوں کے اتارے جانے کے لیے ہو گا۔ ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنزِيلًا﴾ (الفرقان : ۲۵) ”جس دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے لگا تار اتارے جائیں گے“۔

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝

اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن جائیں گے۔ ⑳ یقیناً جہنم ہمیشہ سے ایک گھات کی جگہ ہے۔ ㉑ جو سرکشوں کے لیے ٹھکانا ہے۔ ㉒

آیت ⑳ فائدہ ① ﴿ سَرَابًا ﴾ جو دوپہر کے وقت دور سے دیکھنے والے کو پانی کی طرح نظر آتا ہے مگر حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح پہاڑ ریت بن جائیں گے جو دور سے پانی کی طرح نظر آتی ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

فائدہ ② قرآن میں قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے مختلف احوال بیان ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے صور کی آواز کے ساتھ زمین اور پہاڑ ایک چوٹ سے توڑ دیے جائیں گے: ﴿ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴾ (الحاقة : ١٤) ”اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا اور دونوں ایک ہی بار ٹکرا دیے جائیں گے۔“ پھر بھربھری ریت ہو جائیں گے جو خود بخود گرتی جا رہی ہو: ﴿ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴾ (المزمل: ١٤) ”اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔“ پھر دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے: ﴿ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴾ (القارعة: ٥) ”دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح۔“ پھر بکھرا ہوا غبار بن جائیں گے: ﴿ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴾ (الواقعة : ٦٠) ”پس وہ پھیلا ہوا غبار بن جائیں گے۔“ پھر بادلوں کی طرح چلیں گے: ﴿ وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ (النمل : ٨٨) ”حالانکہ وہ بادلوں کے گزرنے کی طرح چل رہے ہوں گے۔“ پھر سراب بن جائیں گے، جیسے یہاں فرمایا ہے، پھر ان میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا، فقط چٹیل زمین رہ جائے گی جس میں کوئی بلندی یا پستی نہیں ہوگی: ﴿ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴾ (طٰهٰ: ١٠٦، ١٠٧) ”پھر اسے ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ ابھری جگہ۔“

آیت ㉑، ㉒ یہاں سے جہنم اور اہل جہنم کا کچھ حال بیان ہوتا ہے۔ ﴿ مِرْصَادًا ﴾ ”گھات“ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کسی دشمن یا شکار پر قابو پانے کے لیے تاک لگائی جاتی ہے تاکہ وہ بے خبری میں آ کر پھنس جائے، یعنی سرکش لوگ اللہ سے بے خوف ہو کر دنیا میں فساد

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ
جَزَآءً وِّفَاقًا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۙ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۭ وَكُلَّ
شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۙ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝

وہ مدتوں اسی میں پڑے رہنے والے ہیں۔ ۲۳ نہ اس میں ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کوئی پینے کی چیز۔ ۲۴ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔ ۲۵ بدلہ ہے پورا پورا۔ ۲۶ بلاشبہ وہ کسی حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔ ۲۷ اور انھوں نے ہماری آیات کو ہر طرح جھٹلا دیا۔ ۲۸ اور ہر چیز کو ہم نے لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے۔ ۲۹ پس چکھو کہ ہم تمھارے لیے عذاب کے علاوہ کچھ زیادہ نہیں کریں گے۔ ۳۰

مچا رہے ہیں، مگر انھیں یاد نہیں کہ جہنم ان کے لیے ایک ایسی چھپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ اچانک پھنسیں گے اور پھر وہی ان کے لیے ہمیشہ کا ٹھکانا ہوگی۔

آیت ۲۳ ﴿ اَحْقَابًا ﴾ حُقْبٌ (حاء کے ضمہ اور قاف کے سکون کے ساتھ) کی جمع ہے۔ اسّی (۸۰) سال یا اس سے زیادہ مدت، زمانہ، سال (**قاموس**) یعنی مدتوں، کئی زمانے، سالہا سال اس میں پڑے رہیں گے، ایک مدت ختم ہونے پر دوسری مدت شروع ہو جائے گی، ایسی مدتیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ کچھ مدتوں کے بعد عذاب کم یا ختم ہو جائے گا کیونکہ اسی سلسلہ کلام میں آگے چل کر فرمایا: ﴿ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴾ (النبا : ۳۰)

آیت ۲۴ تا ۲۶ ﴿ حَمِيْمًا ﴾ اور ﴿ غَسَّاقًا ﴾ کی تشریح کیلیے دیکھیے (سورہ ص: ۵۷) ﴿ بَرْدًا ﴾ سے مراد خوش گوار ٹھنڈک ہے۔ جہنم میں ایک طبقہ زمہریر بھی ہے جہاں بے انتہاء سردی ہے اسے مزے کی ٹھنڈک نہیں کہہ سکتے۔ (وحیدی)

آیت ۲۷، ۲۸ ان کے جہنم میں جانے کی وجہ ایک یہ ہے کہ انھیں اعمال کے حساب کی امید نہ تھی، ورنہ وہ اپنے اعمال کو درست کر لیتے۔ دوسری یہ کہ انھوں نے ہماری آیات کو ہر طرح جھٹلا دیا۔ ﴿ كِذَّابًا ﴾ مصدر ہے (كَذَّبُوْا) کا۔ اس کے ساتھ ﴿ كَذَّبُوْا ﴾ کی تاکید فرمائی ہے۔ ترجمہ میں اس تاکید کو "ہر طرح" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

آیت ۳۰ یعنی جس طرح تم کفر و تکذیب میں برابر بڑھتے چلے گئے، اسی طرح ہم بھی تمھارا

اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا ۙ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعۡنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ کَوَاعِبَ اَتۡرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّ کَاۡسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾
لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا وَّ لَا کِذّٰبًا ﴿۳۵﴾

یقیناً پرہیز گاروں کے لیے (ایک بڑی) کامیابی ہے۔ ﴿۳۱﴾ باغات اور انگور۔ ﴿۳۲﴾ اور نوجوان ہم عمر لڑکیاں۔ ﴿۳۳﴾ اور چھلکتے ہوئے پیالے۔ ﴿۳۴﴾ وہ اس میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ (ایک دوسرے کو) جھٹلانا۔ ﴿۳۵﴾

عذاب برابر بڑھاتے رہیں گے اور کسی لمحہ اس میں تخفیف نہیں کریں گے۔ (النساء : ۵٦ ، الاسراء : ۹۷)

آیت ﴿۳۱﴾ جہنم اور جہنمیوں کے بعد جنت اور جنتیوں کا ذکر ہے، یہاں متقین کا ذکر ان لوگوں کے مقابلے میں آیا ہے جنھیں کسی حساب کی توقع نہ تھی اور جنھوں نے اللہ کی آیات کو بالکل جھٹلا دیا تھا، یعنی حساب اعمال سے ڈرنے والوں اور کفر و تکذیب سے ڈرنے والوں کے لیے (ایک بڑی) کامیابی ہے۔ ﴿مَفَازًا﴾ مصدر ہو تو معنیٰ ہے ''کامیابی'' ظرف ہو تو ''کامیابی کا مقام'' ﴿مَفَازًا﴾ میں تنوین ''ایک بڑی'' کا مفہوم ادا کر رہی ہے۔

آیت ﴿۳۲﴾ تا ﴿۳۴﴾ ﴿حَدَآئِقَ﴾ ''حَدِیْقَةٌ'' کی جمع ہے، وہ باغ جس کے گرد چار دیواری ہو۔ ﴿اَعْنَابًا﴾ ''عِنَبٌ'' کی جمع ہے۔ انگور کو پھلوں میں ایک خصوصیت حاصل ہے اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر فرمایا۔ ﴿اَعْنَابًا﴾ جمع لانے کا مطلب ہے کہ انگور کی بہت سی اقسام ہوں گی۔ ﴿كَوَاعِبَ﴾ ''كَاعِبٌ'' کی جمع ہے وہ نوجوان لڑکی جس کا سینہ ایسے ابھرا ہوا ہو جیسے کعب یعنی ٹخنہ۔ ﴿اَتْرَابًا﴾ تِرْبٌ (تاء کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، مٹی میں ساتھ کھیلنے والے ہم عمر۔ آپس میں ہم عمر ہوں گی یا اپنے خاوندوں کی ہم عمر ہوں گی۔

آیت ﴿۳۵﴾ جنت کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ آدمی کے کان وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے، نہ یہ سنیں گے کہ کوئی کسی کو جھوٹا کہہ رہا ہے۔ کوئی کسی سے جھگڑے گا ہی نہیں کہ اس کی بات کو جھٹلائے۔ گالی گلوچ اور دنگا و فساد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نعمت کی

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ
لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۛ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ
اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝

تیرے رب کی طرف سے بدلے میں ایسا عطیہ ہے جو کافی ہو گا۔ ۳۶ (اس رب کی طرف سے) جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا رب ہے، بے حد رحم والا، وہ اس سے کوئی بات کرنے کی قدرت نہیں رکھیں گے۔ ۳۷ جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے، بات نہیں کریں گے مگر وہ جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔ ۳۸

قدر وہی جانتا ہے جسے ان کاموں سے نفرت ہو، پھر اسے بیہودہ بکنے والوں اور ایک دوسرے کو جھٹلانے والے بدتمیزوں سے واسطہ رہتا ہو۔

آیت ۳۶، ۳۷ فائدہ 1 یہ سب کچھ ان کے رب کی طرف سے ان کے اعمال کا بدلہ ہے، بدلہ دینے والا رب تعالیٰ ہو تو بدلہ کتنا عظیم ہوگا، پھر برابر بدلہ ہی نہیں دس گنا سے لے کر سات سو گنا، بلکہ اس سے بڑھا کر لامحدود گنا عطیہ بھی ملے گا۔ البتہ گناہ کا بدلہ اتنا ہی ہوگا جتنا گناہ ہے۔

فائدہ 2 ﴿حِسَابًا﴾ اس کے دو معنی ہیں، پہلا یہ کہ وہ عطیہ حساب سے ہوگا، یعنی ان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ایسا نہ ہوگا جو حساب میں نہ آئے۔ دوسرا معنیٰ ہے "کافی عطیہ" جیسے ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ﴾ کا معنیٰ ہے مجھے اللہ کافی ہے، یعنی اتنا بدلہ ہوگا جس سے زیادہ کی خواہش نہیں ہوگی۔

فائدہ 3 ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ ......﴾ یعنی انتہائی لطف و رحمت کے باوجود قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا جلال اس قدر ہوگا کہ کوئی اس کے سامنے لب کشائی نہیں کر سکے گا۔ (اشرف الحواشی)

آیت ۳۸ فائدہ 1 ﴿الرُّوْحُ﴾ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جیسے فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ 'اس قرآن کو امانت دار روح لے کر اترا ہے'۔ (الشعراء: ۱۹۳) دوسرا معنیٰ جو لفظ سے ظاہر ہے بنو آدم کے ارواح ہیں۔

ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا ﴿٣٩﴾

یہ ہے وہ دن جو حق ہے، پس جو چاہے اپنے رب کی طرف لوٹنے کی جگہ بنالے۔ ﴿۳۹﴾

فائدہ﴿2﴾ صحیح احادیث کے مطابق یہ اس وقت کا ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نیک و بد کے فیصلہ کے لیے آسمان سے زمین پر میدان محشر میں نزول فرمائے گا اور لوگ سورج کی گرمی اور پسینے سے گھبرا جائیں گے اور آدم سے لے کر عیسیٰ علیہم السلام تک سب انبیاء کے پاس جائیں گے کہ حساب کتاب شروع ہو اور کسی نبی کی جرأت اور طاقت اللہ تعالیٰ سے بات کرنے کی نہ ہوگی۔ آخر کار خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بات کرنے کا حکم ہوگا اور آپ کی شفاعت سے سب لوگوں کا حساب شروع ہوگا۔ (احسن التفاسیر) دیکھیے البخاری حدیث: ۷۴۴۰، ۷۵۱۰۔

فائدہ﴿3﴾ ﴿لَا يَتَكَلَّمُونَ .....﴾ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے بات (سفارش) کرنے والے کے لیے دو شرطیں ہیں: پہلی یہ کہ رحمان اسے بات (سفارش) کرنے کی اجازت دے۔ ﴿مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ (البقرہ : ۲۵۵) ''کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے''۔ دوسری یہ کہ وہ درست بات کرے۔ سفارش کرنے میں غلطی نہ کرے۔ مثلاً غیر مستحق کی سفارش نہ کر بیٹھے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آزر کے لیے سفارش نہیں کر سکیں گے، دوسری تفسیر یہ ہے کہ جس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے بات کی جائے اس کے لیے دو شرطیں ہیں پہلی یہ کہ رحمان اس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت دے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ﴾ (الانبیاء : ۲۸) ''وہ فرشتے صرف اسی کے لیے سفارش کرتے ہیں جسے رحمان پسند کرے''۔ دوسری یہ کہ ﴿قَالَ صَوَابًا﴾ یعنی ''دنیا میں اس نے درست بات کہی ہو'' یعنی کلمہ توحید کہا ہو۔ مسلمان ہو۔ کافر مشرک نے دنیا میں درست بات نہیں کہی ہوتی اس کے حق میں سفارش کی اجازت نہیں ملے گی۔ (جامع البیان)

آیت ۳۹ ﴿ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ﴾ ''یہ وہ دن ہے جو حق ہے'' یعنی آ کر رہے گا تو جب اس دن کا آنا یقینی ہے تو آدمی کو چاہیے کہ اپنے مولا کو منہ دکھانے کے قابل بننے اور اس کے پاس

إِنَّآ أَنذَرْنَٰكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنظُرُ ٱلْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ ٱلْكَافِرُ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ تُرَٰبًۢا ﴿٤٠﴾

بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک ایسے عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب ہے، جس دن آدمی دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کافر کہے گا اے کاش کہ میں مٹی ہوتا۔ ﴿٤٠﴾

ٹھکانا بنانے کے لیے ابھی تیاری کر لے، مرنے کے بعد اس کا موقع نہیں ملے گا۔

آیت ﴿٤٠﴾ فائدہ ﴿1﴾ ﴿ عَذَابًا قَرِيبًا ﴾ آخرت کے عذاب کو قریب فرمایا، کیونکہ عمر خواہ کتنی بھی ہو ختم ہونے والی ہے اور ہر آنے والا وقت قریب ہی ہوتا ہے۔ قیامت کو جب اٹھیں گے تو انھیں دنیا میں قیام کا وقت ایسے معلوم ہوگا جیسے دن کا ایک پہر گزرا ہو۔ (النازعات : ٤٦) بلکہ قیامت کے دن مجرم قسم اٹھا کر کہیں گے کہ ہم دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ (دیکھیے سورۃ الروم : ٥٥)

فائدہ ﴿2﴾ ﴿ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ تُرَٰبًا ﴾ اے کاش کہ میں مٹی ہوتا، یعنی پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ نہ حساب ہوتا نہ کتاب، دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ کاش میں مر کر مٹی ہو جاتا تو نہ حساب ہوتا نہ عذاب۔ بعض مفسرین نے ایک عجیب معنیٰ کیا ہے کہ ''الکافر'' سے مراد یہاں ابلیس ہے۔ جب آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو ان کے اعمال کا ثواب ملے گا تو ابلیس کہے گا کاش میں مٹی ہوتا، آگ سے بنا ہوا نہ ہوتا کیونکہ اس نے آگ سے بنا ہوا ہونے کی وجہ سے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم ٹھکرا دیا تھا۔ (زاد المسیر ابن جوزی)

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝

قسم ان (فرشتوں) کی جو ڈوب کر سختی سے (جان) کھینچ لینے والے ہیں!① اور جو آسانی سے بند کھول دینے والے ہیں!②

تفسیر سورۃ النازعات

آیت ①، ② ﴿ وَالنّٰزِعٰتِ ﴾ اور ﴿ وَّالنّٰشِطٰتِ ﴾ سے مراد سختی اور آسانی کے ساتھ جان نکالنے والے فرشتے ہیں۔ اگرچہ ان الفاظ کی تفسیریں اور بھی کی گئی ہیں مگر ابن عباس، ابن مسعود اور علی رضی اللہ عنہم سے یہی تفسیر مروی ہے۔ (الدر المنثور) اور صحیح احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسا کہ مسند احمد میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن آدمی جب دنیا سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو ملک الموت اس کے سر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے، اے پاکیزہ جان! اللہ کی مغفرت اور رضاء کی طرف نکل آ، تو وہ اس طرح نکل آتی ہے جس طرح مشکیزے سے پانی کا قطرہ نکلتا ہے اور کافر جب دنیا سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو ملک الموت اس کے سر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور کہتا ہے، اے خبیث جان! اللہ کی ناراضی کی طرف نکل آ، تو وہ جسم میں بکھر جاتی ہے تو وہ اسے اس طرح سختی سے کھینچ کر نکالتا ہے جس طرح بھیگی ہوئی اون سے گرم سلاخ کھینچ کر نکالی جاتی ہے۔ (مسند احمد) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے، (مشکوۃ حدیث: ۱۶۳۰)

﴿ وَالنّٰزِعٰتِ ﴾ ”سختی سے کھینچ کر نکالنے والے۔“ ﴿ غَرْقًا ﴾ ”ڈوب کر“ ان فرشتوں کی قسم جو کفار کی جان ڈوب کر یعنی ان کے بدن کے ہر حصہ میں پہنچ کر سختی سے کھینچ کر نکالتے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ﴿۵﴾

اور جو خوب تیزی سے تیرنے والے ہیں!﴿۳﴾ پھر جو دوڑ کر آگے نکل جانے والے ہیں!﴿۴﴾ پھر جو کسی کام کی تدبیر کرنے والے ہیں!﴿۵﴾

ہیں، جب کہ وہ نکلنا نہیں چاہتی۔

﴿وَّالنّٰشِطٰتِ﴾ ''نَشَطَ الْعِقَالَ''(باب نصر) رسی کی گرہ کھولنا۔فرشتے مسلمان کی روح گرہ کھول کر نکالتے ہیں، وہ خوشی سے اللہ کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑتی ہے۔کافر اور مومن کا یہ فرق روح کی حالت میں ہے، بدن کی تکلیف الگ ہے، اس میں مسلمان اور کافر برابر ہیں۔(خلاصہ موضح)

آیت ﴿۳﴾،﴿۴﴾ ﴿وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا﴾ سَبَحَ(باب فتح) سَبْحًا۔ تیرنا۔ اَلسّٰبِحٰتِ (تیرنے والے) سَبْحًا مصدر تاکید کے لیے ہے۔ترجمہ میں یہ مفہوم (خوب تیزی سے) کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔مراد وہ فرشتے ہیں جو احکام الٰہی کی تعمیل کے لیے تیزی سے آسمان میں تیرتے ہوئے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

آیت ﴿۵﴾ ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ پھر دین و دنیا کے جس کام کا انھیں حکم دیا ہوتا ہے اس کی تدبیر کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے یا تو ان کی ندرت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے یا انھیں بعد میں آنے والے جواب قسم کی شہادت کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے یہاں جواب قسم صاف لفظوں میں مذکور نہیں مگر قیامت کے احوال ذکر کرنے سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ قسمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کھائی گئی ہیں کہ قیامت قائم ہو کر رہے گی۔اہل عرب فرشتوں کا اللہ کی طرف سے قبض ارواح اور دوسرے معاملات کی تدبیر پر مامور ہونا مانتے تھے۔فرشتوں کے یہ اوصاف ذکر کر کے ان کی قسم اس بنا پر کھائی گئی ہے کہ فرشتے جس اللہ کے حکم سے روح قبض کر سکتے ہیں، نہایت تیزی سے کائنات میں نقل و حرکت

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝

جس دن ہلا ڈالے گا سخت ہلانے والا (زلزلہ)۔⑥ اس کے بعد اس کے پیچھے آنے والا (زلزلہ) آئے گا۔⑦ کئی دل اس دن دھڑکنے والے ہوں گے۔⑧ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔⑨ یہ لوگ کہتے ہیں کیا ضرور ہی ہم پہلی حالت میں لوٹائے جانے والے ہیں۔⑩ کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔⑪

کر سکتے ہیں اور کائنات کے معاملات کی تدبیر کر سکتے ہیں، اسی اللہ کے حکم سے صور میں پھونک کر اس کائنات کو فنا بھی کر سکتے ہیں اور دوبارہ پھونک کر از سرِ نو زندہ بھی کر سکتے ہیں۔

آیت ⑥،⑦ ﴿تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ قاموس میں ہے: **رَجَفَ حَرَّكَ وَ تَحَرَّكَ وَ اضْطَرَبَ شَدِيْدًا**، **رَجَفَ** کا معنی سخت حرکت کرنا اور حرکت دینا دونوں آتے ہیں، یہاں حرکت دینا زیادہ مناسب ہے۔ ﴿الرَّاجِفَةُ﴾ سے مراد پہلی دفعہ صور میں پھونکے جانے سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ ﴿الرَّادِفَةُ﴾ سے مراد دوسرے نفخہ سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے تمام لوگ زندہ ہو کر از سرِ نو قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ سورہ زمر آیت (۶۸) میں بھی انھی دونوں نفخوں کا ذکر ہے۔

آیت ⑧،⑨ ﴿قُلُوبٌ﴾ الخ ''کئی دل اس دن دھڑک رہے ہوں گے'' یعنی سخت خوفزدہ ہوں گے۔ کئی دل اس لیے فرمایا کہ صالح مومن اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے۔ ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ .....﴾ (الانبیاء : ۱۰۳) ''سب سے بڑی گھبراہٹ انھیں غمگین نہیں کرے گی.....'' دلوں اور آنکھوں کا حال بیان کرنے سے اس دن کفار کی ظاہری اور باطنی پریشانی کی مکمل تصویر سامنے آ گئی۔

آیت ⑩،⑪ ''کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے تو دوبارہ پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟''رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے منکرین قیامت کا یہ کہنا تھا، آج کے مادہ

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾

کہتے ہیں اس وقت تو یہ خسارے والا لوٹنا ہوگا۔ ⑫ پس وہ تو صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔ ⑬ کہ یک لخت وہ زمین کے اوپر موجود ہوں گے۔ ⑭ کیا تیرے پاس موسیٰ کی بات پہنچی ہے؟ ⑮ جب اس کے رب نے اسے مقدس وادی طویٰ میں پکارا۔ ⑯

پرست بھی یہی کہتے ہیں ان کے خیال میں ہڈیاں بوسیدہ ہونے کے بعد انسان کا دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے۔

آیت ⑫ ان کا یہ کہنا بطور مذاق ہے، یعنی اگر نبی ﷺ کے کہنے کے مطابق ہم دوبارہ پہلی حالت میں آئے تو ان کے مطابق تو ہمارے لیے یہ بہت خسارے کا اٹھنا ہوگا۔

آیت ⑬، ⑭ ﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ الخ یعنی تمھارا دوبارہ اٹھایا جانا تمھیں کتنا ہی ناممکن دکھائی دے اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں، اس کی طرف سے ایک ڈانٹ یعنی صور میں ایک پھونک پڑنے کی دیر ہے کہ سب زندہ ہوکر قبروں سے نکل کر سطح زمین پر موجود ہوں گے۔ ﴿السَّاهِرَةِ﴾ سَهِرَ (باب سَمِعَ) ''جاگنا''۔ الساهرة ''زمین کا اوپر کا حصہ'' کیونکہ اسی پر انسانوں کا جاگنا اور سونا ہے۔ چٹیل میدان اور صحرا کو (الساهرة) اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں خوف کی وجہ سے انسان بیدار رہتا ہے۔ (فتح القدیر)

آیت ⑮ ''کیا تیرے پاس موسیٰ کی بات پہنچی ہے؟'' قیامت اور اس کا انکار کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر فرمایا، اس سے ایک تو منکرین کو ڈرانا مقصود ہے کہ حق کا انکار کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ دوسرا نبی ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ ان کافروں کے جھٹلانے پر رنجیدہ نہ ہوں آپ سے پہلے لوگوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تو ان کا یہ انجام ہوا۔

آیت ⑯ ﴿طُوًى﴾ طور سینا کے دامن میں واقع ایک وادی کا نام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر مدین

۷۹

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾

کہ فرعون کے پاس جا، یقیناً وہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ ﴿۱۷﴾ اور کہہ کیا تجھے اس بات کی کوئی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے۔ ﴿۱۸﴾ اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہ نمائی کروں، پس تو ڈر جائے۔ ﴿۱۹﴾ چنانچہ اس نے اسے بڑی نشانی دکھائی۔ ﴿۲۰﴾

سے واپسی پر پہلی وحی یہیں اتری۔ (دیکھئے سورہ طٰہٰ : ۱۲)

آیت ﴿۱۷﴾ تا ﴿۱۹﴾ فائدہ ① فرعون کے پاس جانے کا حکم دینے کے ساتھ اسے دی جانے والی دعوت بھی سکھلائی۔ دعوت کے الفاظ میں اختصار کے باوجود نرمی اور ترغیب و ترہیب واضح طور پر نمایاں ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرمایا تھا: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ یعنی "فرعون سے نرم بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔"

فائدہ ② ﴿اِنَّهٗ طَغٰى﴾ "یقیناً وہ حد سے بڑھ گیا ہے" فرعون کا حد سے بڑھنا ایک تو بندگی کی حد سے بڑھ کر یہ کہنا تھا کہ میں تمھارا رب اعلیٰ ہوں، دوسرا خلق خدا پر اس کی طغیانی یہ تھی کہ اس نے قوم کو طبقوں میں تقسیم کر کے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے بیٹے ذبح کرتا اور عورتیں زندہ رکھتا۔

فائدہ ③ ﴿تَزَكّٰى﴾ "پاک ہو جائے" یعنی شرک و کفر کی گندگی سے پاک ہو جائے۔ ﴿فَتَخْشٰى﴾ "پس تو ڈر جائے" یعنی اپنے رب کا راستہ معلوم ہو جانے کے بعد تو ڈر جائے کہ پروردگار اپنی دی ہوئی حکومت چھین کر نعمتوں کی جگہ اپنی گرفت میں ہی نہ لے لے، چنانچہ تو اس ڈر سے اس کا شریک بننے اور بندوں پر ظلم کرنے سے بچ جائے کیونکہ دل میں ڈر علم ہی سے پیدا ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (الفاطر : ۲۸) "اللہ تعالیٰ سے صرف اس کے علم والے بندے ہی ڈرتے ہیں۔"

آیت ﴿۲۰﴾ بڑی نشانی سے مراد لاٹھی کا سانپ بن جانا ہے۔ ﴿الْاٰيَةَ﴾ کو واحد کی بجائے جنس

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ ءَاَنْتُمْ
اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا
وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝
وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

تو اس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔ (۲۱) پھر واپس پلٹا، دوڑ بھاگ کرتا تھا۔ (۲۲) پھر اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور پکارا۔ (۲۳) کہنے لگا میں تمھارا سب سے اونچا رب ہوں۔ (۲۴) تو اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ (۲۵) یقیناً اس میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جو ڈرتا ہے۔ (۲۶) کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ جسے اس نے بنایا۔ (۲۷) اس کی چھت کو بلند کیا پھر اسے برابر کیا۔ (۲۸) اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا۔ (۲۹) اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا۔ (۳۰) اس سے اس کا پانی اور اس کا چارا نکالا۔ (۳۱) اور پہاڑ، اس نے انھیں خوب گاڑ دیا۔ (۳۲) تمھاری اور تمھارے چوپاؤں کی زندگی کے سامان کے لیے۔ (۳۳)

مان لیں تو عصائے موسیٰ اور ید بیضا دونوں مراد ہو سکتے ہیں، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے جانے والے **تسع آیات بینات** (۹ معجزے) بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

آیت (۲۵) آخرت کو آگ میں جلے گا، دنیا میں غرق ہوا۔

آیت (۲۷) شروع سورہ میں قیامت حق ہونے کی دلیل کے طور پر فرشتوں کا، اور ان چند امور کا ذکر فرمایا جو وہ سرانجام دیتے ہیں، یعنی ان فرشتوں کے رب کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ یہاں سے پھر قیامت کے دلائل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت ۲۷ سے ۳۳ تک اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی عظیم الشان مخلوقات کا ذکر فرمایا کہ اتنی قدرتوں والے پروردگار کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کرنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے؟

آیت (۳۰) تا (۳۳) سوال: یہاں آسمان بنانے کے بعد زمین بچھانے کا ذکر فرمایا ہے جب کہ سورہ

بقرہ آیت ۲۹ اور حم سجدہ آیت ۹ تا ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمین پیدا کی گئی پھر آسمان، ان دونوں کے درمیان تطبیق کیا ہوگی؟

جواب: ① بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلے زمین بنی پھر آسمان، البتہ زمین کو بچھانے، اس کا پانی اور چارہ نکالنے اور اس میں پہاڑ گاڑنے کا کام بعد میں ہوا۔ گویا زمین کی خلق (پیدائش) آسمان سے پہلے ہے۔ البتہ دحو (بچھانا) بعد میں ہے۔ طبری نے یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔

② بعض مفسرین نے سورہ نازعات کی زیر تفسیر آیات اور حم سجدہ آیت ۹ تا ۱۲ کو ملا کر خلاصہ یوں نکالا ہے۔ ”اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان پیدا کیا، اس حال میں کہ وہ دھوئیں کی مانند تھا پھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا، پھر اس پر پہاڑوں کو رکھ دیا، پھر زمین میں سبزیاں، درخت وغیرہ کی پیدائش کا اندازہ مقرر کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کو، جو اب تک دھوئیں کی شکل میں تھا، سات آسمانوں میں تبدیل کیا، آسمان کی چھت کو بلند کیا، پھر زمین کو بچھا دیا، اس میں سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو زمین میں مضبوطی سے گاڑ دیا“ (تفسیر قرآن عزیز سورة النازعات)

③ تیسری تطبیق یہ ہے کہ یہاں سورہ نازعات میں زمین و آسمان پیدا کرنے کی ترتیب زمانی بیان کرنا مقصود ہی نہیں، وہ تو وہی ہے جو سورة البقرہ اور سورة حم السجدہ میں ہے، بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر پہلے آسمان کو ذکر کیا گیا ہے پھر زمین کو۔ واضح رہے کہ بعد کا لفظ ہر جگہ زمانے کی ترتیب کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ترتیب ذکری کے لیے ہوتا ہے، یعنی موقع کی مناسبت سے زیادہ اہم چیز پہلے ذکر ہوتی ہے دوسری بعد میں، جیسے فرمایا: ﴿عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ﴾ (سورة القلم : ۱۳) (سخت مزاج اس کے بعد بدنام) ایسے موقع پر زمانی ترتیب کچھ بھی ہو بعد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلی چیز کے بعد اس کی خبر دی جا رہی ہے، اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ایسے موقع پر عموماً بعد کا معنیٰ ”مع“، یعنی ساتھ ہوتا ہے، یعنی سخت مزاج ہونے کے ساتھ وہ بدنام بھی ہے، اسی طرح سورة البلد کی آیت ۱۱ سے ۱۷ تک کی تفسیر دیکھ لیں ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ.....﴾ کے بعد فرمایا

ع۹

فَإِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَأَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴿۳۹﴾ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴿۴۱﴾

پھر جب وہ ہر چیز پر چھا جانے والی سب سے بڑی مصیبت آجائے گی۔ ﴿۳۴﴾ جس دن انسان یاد کرے گا جو اس نے کوشش کی۔ ﴿۳۵﴾ اور جہنم اس کے لیے ظاہر کر دی جائے گی جو دیکھتا ہے۔ ﴿۳۶﴾ پس لیکن جو حد سے بڑھ گیا۔ ﴿۳۷﴾ اور اس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ ﴿۳۸﴾ تو بے شک جہنم ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔ ﴿۳۹﴾ اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور نفس کو خواہش سے روک لیا۔ ﴿۴۰﴾ تو جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔ ﴿۴۱﴾

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ......﴾ یہاں بھی ﴿ثُمَّ﴾ ترتیب زمانی کے لیے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ گردن چھڑانے اور کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ یہ تطبیق تقریباً تمام مفسرین نے ذکر کی ہے اور سب سے بہتر ہے کیونکہ پہلی دونوں تطبیقوں میں چھ دن میں زمین و آسمان کی پیدائش کی تفصیل اور ترتیب پوری طرح واضح نہیں ہوتی اور نہ اصل اشکال دور ہوتا ہے۔

آیت ﴿۳۴﴾ ﴿الطَّآمَّةُ﴾ اس مصیبت کو کہتے ہیں جو ہر چیز پر چھا جائے، مراد قیامت ہے مزید ہولناکی بیان کرنے کے لیے فرمایا ''الْكُبْرٰى'' سب سے بڑی (مصیبت)۔

آیت ﴿۳۶﴾ یعنی گمراہ لوگوں کے لیے جہنم سامنے کر دی جائے گی کہ یہ تمھارا ٹھکانا ہے، البتہ متقی لوگوں کے لیے جنت قریب کی جائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴾ (الشعراء: ۹۰، ۹۱) یعنی ''جنت متقی لوگوں کے قریب کر دی جائے گی اور جہنم گمراہوں کے لیے ظاہر کر دی جائے گی''۔ یہ معنی بھی درست ہے کہ مومن ہو یا کافر، جہنم ہر دیکھنے والے کے سامنے ہوگی، مومن اس سے بچائے جانے پر اللہ کا شکر ادا کریں گے اور کافر شدید حسرت و افسوس میں مبتلا ہوں گے۔ میدان محشر میں جہنم لائے جانے کے متعلق

۷۹

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ۝

اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ۝ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ۝

وہ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہے؟ (۴۲) اس کے ذکر سے تو کس خیال میں ہے؟ (۴۳) تیرے رب ہی کی طرف اس (کے علم) کی انتہا ہے۔ (۴۴) تو تو صرف اسے ڈرانے والا ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔ (۴۵) گویا وہ جس دن اسے دیکھیں گے وہ (دنیا میں) ٹھہرے ہی نہیں مگر دن کا ایک پچھلا حصہ یا اس کا پہلا حصہ۔ (۴۶)

دیکھئے والفجر آیت ۲۳ کی تفسیر۔

آیت (۴۲) ﴿مُرْسٰىهَا﴾ مصدر ہو تو معنیٰ ہوگا اس کا وقوع یا قیام، ظرف ہو تو اس کے قیام کا وقت۔ کافر لوگ یہ سوال بار بار کرتے تھے۔ ان کا مقصد قیامت کا وقت اور تاریخ معلوم کرنا نہیں تھا بلکہ اسے جھٹلانا اور اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا۔

آیت (۴۳) یعنی جب آپ کو خود ہی اس کا مقرر وقت معلوم نہیں تو آپ انھیں کیا بتائیں گے اور آپ کا اس کے ذکر سے کیا تعلق؟

آیت (۴۴) ﴿مُنْتَهٰىهَا﴾ اس کی انتہا، جہاں جا کر بات ختم ہوتی ہے وہ رب تعالیٰ ہے، یعنی جس کسی سے قیامت کے متعلق پوچھو وہ بے خبر ہوگا، کسی دوسرے سے پوچھنے کو کہے گا تو وہ بھی بے خبر ہوگا، پوچھتے پوچھتے آخر میں جہاں بات ختم ہوگی اور جو بتا سکتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ درمیان میں سب بے خبر ہیں۔ (از موضح القرآن)

آیت (۴۵) یعنی آپ کا کام اس کا وقت بتانا نہیں ہے بلکہ اس سے ڈرانا ہے اور اگرچہ آپ کا فریضہ تمام دنیا کو اس سے ڈرانا ہے مگر اس کا فائدہ صرف اس کو ہوگا جس کے دل میں اس کا خوف ہے، وہ آپ کی تبلیغ سن کر تیاری کرے گا اور جس کے دل میں قیامت پر ایمان اور اس کا خوف ہی نہیں اسے آپ کے ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہ اس کا وقت ہی پوچھتا رہ جائے گا۔

آیت (۴۶) یعنی وہ قیامت جسے یہ بہت دور سمجھ رہے ہیں جب آئے گی تو انھیں ایسے معلوم ہوگا

جیسے وہ دنیا میں صرف دن کا پچھلا حصہ یا پہلا حصہ ہی رہے ہیں۔ پورا ایک دن بھی نہیں رہے۔ مثال کے لیے اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیں۔

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ ①

تفسیر سورۃ عبس

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورہ نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین میں سے ایک بڑا آدمی بیٹھا تھا کہ ابن ام مکتوم آئے اور کچھ مسائل پوچھنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور توجہ اس دوسرے کی طرف رکھی اس پر یہ سورہ اتری۔ (ترمذی، تفسیر سورہ عبس) البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ یہ مشرک ابی بن خلف تھا اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ سورہ اترنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم کا اکرام (عزت) کیا کرتے تھے (مسند ابی یعلی جزء ٥ ص ٤٣٢) سند صحیح ہے۔

صاحب احسن التفاسیر نے لکھا ہے کہ جن روایات میں ابی بن خلف کی بجائے ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ وغیرہ کا نام لکھا ہے ان کی سند صحیح نہیں۔

عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ مکی، قرشی، مہاجرین اولین سے ہیں۔ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنے اکثر غزوات میں مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا کرتے تھے۔

آیت ① فائدہ 1 ﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ﴾ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا

اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ﴿۲﴾ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤى ۙ﴿۳﴾ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿۴﴾

کہ اس کے پاس اندھا آیا۔ ② اور تجھے کیا چیز معلوم کرواتی ہے شاید وہ پاکیزگی حاصل کرلے۔ ③ یا نصیحت حاصل کرے تو وہ نصیحت اسے فائدہ دے۔ ④

اگرچہ بعد میں ﴿وَمَا يُدْرِيكَ﴾ سے مخاطب فرما لیا اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نابینا صحابی سے بے توجہی کی تو اللہ تعالیٰ نے بطور عتاب آپ کے خطاب سے بے توجہی فرمائی۔ موضح القرآن میں ہے: ''یہ کلام گویا اوروں کے پاس گلہ ہے رسول کا۔ آگے رسول کو خطاب فرمایا'' بعض اہل علم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اکرام کی وجہ سے آپ کو مخاطب کرکے اظہار ناراضگی نہیں فرمایا۔

فائدہ ﴿2﴾ بعض حضرات نے تیوری چڑھانے والا اس مشرک کو قرار دیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا مگر اس کے بعد آنے والی آیات میں صاف رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا: ﴿فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى﴾ یعنی آپ اس آنے والے (نابینا) سے بے توجہی کرتے ہیں۔ اس لیے مذکورہ تفسیر درست نہیں۔

آیت ② (اس لیے تیوری چڑھائی) کہ اس کے پاس نابینا آیا، حالانکہ نابینا تو زیادہ لطف و کرم کا مستحق تھا، پھر اگر اس کے دین کی بات پوچھنے سے کسی چودھری کے ساتھ کلام قطع ہوا ہے جس کے اسلام لانے کی آپ کو امید تھی اور اس وجہ سے تیوری پڑی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ وہ تو نابینا ہے۔ اسے کیا پتا کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟

آیت ③، ④ آپ نے جو یہ سمجھا کہ یہ نابینا تو مسلمان ہی ہے کسی اور وقت مسئلہ پوچھ لے گا مجھے کافر کو مسلمان بنانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تو یہ بات اگرچہ ایک حد تک درست ہے، مگر آپ کو اس بات کا خیال بھی ضروری تھا کہ وہ کافر تو آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے پر تیار ہی نہیں۔ خوفناک بیماری میں مبتلا شخص کا علاج مقدم ہونا چاہیے مگر وہ دوا لینے پر آمادہ ہی نہ ہو تو اس کی امید میں آپ اپنے ساتھیوں سے کیوں بے توجہی کریں جو دوائے دل کے طالب

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ﴿٥﴾ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ﴿٦﴾ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ ﴿٨﴾ وَهُوَ يَخْشَىٰ ﴿٩﴾ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ﴿١٠﴾ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿١٢﴾ فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾

لیکن جو بے پرواہو گیا۔⑤ سوتو اس کے پیچھے پڑتا ہے۔⑥ حالانکہ تجھ پر (کوئی ذمہ داری) نہیں کہ وہ پاک نہیں ہوتا۔⑦ اور لیکن جو کوشش کرتا ہوا تیرے پاس آیا۔⑧ اور وہ ڈر رہا ہے۔⑨ تو تو اس سے بے توجہی کرتا ہے۔⑩ ایسا ہرگز نہیں چاہیے یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے۔⑪ تو جو چاہے اسے قبول کر لے۔⑫ ایسے صحیفوں میں ہے جن کی عزت کی جاتی ہے۔⑬ جو بلند کیے ہوئے، پاک کیے ہوئے ہیں۔⑭

ہیں کہ آپ توجہ فرمائیں تو وہ جہل اور گناہ سے خوب پاک صاف ہو جائیں ﴿يَزَّكَّىٰ﴾ میں مبالغہ ہے، یا آپ کی نصیحت سے انھیں نفع حاصل ہو جائے۔

آیت⑤ تا⑩ جسے اپنی دولت اور سرداری کی وجہ سے آپ کی پرواہ ہی نہیں آپ اس کے پیچھے پڑ رہے ہیں حالانکہ اگر وہ کفر کی نجاست سے پاک نہیں ہوتا تو آپ پر کچھ الزام نہیں اور جو کوشش کر کے آیا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے تو آپ اس سے بے توجہی کرتے ہیں، حالانکہ آپ کی توجہ کا اصل حقدار وہ ہے جو طلب رکھتا ہے گو نادار ہے، وہ نہیں جو بے پروا ہے خواہ سرمایہ دار ہے۔

آیت⑪، ⑫ ﴿كَلَّا﴾ ہرگز نہیں، یعنی جو ہوا سو ہوا آئندہ ہرگز اس طرح نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قرآن تو ایک نصیحت ہے جو ہر خاص و عام کے لیے ہے اس میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جانی چاہیے، پھر جو چاہے نصیحت قبول کر لے اس کا اپنا فائدہ ہے۔ کوئی متکبر اگر نصیحت کے باوجود قبول نہیں کرتا تو آپ کو بھی قبول کرنے والوں کو چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔

آیت⑬، ⑭ ان آیات میں قرآن مجید کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ یہ ایسے اوراق میں لکھا

بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝

ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ ⑮ جو معزز ہیں، نیک ہیں۔ ⑯

ہوا ہے جن کی عزت کی جاتی ہے، جو بلند شان والے اور پاک ہیں۔ اس سے قرآن مجید کے وہ اوراق مراد ہیں جن میں سے فرشتوں نے لوح محفوظ سے نقل کر کے لکھا۔ وہ بھی، جن میں قرآن کے کاتب صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھا، اور وہ بھی، جن میں ان سے نقل کر کے لکھا گیا اور قیامت تک لکھا جائے گا۔ قرآن مجید کی جس طرح تکریم کی جاتی ہے اور جس طرح یہ شیاطین اور ملحدوں کی دخل اندازی سے محفوظ، ہر قسم کی تحریف اور رد و بدل سے مامون اور ہر قسم کے خلافِ عقل اور خلافِ حیا مضامین سے مطہر ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ اس کی ان خصوصیات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کا موازنہ دوسری آسمانی یا غیر آسمانی کتابوں سے کیا جائے۔ ہمیں بھی قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تکریم کرنی چاہیے۔ اسے اٹھانے میں، رکھنے میں، تلاوت کرتے وقت، غرض ہر موقع پر اس کا بے حد ادب ملحوظ رکھنا چاہیے اس کی بات آ جائے تو پھر کسی کی بات اس پر مقدم نہیں کرنی چاہیے۔

آیت ⑮، ⑯ فائدہ 1 ﴿سَفَرَةٍ﴾ سافر کی جمع ہے ”لکھنے والا“۔ ”سِفْرٌ“ کتاب، جمع ”أَسْفَارٌ“ فرمایا: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ (الجمعة : ۵) ”(بے عمل یہود کی مثال) گدھے کی طرح ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہو“۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید لکھنے والوں کی تعریف فرمائی ہے۔ خواہ وہ فرشتے ہوں یا کاتبین وحی، صحابہ ہوں یا دوسرے، فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں بہت عزت والے اور نہایت نیک ہیں۔ اس طرح کتابت کے علاوہ اس کا پڑھنا پڑھانا بھی سب سے بہتر اور نیک ہونے کی دلیل ہے: وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ ”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔“ (بخاری باب فضائل القرآن حدیث ۵۰۲۷)

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَكۡفَرَهٗ ؕ﴿۱۷﴾ مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ ؕ﴿۱۸﴾ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ﴿۱۹﴾

مارا جائے انسان! وہ کس قدر ناشکرا ہے۔ ⑰ اس نے اسے کس چیز سے پیدا کیا۔ ⑱ ایک قطرے سے، اس نے اسے پیدا کیا، پس اس کا اندازہ مقرر کیا۔ ⑲

فائدہ ② **سافر،** سفارت سے بھی مشتق ہوسکتا ہے **سفرۃ** سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے درمیان سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کے پاس وحی الٰہی لے کر آتے ہیں۔

آیت ⑰ فائدہ ① پچھلی آیات میں ان متکبر لوگوں کا ذکر گزرا ہے جو حق بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ اب انہی کافروں پر بد دعا کی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ﴾ ’’انسان مارا جائے‘‘ یہ سخت سے سخت بد دعا ہے جو کسی کے لیے کی جاسکتی ہے، کیونکہ دنیا میں سب سے آخری سزا یہ ہے کہ کسی کو ختم ہی کر دیا جائے۔ (زمخشری)

فائدہ ② سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو بد دعا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تو اس طرح کیوں فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ یہ عرب کے اسلوب پر فرمایا ہے، جو ان الفاظ میں بد دعا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی نعمتوں کے باوجود یہ انسان جس طرح ناشکری کر رہا ہے اس پر کوئی بھی غور کرے گا تو اس کے منہ سے یہ بد دعا نکلے گی۔

فائدہ ③ ﴿مَاۤ اَكۡفَرَهٗ﴾ کا معنیٰ ہے وہ کس قدر ناشکرا ہے؟ دوسرا معنیٰ ہے: (اتنی نعمتوں کے باوجود) وہ کون سی چیز ہے جس نے اسے ناشکرا بنا دیا ہے؟ (ابن جریر)

آیت ⑱، ⑲ یعنی اس شخص کو تکبر اور ناشکری کس طرح زیب دیتی ہے جسے اس کے بنانے والے نے منی کے ایک حقیر قطرے سے پیدا فرمایا، پیدا کرنے کے دوران اس کی ہر چیز کا اندازہ مقرر فرمایا کہ اتنی مدت نطفہ رہے گا، پھر علقہ، پھر مضغہ بے روح، پھر جاندار، خوبصورت انسان بنے گا۔ پھر اس کی ہر چیز اندازے کے ساتھ بنائی، کوئی چیز بے ڈھب نہیں۔ پھر ماں کے شکم ہی میں وہ سب کچھ فرشتے کو لکھوا دیا جو اس نے زندگی بھر کرنا تھا۔ ’’قَدَّرَهٗ‘‘ میں تینوں چیزیں شامل ہیں۔

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ﴿٢١﴾ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ ﴿٢٢﴾

پھراس کے لیے راستہ آسان کر دیا۔ (۲۰) پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا۔ (۲۱) پھر جب چاہے گا اسے اٹھائے گا۔ (۲۲)

آیت (۲۰) پھراس کے لیے راستہ آسان کر دیا۔اس کے تین معنے ہو سکتے ہیں، پہلا یہ کہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ آسان کر دیا ورنہ ان تنگ ہڈیوں کے حصار سے نکل ہی نہ سکتا اور وہیں خود بھی مر جاتا، ماں کی موت کا بھی باعث بنتا، دوسرا یہ کہ خیر و شر میں سے جس راستے پر چلنا چاہے وہی اس کے لیے آسان کر دیا۔تیسرا یہ کہ صحیح راستے کی پہچان اس کے لیے آسان کر دی جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے پر ایمان لا سکتا ہے۔تینوں معنے درست ہیں مگر ﴿مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ﴾ کی مناسبت سے پہلا معنیٰ زیادہ صحیح ہے۔(التسہیل)

آیت (۲۱) پھر اسے موت دی جو آخرت کی مصلحت کے تحت ضروری تھی، پھر اسے قبر میں رکھوایا اگر وہ یہ احسان نہ کرتا تو یہ جانوروں کی طرح زمین پر پڑا رہتا، متعفن ہو کر اللہ کی مخلوق کے لیے باعث آزار بنتا۔اس کی بے حرمتی ہوتی، بے پردہ ہوتا، درندے نوچتے۔"قَبَرَهُ" قبر میں رکھا۔ ﴿أَقْبَرَهُ﴾ قبر میں رکھوایا۔کوئی جل جائے، غرق ہو جائے یا اسے درندے کھا جائیں تو اس کے اجزا جہاں بھی ہیں وہ اس کے لیے قبر ہے۔اگر کسی کو دفن نہ کیا جا سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے قبر نہیں ملی۔

آیت (۲۲) ان تمام قدرتوں کو دیکھ کر کیا یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا میں آدمی جو بھی کام کرتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی انجام ضرور سوچتا ہے تو پروردگار نے اتنا بڑا سلسلہ کیا اس لیے پیدا فرمایا ہے کہ کوئی اس اکیلے کی پرستش کرے، کوئی اس کی نعمتوں کو بھول کر بتوں کی پرستش کرتا رہے، کوئی ظلم کرے یا کسی پر ظلم ہو، مرنے کے بعد سب برابر ہو جائیں، نہ اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کر کے باز پرس فرمائے، نہ کسی کو اس کے عمل کا بدلہ ملے، نہیں، اللہ کے بارے میں یہ سوچنا ہی بے ادبی اور کفران نعمت ہے۔ان آیات میں اس بے ادبی پر اللہ تعالیٰ نے ﴿قُتِلَ

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝
ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝

ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا۔ ﴿۲۳﴾ تو انسان کو لازم ہے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے۔ ﴿۲۴﴾ کہ ہم نے پانی خوب اچھی طرح برسایا۔ ﴿۲۵﴾ پھر ہم نے زمین کو ایک عجیب طریقے سے پھاڑا۔ ﴿۲۶﴾

الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴾ کہہ کر خفگی کا اظہار فرمایا۔ سورہ مومنون میں فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ ﴾ (المومنون : ۱۱۵، ۱۱۶) ”تو کیا تم نے سمجھ لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے پس اللہ بہت بلند ہے جو سچا بادشاہ ہے۔“

آیت ﴿۲۳﴾ ﴿ كَلَّا ﴾ ”ہرگز نہیں“ ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ کافر انسان جو سمجھتا ہے کہ اس کے مال و جان پر اللہ کا جو حق تھا وہ اس نے ادا کر دیا ہے، یہ ہرگز درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان نے بھی ابھی تک وہ فرائض ہی پورے ادا نہیں کیے جن کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا۔ حق کا ادا کرنا تو بہت دور ہے۔ ”لَمْ يَقْضِ“ پورا نہیں کیا۔ ”لَمَّا يَقْضِ“ ابھی تک پورا نہیں کیا۔ مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا، کوئی بھی شخص وہ کام پورا نہیں کرتا جس کا اسے حکم دیا گیا ہے (کمی رہ ہی جاتی ہے)۔ (بخاری، تفسیر، سورہ عبس)

آیت ﴿۲۴﴾، ﴿۲۵﴾ پہلے آیت ۱۷ سے ۲۲ تک ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو انسان کی پیدائش اور اس کی ذات سے تعلق رکھتی تھیں۔ اب ان نعمتوں کا ذکر ہے جو اس کی ذات سے تو تعلق نہیں رکھتیں مگر ان کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ فرمایا اپنی قریب ترین چیز کھانے کو ہی دیکھ لو کہ اس کی تیاری کے لیے ہم نے کائنات کی کتنی قوتوں کو مصروف کار کر رکھا ہے۔ ﴿ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴾ مصدر کے ساتھ فعل کی تاکید فرمائی ترجمہ میں اس تاکید کو ”خوب اچھی طرح“ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

آیت ﴿۲۶﴾ ﴿ شَقًّا ﴾ ”ایک قسم کا پھاڑنا“ یعنی زمین کو ہم نے عجیب طریقے سے پھاڑا۔ دانے

فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ وَّحَدَآىِٕقَ غُلْبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ

پھر ہم نے اس میں اگایا اناج۔ ۲۷ اور انگور اور ترکاری۔ ۲۸ اور زیتون اور کھجور کے درخت۔ ۲۹ اور گھنے باغات۔ ۳۰ اور پھل اور چارا۔ ۳۱ تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے زندگی کا سامان۔ ۳۲

سے نمودار ہونے والی کونپل خود کبھی زمین سے باہر نہ نکل سکتی تھی۔ زمین میں ضرورت کے مطابق نرمی ونمی اور بیج میں یہ طاقت ہم نے رکھی کہ وہ زمین پھاڑ کر باہر نکل آیا۔

آیت ۲۸ ﴿ قَضْبًا ﴾ قضب (باب ضرب) "کاٹنا" مصدر بمعنی اسم مفعول، یعنی زمین کی وہ پیداوار جو سال میں کئی مرتبہ کاٹی جاتی ہے مراد ترکاری ہے وہ چارے بھی اس میں آ جاتے ہیں جو بار بار کاٹے جاتے ہیں۔

آیت ۲۹ ﴿ نَخْلًا ﴾ "کھجور کے درخت" کھجور کے پھل کے لیے دوسرے الفاظ ہیں۔ مثلاً تمر وغیرہ۔

آیت ۳۰ ﴿ حَدَآىِٕقَ ﴾ حَدِيْقَةٌ کی جمع ہے، پھل دار درختوں کا باغ جس کے گرد دیوار ہو۔ حَدَقَ (باب ضرب) گھیرنا۔ ﴿ غُلْبًا ﴾ اَغْلَبُ اور غَلْبَآءُ کی جمع ہے غَلِبَ يَغْلَبُ (باب سمع) موٹی گردن والا ہونا۔ مراد گھنے باغ۔

آیت ۳۱ ﴿ اَبًّا ﴾ زمین سے اگنے والی وہ نباتات جسے جانور کھاتے ہیں، لوگ نہیں کھاتے۔ [طبری عن ابن عباس وغیرہ]

اَبَّ (باب نصر) قصد کرنا۔ مصدر بمعنی اسم مفعول یعنی "قصد کیا ہوا" کیونکہ جانور اس کی طرف لپکتے ہیں۔

آیت ۳۲ کائنات کا یہ عظیم الشان سلسلہ اور یہ تمام چیزیں تمھاری اور تمھارے ہی کام آنے والے جانوروں کی زندگی کے سامان کے لیے بنائی گئی ہیں، اب اپنے کفران نعمت کو دیکھو کہ

فَإِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝٣٣ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝٣٤ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝٣٥ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝٣٦

پس جب کانوں کو بہرا کرنے والی (قیامت) آجائے گی۔ ﴿۳۳﴾ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے۔ ﴿۳۴﴾ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔ ﴿۳۵﴾ اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ﴿۳۶﴾

میں تمھاری خاطر یہ سب کچھ بنا سکتا ہوں مگر تمھارے خیال میں تمھیں مرنے کے بعد زندہ نہیں کرسکتا۔نہیں میں تمھیں ضرور دوبارہ زندہ کروں گا۔آگے قیامت کا ذکر فرمایا۔

آیت ﴿۳۳﴾ ﴿الصَّآخَّةُ﴾ یعنی کانوں کو بہرا کر دینے والی نفخ صور کی ہولناک آواز جس سے قیامت قائم ہو جائے گی۔

آیت ﴿۳۴﴾ تا ﴿۳۶﴾ فائدہ 1 اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن آدمی کے ان لوگوں سے بھاگنے کا ذکر فرمایا جن سے محبت ہوتی ہے اور ترتیب میں محبت کے درجات کو ملحوظ رکھا پہلے اس کا ذکر فرمایا جس کے ساتھ کم محبت ہوتی ہے بڑھتے بڑھتے آخر میں بیٹوں کا ذکر فرمایا جن کے ساتھ مقدم الذکر تمام لوگوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے (التسھیل) جب اپنے پیاروں سے بھاگے گا تو دوسروں کا کیا ذکر؟

فائدہ 2 سورہ معارج میں اس کے برعکس بیٹوں سے شروع کیا اور فرمایا کہ مجرم کی دلی خواہش ہوگی کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے پناہ دینے والے قبیلے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو فدیہ میں دے کر اپنی جان بچالے۔
(المعارج : ۱۰ تا ۱٤)

فائدہ 3 بھاگنے کی وجہ وقوع قیامت کی وجہ سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ اور بدحواسی ہے، حتّٰی کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر باقی انبیاء بھی نفسی نفسی کہیں گے،اس کے علاوہ یہ خوف ہوگا کہ رشتہ دار کوئی حق نہ مانگ لے۔اس کے خلاف کوئی شہادت نہ پیش کر دے۔ظلم کے بدلے میں اس کے گناہ نہ اٹھانے پڑ جائیں، وغیرہ۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی۔ ﴿۳۷﴾ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے۔ ﴿۳۸﴾ ہنستے ہوئے، بہت خوش ﴿۳۹﴾ اور کچھ چہرے، اس دن ان پر ایک غبار ہوگا۔ ﴿۴۰﴾ ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔ ﴿۴۱﴾ یہی ہیں جو کافر ہیں، نافرمان ہیں۔ ﴿۴۲﴾

آیت ﴿۳۷﴾ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم ننگے پاؤں، ننگے جسم، بغیر ختنہ کی حالت میں اٹھائے جاؤ گے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے کہا: پھر تو مرد عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: معاملہ اس سے سخت ہوگا کہ یہ بات ان کی سوچ میں بھی آئے۔ (صحيح بخاری، کتاب الرقاق۔ باب الحشر) ترمذی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ آپ نے اس موقع پر یہ آیت پڑھی: ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ ''اس دن ان میں سے ہر آدمی کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے بے پروا بنا دے گی۔''

آیت ﴿۳۸﴾ چہروں کی یہ روشنی اور خوشی اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیے جانے کے بعد ہوگی۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝ وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا﴾ (انشقت : ۹) ''تو اس وقت جس شخص کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے گھر والوں کی طرف واپس آئے گا''۔

آیت ﴿۴۰﴾، ﴿۴۱﴾ کافر اور فاجر لوگوں کے چہروں پر سیاہی کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس آیت ۲۷۔

رکوعہا ۱ | (۸۱) سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ (۷) | اٰیاتہا ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ ①

تفسیر سورۃ التکویر

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَاَنَّهٗ رَاْيُ عَيْنٍ فَلْيَقْرَاْ ﴿ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴾ وَ ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴾ وَ ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ (مسند احمد : ۲۷/۲ ، وھکذاالترمذی ، التفسیر: سورة اذا الشمس کورت۔) سند صحیح ہے۔: ''جسے یہ بات پسند ہو کہ وہ قیامت کے دن کی طرف ایسے دیکھے جیسے آنکھ سے دیکھتا ہے تو وہ ''اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ'' اور ''اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ'' اور ''اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ'' پڑھ لے۔''

اس سورہ کی ابتدائی آیات میں قیامت کو واقع ہونے والی بارہ چیزیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی چھ چیزیں پہلے نفخہ کے وقت ہوں گی، آخری چھ چیزیں دوسرے نفخہ کے وقت۔ ان کے بعد تیرھویں آیت میں وہ بات بیان فرمائی جو ان سب چیزوں کے ذکر سے مقصود ہے یعنی اس وقت ہر جان جو کچھ لے کر آئی ہے اسے جان لے گی۔

آیت ① ﴿ كُوِّرَتْ ﴾ كَوْرُ الْعِمَامَةِ وَ تَكْوِيْرُهَا پگڑی لپیٹنا، تَكْوِيْرُ الْمَتَاعِ سامان جمع کر کے باندھ دینا۔ (خلاصہ قاموس) ﴿ كُوِّرَتْ ﴾ یعنی اتنی وسعت والے سورج، اس کی شعاؤں اور روشنی کو لپیٹ دیا جائے گا اور وہ بالکل بے نور ہو جائے گا۔ چاند کا بھی یہی

وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝

اور جب ستارے بکھر کر گر جائیں گے۔② اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔③ اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی۔④ اور جب جنگلی جانور اکٹھے کر دیے جائیں گے۔⑤

حال ہوگا، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكَوَّرَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))''سورج اور چاند قیامت کے دن لپیٹ دیے جائیں گے۔'' (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر)

آیت ② ﴿ اِنْكَدَرَتْ ﴾ طبری نے اس کے دو معانی نقل فرمائے ہیں پہلا (تَنَاثَرَتْ) بکھر کر گر جائیں گے اور دوسرا (تَغَيَّرَتْ) یعنی متغیر ہو جائیں گے۔ کدورت صفائی کی ضد ہے۔ دونوں معانی ملحوظ رکھے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ستارے بکھر کر گر جائیں گے، ان کی روشنی اور صفائی ختم ہو جائے گی اور وہ بے نور ہو جائیں گے۔

آیت ③ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو زمین کے اندر گاڑ رکھا ہے اور زمین میں وہ کشش رکھی ہے جو انھیں باندھ کر رکھے ہوئے ہے۔ اللہ کے حکم سے قیامت کے دن وہ کشش ختم ہو جائے گی اور یہ جامد پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ذرہ ذرہ ہو کر بادلوں کی طرح چل پڑیں گے حتیٰ کہ سراب کی طرح ہو جائیں گے: ﴿ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴾ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ النبا آیت ۲۰۔

آیت ④ ﴿ اَلْعِشَارُ ﴾ ''عُشَرَاءُ'' کی جمع ہے۔ دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں جو عربوں کے ہاں نہایت عزیز ہوتی تھیں۔ صور پھونکے جانے کی ابتدا میں جو گھبراہٹ پیدا ہوگی اس میں اتنی نفیس اور عزیز چیزوں کو بھی کوئی نہیں سنبھالے گا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔

آیت ⑤ جنگلی جانور جو ایک دوسرے سے بھاگتے ہیں اس گھبراہٹ میں جمع ہو جائیں گے، کوئی کسی کو کچھ نہ کہے گا۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۪ۙ﴿۷﴾ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۪ۙ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۚ﴿۹﴾

اور جب سمندر بھڑ کائے جائیں گے۔⑥ اور جب جانیں ملائی جائیں گی۔⑦ اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔⑧ کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی؟ ⑨

آیت ⑥ ﴿ سُجِّرَتْ ﴾ سَجَرَ التَّنُّوْرَ اس نے تنور جلایا، سَجَّرَ میں مبالغہ ہے خوب بھڑکایا۔ سمندروں کے بھڑکائے جانے کی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زمین کے نیچے جو بے پناہ حرارت اور آگ ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کے بیدار ہونے کی صورت میں کبھی کبھی ظاہر ہوتی رہتی ہے، وہ اللہ کے حکم سے سمندروں کو بھڑکا کر بھاپ بنا کر اڑا دے گی۔ پھر پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی ختم ہو کر زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی اور یہ بھی کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسوں کا مرکب ہے جن سے ایک جلانے والی اور دوسری جلنے والی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کی عجیب قدرت ہے کہ ان دونوں کو ملا کر آگ بجھانے والا پانی بنا دیا ہے۔ قیامت کے وقت اللہ کے حکم سے ان دونوں کا ملاپ ختم ہو جائے گا اور وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ کر بھڑکانے اور بھڑکنے لگیں گی جس سے سمندروں کا یہ بے حساب پانی چشم زدن میں اڑ جائے گا، بہرحال اللہ کا حکم ہوگا تو سمندر آگ سے بھڑکنے لگیں گے۔

آیت ⑦ یہاں سے دوسرے نفخہ کے بعد کے حالات ہیں۔ ﴿ اَلنُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴾ ''جانیں ملائی جائیں گی'' اس کی دو تفسیریں ہیں پہلی یہ کہ جانیں جسموں کے ساتھ ملائی جائیں گی تو سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ دوسری یہ کہ جانوں کی قسمیں بنا دی جائیں گی، نیکوں کو نیکوں کے ساتھ اور بروں کو بروں کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَ مَا كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ۙ﴾ (الصافات : ۲۲) حکم ہوگا کہ ''جمع کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم شکلوں کو اور ان کو جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے''۔ دوسری تفسیر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے۔ (صحیح بخاری۔ تفسیر اذا الشمس کورت)

آیت ⑧، ⑨ فائدہ ① ﴿ اَلْمَوْءٗدَةُ ﴾ وہ لڑکی جسے زندہ دفن کر دیا گیا ہو۔ جاہلیت میں بعض

عرب عار سے بچنے کے لیے لڑکیاں زندہ دفن کر دیتے تھے کہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں یا کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ بعض فقر کی وجہ سے ایسا کرتے تھے اور بعض تو فقر کی وجہ سے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ہندوستان کے راجپوتوں اور بعض دوسری قوموں میں بھی یہ رواج رہا ہے، آج کل برتھ کنٹرول کے نام سے حکومتیں منظم طریقے سے یہ کام کر رہی ہیں۔ چین میں شہروں میں ایک، اور دیہات میں صرف دو بچوں کی اجازت ہے، چونکہ اکثر لوگوں کو لڑکے مرغوب ہوتے ہیں، لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں کئی مائیں دودھ ہی نہیں پلاتیں اور اس طرح قتل کا ارتکاب کرتی ہیں۔ اگر اجازت سے زائد بچہ پیدا ہو جائے تو نرسیں اس کا کام تمام کر دیتی ہیں۔ مسلمان ملکوں کے بعض حکمران بھی کفار کی ترغیب سے رزق کے وسائل کی کمی (املاق) کا بہانہ بنا کر تحدید نسل بلکہ مسلمانوں کی نسل کشی کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور اس کے لیے ایسے طریقے پھیلا رہے ہیں جن سے بچہ پیدا ہونے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً جرثومے اور بیضے کی رگ ہی کاٹ دینا اور دوسرے ناقابل بیان طریقے اور یہ کام اس رسول ﷺ کی امت کے لوگ کر رہے ہیں جس نے عزل (جماع کرتے ہوئے انزال کے وقت بیوی سے علیحدہ ہو جانے) کو بھی ناپسند فرمایا، حالانکہ عزل کی صورت میں حمل کا امکان رہتا ہے، کیونکہ منی کے جرثومے انزال سے پہلے بھی مذی کے ذریعے رحم میں داخل ہو سکتے ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ عزل کرو یا نہ کرو جو بچہ پیدا ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ اس کے باوجود ایک مرتبہ جب لوگوں نے آپ سے عزل کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((ذٰلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ وَهِيَ وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ)) یعنی یہ پوشیدہ طریقے کا زندہ دفن کرنا ہے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وعید کے تحت آتا ہے کہ جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا۔ (صحیح مسلم کتاب النکاح ، باب جواز الغیلة و کراهة العزل) مقصد یہ ہے کہ عزل میں امکان حمل کے باوجود اس کے تسلسل کا نتیجہ نسل انسانی کی ہلاکت ہے۔ اس حدیث سے منع حمل کے دوسرے ظالمانہ

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۝ فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝

اور جب اعمال نامے پھیلائے جائیں گے۔⑩ اور جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی۔⑪ اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی۔⑫ اور جب جنت قریب لائی جائے گی۔⑬ ہر جان جو کچھ لے کر آئی اسے جان لے گی۔⑭ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو پیچھے ہٹنے والے ہیں۔⑮ جو چلنے والے ہیں، چھپ جانے والے ہیں!⑯

طریقوں کی وعید خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے۔

آیت⑩ اعمالنامے جو بند تھے، پھیلا کر سامنے کر دیے جائیں گے تا کہ ہر عمل کرنے والا اپنے عمل خود پڑھ لے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ لوگوں میں ان کے اعمال نامے دائیں یا بائیں ہاتھوں میں پھیلا دیے جائیں گے۔

آیت⑪ عالم بالا پر آسمان کا پردہ جو کھال کی طرح چڑھا ہوا ہے اتار کر تہہ کر دیا جائے گا (طبری) ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ﴾ (الانبياء : ۱۰۴) ''جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔'' کھال اتار دیے جانے کے بعد عالم بالا سب کے سامنے آشکار ہو جائے گا۔

آیت⑫، ⑬ یہ دونوں چیزیں میدان محشر میں ہوں گی۔ (دیکھیے والفجر: ۲۳۔ اور الشعراء: ۹۰، ۹۱)

آیت⑭ شروع سورہ سے یہاں تک کل بارہ چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ جب یہ بارہ چیزیں ہو جائیں گی تو کیا ہوگا؟ اس کا جواب ہے۔ عَلِمَتْ الخ ﴿نَفْسٌ﴾ کی تنکیر عموم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''ہر جان'' کیا گیا ہے۔

آیت⑮، ⑯ ﴿الْخُنَّسِ﴾ خَنَسَ (باب ضرب) ''پیچھے ہٹنا'' سے خانس کی جمع ہے۔ بروزن ''رُكَّعٌ'' خَنَّاسٌ بھی اسی سے ہے۔ اسی طرح ﴿الْكُنَّسِ﴾ كَانِسٌ کی جمع ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ﴿۱۹﴾

اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے! ﴿۱۷﴾ اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے! ﴿۱۸﴾ یقیناً یہ ایک ایسے پیغام پہنچانے والے کی زبان سے نکلا ہوا ہے جو بہت معزز ہے۔ ﴿۱۹﴾

’’كِنَاسٌ‘‘ ہرن وغیرہ کی درختوں میں بنائی ہوئی جگہ جہاں وہ چھپ جاتے ہیں۔ كَنَسَ (باب ضرب) چھپنے کی جگہ میں داخل ہو گیا، چھپ گیا۔ ﴿الْجَوَارِ﴾ جَرٰى يَجْرِيْ سے جاریۃ کی جمع ہے۔ مراد سورج چاند اور ستارے ہیں۔ انھیں (اَلْخُنَّسُ) ’’پیچھے ہٹنے والے‘‘ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ سب مغرب میں غروب ہونے کے بعد پھر پیچھے یعنی مشرق کی طرف آنا شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ مشرق سے دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں۔ اَلْجَوَارِ (چلنے والے) یعنی ان کا کام ہی چلتے رہنا ہے، مغرب سے واپس مشرق کی طرف اور وہاں سے دوبارہ مغرب کی طرف۔ (اَلْكُنَّسُ) (چھپنے والے) یعنی مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

آیت ﴿۱۷﴾، ﴿۱۸﴾ ﴿عَسْعَسَ﴾ آنے اور جانے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یہاں دوسرا معنیٰ زیادہ مناسب ہے۔ ﴿تَنَفَّسَ﴾ سانس لیتے ہوئے چھاتی پھیلتی ہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے کی کیفیت کی نقشہ کشی انسان کے سانس لینے کی کیفیت کے ساتھ کی ہے۔

آیت ﴿۱۹﴾ یہ ان قسموں کا جواب ہے، یعنی امر الٰہی کے پابند یہ سیارے، روزانہ جاتی ہوئی رات اور پھیلتی ہوئی صبح کا یہ مستحکم نظام زبردست شہادت ہے کہ یہ وحی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک نہایت ہی معزز اور ان عظیم صفات والا فرشتہ (جبریل) ہی لے کر آیا ہے۔ دن رات، سورج چاند اور ستاروں کے نظام کی طرح یہاں بھی کسی شیطان کا دخل نہیں ہو سکتا۔

(خلاصہ آیات ۱۹ تا ۲۹) اس آیت میں رسول سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں کیونکہ مشرکین مکہ کبھی کہتے: ﴿اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ﴾ (النحل: ۱۰۳) ’’اسے کوئی بشر ہی سکھاتا ہے‘‘۔ کبھی کہتے: ﴿اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ﴾ (سبا: ۸) ’’کیا اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا یہ

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾

بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے۔⑳ وہاں اس کی بات مانی ہوئی ہے، امانت دار ہے۔ ㉑ اور تمھارا ساتھی کوئی دیوانہ نہیں ہے۔㉒ اور بلاشبہ اس نے اس (جبریل) کو (آسمان کے) روشن کنارے پر دیکھا ہے۔㉓

دیوانہ ہے؟'' اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کے قول کے جھٹلانے کو یہ آیتیں نازل فرمائیں اور فرمایا کہ نہ اللہ کے رسول مجنون اور دیوانے ہیں، نہ انھوں نے اپنی طرف سے اس قرآن کو بنایا ہے، نہ کسی انسان نے انھیں یہ قرآن سکھایا ہے۔ یہ ایسا کلام نہیں ہے جس طرح شیاطین چوری سے آسمان کی کچھ باتیں سن کر کاہنوں سے کہہ دیتے ہیں بلکہ پیغام کے طور پر اللہ کی طرف سے ایک صاحب قوت، معتبر، امانتدار فرشتہ نے یہ قرآن اللہ کے نبی کو پہنچایا ہے۔

(احسن التفاسیر)

آیت⑳ ﴿ذِيْ قُوَّةٍ﴾ کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی بڑی قوت والا۔ سورۃ النجم آیت ۵، ۶، میں جبریل علیہ السلام کا یہ وصف: ﴿شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ﴾ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔
فائدہ ① جبریل علیہ السلام کی قوت کا ذکر یہاں اس لیے فرمایا ہے کہ جبریل علیہ السلام کی قوت کے سبب سے شیطان ان سے بھاگتا ہے۔ جیسا کہ بدر میں انھیں دیکھ کر بھاگا تھا (الانفال: ۴۸) مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام کی قوت کی وجہ سے ان کی پیغام رسانی میں نہ شیطان کا کچھ دخل ہے، نہ ان کی امانتداری کے سبب اس پیغام رسانی میں کسی خیانت کا دخل۔ اس لیے کسی شک وشبہ کے بغیر یہ اللہ کا کلام ہے۔ (خلاصه احسن التفاسیر)
آیت㉑ (وہاں اس کی بات مانی ہوئی ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں میں، جیسا کہ حدیث معراج میں ہے کہ جبریل علیہ السلام کے کہنے پر آسمان کے دروازے کھلے۔
آیت㉓ روشن کنارے سے مراد آسمان کا مشرقی کنارا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿٢٥﴾ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ﴿٢٦﴾
إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ ﴿٢٨﴾

اور وہ غیب کی باتوں پر ہرگز بخل کرنے والا نہیں۔ ﴿۲۴﴾ اور وہ ہرگز کسی مردود شیطان کا کلام نہیں۔ ﴿۲۵﴾ پھر تم کہاں جا رہے ہو؟ ﴿۲۶﴾ یہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔ ﴿۲۷﴾ اس کے لیے جو تم میں سے چاہتا ہو کہ سیدھا چلے۔ ﴿۲۸﴾

کو ان کی اصل صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک دفعہ زمین پر، دوسری دفعہ آسمان پر (دیکھیے سورۃ النجم آیت ۱۸ تک) یہاں پہلی مرتبہ کا ذکر ہوا ہے آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا، ان کے چھ سو پر تھے اور پورا افق ان سے بھرا ہوا تھا۔ (بخاری، کتاب بدء الخلق حدیث ۳۲۳۲ تا ۳۲۳۵)

آیت ﴿۲۴﴾ ﴿ضَنِينٍ﴾ ”بخیل“، یعنی اللہ تعالیٰ انھیں غیب کی جو بات بتاتا ہے وہ اپنے پاس ہی نہیں رکھ لیتے بلکہ امت تک پہنچا دیتے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جو شخص تمھیں بتائے کہ نبی ﷺ نے آپ پر نازل ہونے والی کوئی بات چھپائی ہے اس نے یقیناً جھوٹ بولا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ﴾ (المائدہ: ٦٧، بخاری، التفسیر باب ٧) ”اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیرے رب سے تیری طرف نازل کیا گیا ہے“۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ مطلب نکالا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب جانتے تھے۔ کیونکہ بخل وہی کر سکتا ہے جس کے پاس کوئی چیز موجود ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے: ﴿قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (النمل: ٦٥) ”اے نبی! کہہ دے، آسمان و زمین میں جو بھی ہے اللہ کے علاوہ کوئی غیب نہیں جانتا“۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو غیب کی جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ لوگوں کو بتانے میں آپ بخل نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو غیب کی کچھ باتیں بتا دی جائیں تو وہ اس سے عالم الغیب نہیں بن جاتا، کیونکہ وہ صرف اتنی بات جانتا ہے زیادہ نہیں ورنہ اگر اس وجہ سے

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ

اور تم نہیں چاہتے مگر اس صورت میں کہ اللہ چاہے جو سب جہانوں کا رب ہے۔ ﴿۲۹﴾

رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیب کی کئی باتیں بتائی ہیں تو امت کو بھی عالم الغیب ماننا پڑے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ بتایا گیا تھا آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق وہ سب کچھ امت کو بتا دیا۔

آیت ﴿۲۹﴾ یعنی تمھارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے اور توفیق دینے پر موقوف ہے۔ (مزید دیکھیے سورة یونس : ۱۰۰، انعام : ۱۱۲، قصص : ۵۶ الدھر : ۳۰)

رکوعہا ۱ | (۸۲) سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ (۸۲) | اٰیاتہا ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ﴿۱﴾ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ﴿۲﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ﴿۳﴾ وَاِذَا الْقُبُوْرُ
بُعْثِرَتْ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۗ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ
الْكَرِيْمِ ۙ﴿۶﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ① اور جب ستارے بکھر کر گر جائیں گے۔ ② اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔ ③ اور جب قبریں الٹ دی جائیں گی۔ ④ ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا۔ ⑤ اے انسان! تجھے تیرے نہایت کرم والے رب کے متعلق کس چیز نے دھوکا دیا۔ ⑥

تفسیر سورۃ الانفطار

آیت③ یہاں فرمایا کہ سمندر پھاڑ دیے جائیں گے، پچھلی سورہ میں فرمایا: بھڑکائے جائیں گے۔ دونوں باتیں حق ہیں۔ پہلے قیامت کے شدید زلزلوں سے ساری زمین جا بجا پھٹ جائے گی۔ سمندر درمیان میں حائل رکاوٹیں ختم ہونے سے ایک ہو جائیں گے، پھر ان میں آگ لگ جائے گی۔

آیت④ دوسرے نفخہ سے قبریں پھٹیں گی اور مردے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔

آیت⑤ جو اچھے یا برے اعمال موت سے پہلے کیے یا جو اچھے یا برے طریقے پیچھے چھوڑ گیا جن کے ثواب و عذاب کا سلسلہ اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہا سب سامنے آ جائیں گے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو عمل شروع عمر میں کیے اور جو آخر عمر میں کیے۔

آیت⑥ اتنی مہربانیوں والے رب کے متعلق دھوکا کھانے اور کفر کرنے کی تو کوئی گنجائش ہی

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۗ كَلَّا بَلْ
تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا
تَفْعَلُوْنَ ۞ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۚ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۚ

وہ جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے درست کیا پھر تجھے برابر کیا۔⑦ جس صورت میں بھی اس نے چاہا تجھے جوڑ دیا۔⑧ ہرگز نہیں، بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو۔⑨ حالانکہ یقیناً تم پر نگہبان مقرر ہیں۔⑩ جو بہت عزت والے ہیں، لکھنے والے ہیں۔⑪ جو تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔⑫ یقیناً نیک لوگ نعمت میں ہوں گے۔⑬ اور یقیناً نافرمان بھڑکتی آگ میں ہوں گے۔⑭

نہ تھی۔

آیت ⑦، ⑧ وہ تجھے بے ڈھب بنا سکتا تھا بندر، خنزیر یا کوئی جانور بھی بنا سکتا تھا۔ اتنی اچھی ترکیب سے جب پہلے بنا دیا تو جزائے اعمال کے لیے دوبارہ کیوں نہیں بنا سکتا۔

آیت ⑨ یعنی دھوکا کھانے کا سبب یہ نہیں کہ تمھیں رب کریم کی مہربانیوں پر بہت اعتماد ہے بلکہ یہ باطل خیال ہے کہ ہمیں نہ دوبارہ زندہ ہونا ہے نہ اعمال کا بدلہ ملنا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تمام بداعمالیوں کا اصل سبب روز جزا کو جھٹلانا ہے اور اسی کو تم جھٹلا رہے ہو۔

آیت ⑩، ⑪ حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں یعنی فرشتے ﴿حَافِظِيْنَ﴾ یعنی کوئی عمل ان کی نگرانی سے باہر نہیں ﴿كِرَامًا﴾ عزت والے اس لیے کہ وہ لکھنے میں کوئی خیانت نہیں کرتے نہ کوئی بات لکھنے سے چھوڑتے ہیں نہ زیادہ لکھتے ہیں۔

آیت ⑫ تمھارا کوئی مخفی سے مخفی کام حتیٰ کہ تمھاری نیتیں اور ارادے بھی ان سے پوشیدہ نہیں لہٰذا تمھارا یہ سمجھنا کہ تمھارے چھپا کر کیے ہوئے گناہ ریکارڈ میں نہیں آئیں گے اور تم ان کی سزا سے بچ جاؤ گے، زبردست نادانی ہے۔ ان فرشتوں کا مزید ذکر سورۃ ق آیت ۱۷، ۱۸ میں دیکھیے۔

آیت ⑬، ⑭ فرشتوں کے تیار کردہ اعمال ناموں کا نتیجہ یہ ہے کہ نیک لوگ نعمت میں اور

يَّصۡلَوۡنَهَا يَوۡمَ الدِّيۡنِ ۝ وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِيۡنَ ۝ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ۝
ثُمَّ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ۝ يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ
يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝

وہ جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے۔⑮ اور وہ اس سے کبھی غائب ہونے والے نہیں ہیں۔⑯ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے۔⑰ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟⑱ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔⑲

نافرمان بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوں گے۔ ﴿ اَلۡاَبۡرَارَ ﴾ بَرٌّ کی جمع ہے۔ وہ شخص جس میں بِرٌّ (نیکی) پائی جائے۔ نیکی کیا ہے؟ اور نیک کون ہے؟ اس کی تفصیل آیت بِرّ میں ملاحظہ فرمائیں سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۷۔ ﴿ اَلۡفُجَّارَ ﴾، فَاجِرٌ کی جمع ہے۔ یہاں مراد کافر ہیں، کیونکہ مومن ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔

آیت ⑮، ⑯ فاجر لوگ قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، کبھی اس سے نہیں نکلیں گے، یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اگرچہ وہ قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوں گے مگر اس سے پہلے قبر میں بھی وہ آگ سے غائب نہیں ہیں، جیسے آل فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ ۟ اَدۡخِلُوۡٓا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ۝ ﴾ (المؤمن: ۴۵، ۴۶) ”اور آل فرعون کو بدترین عذاب نے گھیر لیا جو آگ ہے اس پر صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (کہا جائے گا کہ) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو“۔

آیت ⑰، ⑱ قیامت کی عظمت و اہمیت ذہن میں بٹھانے کے لیے سوال اور پھر تکرار سوال ہے۔

آیت ⑲ دنیا میں بظاہر لوگوں کی کچھ ملکیت بھی ہے اور ایک حد تک نفع و ضرر کا اختیار بھی ہے

مگر قیامت کے دن اللہ کے علاوہ نہ کسی کا اختیار رہے گا نہ ملکیت نہ حکومت۔ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المومن : ۱٦) ''آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟ صرف اللہ کی جو ایک ہے، زبردست ہے''۔ رہ گئی شفاعت تو وہ بھی کسی کے اختیار میں نہیں ہوگی بلکہ صرف وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ ''کون ہے جو اس کے پاس سفارش کرے مگر اس کی اجازت سے۔'' (البقرہ: آیۃ الکرسی اور دیکھیے النبا آیت ۳۸)

رکوعہا ۱ (۸۳) سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ مَكِّيَّةٌ (۸۶) اٰیاتہا ۳۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝

ہلاکت ہے ماپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے۔① وہ لوگ کہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔② اور جب انھیں ماپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔③

تفسیر سورۃ المطففین

آیت ① **التطفیف** ماپ یا تول میں کمی کرنا۔ ماپ تول کے علاوہ کسی بھی معاملے میں لینے دینے کے پیمانے مختلف ہوں تو وہ **تطفیف** ہے۔ **طفیف** بالکل تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں۔ صاع بھرا ہوا ہو مگر پورا بھرنے سے کم ہو تو اس کمی کو طف الصاع کہتے ہیں ہے، چونکہ ماپ تول میں کمی کرنے والا کوئی بڑا مال نہیں چراتا بلکہ تھوڑی سی چیز چراتا ہے، اس لیے اسے مطفف کہتے ہیں۔ یہ فعل کمینگی کی انتہا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اتنی تھوڑی چیز کی چوری کرنے والا شخص بڑا مال اڑانے سے بھی پرہیز کرنے والا نہیں، صرف اپنی کم ہمتی یا پکڑے جانے کے خوف سے اتنی چوری پر صبر کیے بیٹھا ہے، ورنہ اس کی طبیعت کے فاسد ہو جانے اور امانت سے خالی ہو جانے میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل شنیع کا ارتکاب کرنے والوں کو ''ویل'' کی وعید سنائی ہے جس کا معنی ہلاکت ہے آخرت میں ہونے والی ہلاکت کا تو کچھ شمار ہی نہیں کچھ تفصیل اسی سورہ میں آ رہی ہے اگرچہ وہ مکذبین (جھٹلانے والوں) کے لیے ہے مگر یہ فعل بھی آخرت کی تکذیب ہی سے سرزد ہوتا ہے۔ دنیا

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ۙ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ۙ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ؕ

کیا یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ یقیناً وہ اٹھائے جانے والے ہیں۔④ ایک بڑے دن کے لیے۔⑤ جس دن لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے۔⑥

میں اس سے ہونے والی ہلاکت رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی، حدیث لمبی ہے اس کا ایک فقرہ یہ ہے: جو قوم بھی ماپ تول میں کمی کرتی ہے اسے قحط سالیوں، سخت مشقت اور حکمرانوں کے ظلم کے ساتھ پکڑ لیا جاتا ہے۔[ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب العقوبات، شیخ البانی رحمہ اللہ نے حاکم کی سند کی وجہ سے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ دیکھیے الصحیحہ: (۱۰۶)] شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا ایک سبب بھی یہی تھا۔

تنبیہ: ترمذی کی روایت کہ ''ویل جہنم کی ایک وادی ہے الخ''، صحیح نہیں۔ دیکھیے [ضعیف سنن الترمذی ابواب تفسیر القرآن سورۃ الانبیاء حدیث ۳۳۸۹]

آیت④ یعنی اگر وہ سمجھتے کہ ہمیں ایک دن پیش ہو کر حساب دینا ہے تو کبھی ماپ تول میں کمی نہ کرتے۔

آیت⑤، ⑥ (ایک بڑے دن کے لیے) بڑا دن اس لیے کہ اس کی مقدار ہی پچاس ہزار سال ہے۔ دیکھیے المعارج آیت ۴ کی تفسیر، اور اس لیے بھی بڑا ہے کہ پیشی عام عدالت میں بھی گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہے اس دن تو رب العالمین کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے قیامت کے دن سورج مخلوق کے قریب ہو جائے گا یہاں تک کہ ان سے ایک میل کی مقدار کی طرح ہوگا، تو لوگ اپنے اعمال کے اندازے کے مطابق پسینے میں ہوں گے، جو ان میں سے بعض کے ٹخنوں تک ہوگا، بعض کے گھٹنوں تک، بعض کی کمر تک اور بعض کو پسینا لگام کی طرح لگام ڈال لے گا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ منہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ (مسلم: کتاب الجنة ،

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ وَيْلٌ
يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ
مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ہرگز نہیں، یقیناً نافرمان لوگوں کا اعمال نامہ دائمی سخت قید کے دفتر میں ہے۔⑦ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ دائمی سخت قید کا دفتر کیا ہے؟⑧ ایک کتاب ہے واضح لکھی ہوئی۔⑨ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ہلاکت ہے۔⑩ جو جزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔⑪ اور اسے کوئی نہیں جھٹلاتا مگر ہر حد سے نکل جانے والا، سخت گنہگار۔⑫ کہ جب اس کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔⑬

باب فی صفة یوم القیامة ـ حدیث ۷۱۳۵) ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کانوں کے نصف تک پسینا کا ذکر کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی: ﴿ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [صحیح بخاری تفسیر ویل للمطففین]

آیت ⑦ تا ⑪ ﴿ كَلَّآ ﴾ یعنی یہ بات ہرگز نہیں کہ تم جس طرح چاہو اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے ماپ تول میں کمی کرتے رہو اور وہ وقت ہی نہ آئے کہ تم سے اس ظلم کے متعلق باز پرس ہو۔ نہیں بلکہ نافرمان لوگوں کا اعمال نامہ سجین میں ہے۔ ﴿ سِجِّيْنٍ ﴾ سجن سے مبالغہ ہے جس کا معنیٰ قید خانہ ہے۔ قاموس میں ہے **السِّجِّيْنُ الدَّائِمُ الشَّدِيْدُ** یعنی دائمی سخت قید یہ وہ کتاب ہے جس میں ہمیشہ جہنم میں رہنے والوں کے نام اور ان کے عمل محفوظ ہیں (گویا یہ دائمی قید والوں کا رجسٹر ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود سجین کی وضاحت کی ہے ﴿ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴾ کہ وہ ایک واضح لکھی ہوئی کتاب ہے جس میں کوئی کمی بیشی یا رد و بدل نہیں ہو سکتا کہ کوئی نام یا عمل داخل کر دیا جائے یا مٹا دیا جائے۔ ﴿ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ سے معلوم ہوا کہ ماپ تول میں کمی کرنے والے درحقیقت قیامت کے دن پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ ﴿١٤﴾

ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے۔ ⑭

سے ایسا کرتے ہیں۔

آیت ⑭ ﴿كَلَّا﴾ ''ہرگز نہیں'' مطلب یہ ہے کہ اس جھٹلانے والے کے آیات کو جھٹلانے کی وجہ یہ نہیں کہ یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں یا ان کے حق ہونے میں کوئی شبہ ہے بلکہ اس کی بداعمالیاں سیاہ زنگ کی صورت میں اس کے دل پر غالب آ چکی ہیں اسے نہ حق حق نظر آتا ہے نہ باطل باطل۔

فائدہ: مستشرقین اور منکرین حدیث کی طرح پہلے منکرین کا بھی یہی حال تھا کہ اگر قرآن میں کوئی نئی بات آتی تو کہتے: ﴿مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ﴾ (القصص: ٣٦) ''ہم نے تو یہ بات پہلے سنی ہی نہیں'' اور اگر پہلی کتابوں میں موجود ہوتی تو کہتے: یہ وہاں سے سرقہ کیا گیا ہے: ﴿أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ ''یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں'' ﴿قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ﴾ (التوبہ: ٣٠)

﴿رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم﴾ رَكِبَهَا كَمَا يَرْكَبُ الصَّدَأُ وَ غَلَبَهَا (طبری) ''یعنی ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے اور غالب آ گیا ہے جیسے زنگ چڑھ جاتا ہے۔''

﴿رَانَ﴾ کا فاعل ﴿مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ ہے۔ ''یعنی جو کچھ وہ کمایا کرتے زنگ بن کر ان کے دلوں پر چھا گیا ہے۔''

گناہ کا خاصہ ہے کہ اگر بار بار کیا جائے اور توبہ نہ کی جائے تو پورے دل کو گھیر لیتا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ لگ جاتا ہے، جب باز آ جائے اور معافی مانگ لے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کرے تو داغ بڑھا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سیاہ داغ پورے دل پر غالب آ جاتا ہے یہی وہ ''ران'' ہے جو اللہ عزوجل نے ذکر فرمایا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ .....﴾ الخ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (ترمذی، تفسیر مطففین)

كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝١٥ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝١٦ ثُمَّ يُقَالُ
هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝١٧ كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ۝١٨ وَمَآ أَدْرَىٰكَ
مَا عِلِّيُّونَ ۝١٩ كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ ۝٢٠ يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ۝٢١

ہرگز نہیں یقیناً وہ اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔⑮ پھر یقیناً وہ بھڑکتی ہوئی
آگ میں داخل ہونے والے ہیں۔⑯ پھر کہا جائے گا یہی ہے جسے تم جھٹلایا کرتے
تھے۔⑰ ہرگز نہیں، یقیناً نیک لوگوں کا اعمال نامہ بہت ہی اونچے لوگوں کے دفتر میں
ہے۔⑱ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ بہت ہی اونچے لوگوں کا دفتر کیا ہے۔⑲ ایک
کتاب ہے واضح لکھی ہوئی۔⑳ جس کے پاس مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں۔㉑

آیت⑮ تا⑰ ﴿ كَلَّآ ﴾ یہ کافر جو کہتے ہیں کہ اگر قیامت ہوئی بھی تو دنیا کی طرح وہاں بھی پروردگار کی نوازشیں ہمیں پر ہوں گی، ان کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں۔ انھیں تو پروردگار کے قریب تک نہیں آنے دیا جائے گا بلکہ وہ حجاب میں رکھے جائیں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس دن نافرمان اللہ تعالیٰ سے محجوب ہوں گے اور اہل ایمان کو وہ نظر آئے گا۔ اگر دیدار الٰہی کے منکروں کے کہنے کے مطابق اللہ تعالیٰ کسی کو بھی نظر نہیں آئے گا تو یہ آیت بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ صریح الفاظ میں فرمایا: ﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ ﴾ (القیامۃ: ۲۲، ۲۳) ”کئی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے“۔ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی زیارت ہے، جو ایمان والوں کو حاصل ہوگی (اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں بھی اپنا دیدار نصیب فرمائے) اس کے ساتھ ہی انھیں کھانے پینے، نکاح وغیرہ جنت کی دوسری نعمتیں بھی میسر ہوں گی۔ نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلا عذاب یہ ذکر فرمایا کہ وہ اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ پھر وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔
أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُمَا

آیت⑱ تا㉑ ﴿ كَلَّآ ﴾ یہ بات ہرگز نہیں کہ نافرمانوں کا یہ حال ہوگا تو نیکوں سے بھی یہی

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾

یقیناً نیک لوگ نعمت میں ہوں گے۔﴿۲۲﴾ تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔﴿۲۳﴾ تو ان کے چہروں میں نعمت کی تازگی پہچانے گا۔﴿۲۴﴾

سلوک ہو۔'' عِلِّيُّونَ اور عِلِّيِّينَ عِلِّيٌّ کی جمع ہے، جو عُلُوٌّ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنیٰ ہے'' بہت ہی اونچا شخص''اور عِلِّيُّونَ کا معنیٰ ہے'' بہت ہی اونچے لوگ'' اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق یہ ایک کتاب ہے جس میں نیک لوگوں کے نام اوران کے اعمال واضح طور پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی رد و بدل یا کمی بیشی ممکن نہیں۔ ﴿يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ یعنی اس کی نگرانی کے لیے مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ چونکہ وہ نیک لوگوں کا دفتر ہے اس لیے اس کو دیکھنے کے لیے انھی مقرب لوگوں کو وہاں حاضر ہونے کی اجازت ہے جن کا وہ دفتر ہے۔ اس صورت میں ابرار ہی مقرب ہیں۔

آیت ﴿۲۲﴾، ﴿۲۳﴾ یہاں سے نیک لوگوں کو ملنے والی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ تختوں پر بیٹھے کبھی دوزخیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ رب تعالیٰ نے انھیں کتنی بڑی مصیبت سے بچایا ہے، کبھی جنت کی نعمتوں کا نظارا کرتے ہوں گے، کبھی دیدار الٰہی سے آنکھوں کو شاد کام کر رہے ہوں گے۔

آیت ﴿۲۴﴾ دنیا میں خوشحال لوگوں کے چہروں کی تازگی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب آسائش لوگ ہیں۔ اسی طرح جنتی لوگوں کے چہرے جنت کی نعمتوں سے ایسے ترو تازہ، پر رونق اور خوش و خرم ہوں گے کہ دیکھنے والا دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ وہ کس قدر نعمت اور عیش و آرام میں ہیں۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍۙ۝۲۵ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَؕ۝۲۶
وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍۙ۝۲۷ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَؕ۝۲۸

انھیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہوگی۔ ﴿۲۵﴾ اس کی مہر کستوری ہوگی اور اسی کو حاصل کرنے میں ان لوگوں کو مقابلہ کرنا چاہیے جو کسی چیز کے حاصل کرنے میں مقابلہ کرنے والے ہیں۔ ﴿۲۶﴾ اور اس میں ملاوٹ تسنیم سے ہوگی۔ ﴿۲۷﴾ جو ایک چشمہ ہے، جس سے مقرب لوگ پییں گے۔ ﴿۲۸﴾

آیت ﴿۲۵﴾، ﴿۲۶﴾ ﴿رَحِيْقٍ﴾ خالص شراب جس میں کھوٹ نہ ہو۔ ﴿مَخْتُوْمٍ﴾ اگرچہ جنت میں شراب کی نہریں موجود ہیں: ﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ﴾ (محمد: ۱۵) ”اور شراب کی کئی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہیں۔“ مگر یہ ایک خاص شراب ہوگی جو برتنوں میں بند ہوگی جن پر مہر مٹی یا راکھ کی بجائے کستوری کی ہوگی۔ ﴿خِتٰمُهٗ مِسْكٌ﴾ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ پیتے وقت آخری گھونٹ کے ساتھ کستوری جیسی خوشبو آئے گی نہ کہ دنیا کی شراب کی طرح بدبو کا بھبھوکا اٹھے گا۔

آیت ﴿۲۷﴾، ﴿۲۸﴾ ﴿مِزَاجُ﴾ آمیزش، ملونی، وہ چیز جو دوسری میں لذت بڑھانے یا خوشبو پیدا کرنے یا تیزی کم کرنے کے لیے ملاتے ہیں۔ مثلاً کسی پھل کا جوس یا روح کیوڑہ، الائچی، گلاب، کستوری وغیرہ یا ٹھنڈا میٹھا پانی یا دودھ وغیرہ یہ صرف مثال ہے، جنت کی نعمتوں کی کیفیت اور لذت اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا وہ جنھیں وہ حاصل ہوں گی۔

﴿تَسْنِيْمٍ﴾ تفعیل کا مصدر ہے۔ سَنِمَ (باب سمع) سَنَّمَ، تَسَنَّمَ تَرَفَّعَ بلند ہونا، اونچی جگہ سے گرنا، یہ تَسْطِيْحٌ (ہموار ہونے) کی ضد ہے (قاموس)۔ ﴿تَسْنِيْمٍ﴾ جنت کے ایک چشمے کا نام ہے، جس کا پانی اہل جنت پر اوپر سے گر رہا ہوگا، یعنی وہ رحیق مختوم میں اس چشمے کا پانی ملا کر پییں گے جو اوپر سے گر رہا ہوگا (طبری) یا اس چشمے کا نام تسنیم اس لیے ہے کہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ اور اونچے درجے کا مشروب ہے جو مقربین کو برابر پینے کے

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝ۖ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۝ۖ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝ۖ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝ۙ

بے شک وہ لوگ جنھوں نے جرم کیے ان لوگوں پر جو ایمان لائے، ہنسا کرتے تھے۔(۲۹) اور جب وہ ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارے کیا کرتے تھے۔(۳۰) اور جب اپنے گھر والوں کے پاس واپس آتے تو خوش گپیاں کرتے ہوئے واپس آتے تھے۔(۳۱) اور جب انھیں دیکھتے تو کہا کرتے تھے یقیناً یہ لوگ بھٹکے ہوئے ہیں۔(۳۲)

لیے ملے گا اور ابرار کو رحیق مختوم میں آمیزش کے لیے دیا جائے گا۔

آیت (۲۹) ﴿ يَضْحَكُوْنَ ﴾ ''ہنسا کرتے تھے'' کہ ان پر کیا پاگل پن سوار ہے کہ دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر کل کی ان دیکھی خیالی لذتوں کے وعدوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ﴿ كَانُوْا ...... يَضْحَكُوْنَ ﴾ سے معلوم ہوا کہ یہ ان کا ہمیشہ کا مشغلہ تھا۔ یہ صرف مکہ کے مشرکین کی بات نہیں آج کے ملحد اور بے دین بھی مسلمانوں کو رجعت پسند، دقیانوسی، تنگ نظر، تاریک خیال اور اس قسم کے طنزیہ خطاب دے کر خوش ہوتے اور اپنے دل کا بخار نکالتے رہتے ہیں۔ بہت سے شاعروں نے بھی جنت اور اہل جنت پر چوٹیں کی ہیں ان سب کو ان آیات کے مضمون سے ڈرنا چاہیے۔

آیت (۳۰) ﴿ يَتَغَامَزُوْنَ ﴾ غَمْزٌ ابروؤں اور پلکوں کے ساتھ اشارہ کرنا، یعنی یہ مجرم لوگ اہل ایمان کی کتاب وسنت کے مطابق ہیئت ولباس، طرز گفتگو، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے حصول کے لیے محنت دیکھ کر ان کی تحقیر کرنے اور مذاق اڑانے کے لیے ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے تھے کہ یہی وہ سرپھرے لوگ ہیں جنھوں نے خیالی جنت کے لیے اپنے آپ کو دنیا کی لذتوں سے محروم رکھا ہوا ہے۔

آیت (۳۱)، (۳۲) ﴿ فَكِهِيْنَ ﴾ جمع ''فَكِهٌ'' بر وزن ''فَرِحٌ'' ہنسنے ہنسانے کے لیے باتیں بنانے

وَمَآ أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حٰفِظِينَ ۞ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۞ عَلَى
الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُونَ ۞ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۞

حالانکہ وہ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ ۳۳ سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں۔ ۳۴ تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہیں۔ ۳۵ کیا کافروں کو اس کا بدلہ مل گیا جو وہ کیا کرتے تھے۔ ۳۶

والے، خوش گپیاں کرنے والے، یعنی گھر واپس آتے ہوئے بھی اہل ایمان کو موضوع بنا کر خوب باتیں بناتے، خوش گپیاں کرتے تھے اور انھیں گمراہ قرار دیتے تھے۔

آیت ۳۳ یہ ان لوگوں کی حماقت کی طرف اشارہ ہے کہ انھیں تو اپنے انجام کی فکر ہونی چاہیے تھی اہل ایمان پر طنز کرنے اور مذاق اڑانے کا انھیں کیا حق تھا اور کس نے انھیں ان کی نگرانی پر مقرر کیا تھا؟

آیت ۳۴ یعنی قیامت کے دن معاملہ الٹ ہو جائے گا۔ اب اہل ایمان کفار پر ہنستے ہوں گے کہ یہ لوگ کس درجہ احمق تھے کہ خود گمراہ ہونے کے باوجود ہمیں گمراہ کہتے تھے اور واضح دلائل کے باوجود نہ انھوں نے پیدا کرنے والے کا حق پہچانا نہ آخرت کی فکر کی۔ یہ جانتے ہوئے بھی دنیا کی لذتوں میں مست رہے کہ یہ عارضی ہیں۔

آیت ۳۵ جہنمیوں کی بری حالت دیکھ رہے ہوں گے نیز دیکھیے آیت ۲۳ کی تفسیر۔

آیت ۳۶ کافر جو جو کچھ کرتے تھے جہنم میں ہر چیز کا بدلہ مل گیا۔ ایک مسلمانوں سے مذاق رہ گیا تھا، آج مسلمانوں کے ان سے جوابی مذاق کے ساتھ وہ بدلہ بھی پورا ہو گیا۔ ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ﴾ میں سوال بھی کافروں کو ذلیل کرنے کے لیے ہے، پوچھنے کے لیے نہیں۔ ان آیات سے ملتی جلتی آیات کے لیے دیکھیے سورۃ المومنون آیت ۱۰۸ تا ۱۱۱۔

ركوعها ۱ (۸۴) سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ (۸۳) اٰياتها ۲۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝۱ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝۲ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝۳

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ① اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گا اور یہی اس کا حق ہے۔ ② اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ ③

تفسیر سورۃ الانشقاق

آیت ① دوسری جگہ فرمایا: ”اور آسمان کھولا جائے گا تو وہ دروازے ہی دروازے ہو جائے گا“۔ (النبا : ۱۹) اور فرمایا: ”جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹے گا اور فرشتے گروہ در گروہ اتارے جائیں گے“۔ (الفرقان : ۲۵) یہ نفخہ ثانیہ کے ساتھ ہوگا۔ آگے زمین سے مردوں کے نکلنے کے ذکر سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔

آیت ② ﴿وَ اَذِنَتْ﴾ (س) کان لگانا، غور سے سننا، یعنی غور سے سن کر اطاعت کرے گی۔ اسی طرح زمین حکم سنتے ہی وہ سب کچھ باہر پھینک دے گی جو اس میں ہے۔ ﴿حُقَّتْ﴾ (هُوَ حَقِيْقٌ بِكَذَا اَوْ مَحْقُوْقٌ بِكَذَا ماخوذ ہے، یعنی وہ اس چیز کے لائق ہے۔ نائب فاعل السماء کی ضمیر ہے۔ بیضاوی نے فرمایا: حُقَّتْ اَيْ جُعِلَتْ حَقِيْقَةً بِالْاِسْتِمَاعِ وَالْاِنْقِيَادِ زمخشری نے فرمایا: یعنی وَهِيَ حَقِيْقَةٌ بِاَنْ تَنْقَادَ وَلَا تَمْتَنِعَ یعنی آسمان کو اللہ کا حکم سن کر اطاعت سے انکار کی جرأت ہی نہیں، یہ صرف انسان ہی ہے کہ اللہ کے احکام نہ کان لگا کر سنتا ہے اور نہ اطاعت کرتا ہے۔

آیت ③ ﴿مُدَّتْ﴾ مَدَّ يَمُدُّ (ن) کھینچنا، پھیلانا، یعنی جس طرح چمڑے کو کھینچا جائے تو

وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝٤ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٥ يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ
إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۝٦ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝٧ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا
يَسِيرًا ۝٨ وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝٩

اور اس میں جو کچھ ہے اسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ ④ اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گی اور یہی اس کا حق ہے۔ ⑤ اے انسان! تو سخت مشقت کرتے کرتے اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، پھر اس سے ملنے والا ہے۔ ⑥ پس وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ ⑦ سو اس کا محاسبہ آسان حساب کی صورت میں کیا جائے گا ⑧ اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش واپس آئے گا۔ ⑨

اس کی تمام شکنیں اور اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے اور وہ طول وعرض میں پھیل جاتا ہے اسی طرح زمین سے پہاڑ، سمندر اور ہر قسم کی بلندی و پستی ختم ہو جائے گی جس سے وہ ہموار ہو کر پھیل جائے گی اور اس میں آدمیوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش بہت زیادہ ہو جائے گی۔

آیت ④ یعنی تمام فوت شدہ لوگوں کو حشر کے لیے باہر پھینک دے گی اور وہ خزانے اور بنی آدم کے اعمال کی شہادتیں جو اس کے بطن میں ہیں سب باہر نکال پھینکے گی۔ ﴿وَتَخَلَّتْ﴾ خَلَا يَخْلُو (ن) خالی ہونا، سے باب تَفَعُّل ہے جس میں مبالغہ ہوتا ہے، یعنی بالکل خالی ہو جائے گی۔

آیت ⑤ دیکھیے آیت نمبر ۳ کی تفسیر۔

آیت ⑥ ﴿كَادِحٌ﴾ كَدَحَ (باب فتح) خوب کوشش کرنا، مشقت جھیلنا، زخمی کرنا۔ ﴿إِلَىٰ﴾ کے لفظ سے اس میں رب تعالیٰ کی طرف جانے کا مفہوم ادا ہو رہا ہے، یعنی اے انسان! تو زندگی بھر کسی نہ کسی کام کی مشقت میں مبتلاء رہ کر آخر کار اچھے یا برے اعمال لے کر اپنے رب کے حضور پیش ہونے والا ہے۔

آیت ⑦، ⑨ آسان حساب کا مطلب یہ ہے کہ کرید کرید کر اصلی حساب نہیں ہوگا فقط اعمال

نامہ پیش ہوگا، غلطیاں بھی سامنے لائی جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دے گا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے! کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتے: ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾ (الانشقاق:۷،۸) یعنی ''جس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہوگا''۔ آپ نے فرمایا یہ صرف پیشی ہے (جس میں) پیش کیے جائیں گے اور جس سے حساب میں پڑتال کی گئی وہ ہلاک ہوگیا۔ (صحیح بخاری ، تفسیر انشقت)

جن بندوں پر اللہ کی نظر عنایت ہوگی ان کے آسان حساب کی ایک صورت وہ ہوگی جو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے ایک (بندہ) اپنے رب کے قریب ہوگا، یہاں تک کہ وہ اپنا دامن اس پر رکھے گا (کہ کسی اور کو خبر نہ ہو) پھر فرمائے گا، تو نے اس طرح کیا؟ وہ کہے گا: ہاں۔ اور فرمائے گا اس اس طرح (بھی) کیا؟ وہ کہے گا: ہاں۔ پس اللہ تعالیٰ اس سے اقرار کروالے گا، پھر فرمائے گا میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالا سو آج میں تمھیں وہ گناہ معاف کرتا ہوں''۔

[صحیح بخاری۔ کتاب الادب۔ باب ستر المومن علی نفسہ]

آسان حساب کی ایک صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا تھوڑی نیکی کا ثواب بہت زیادہ عطا فرما دے گا، جیسے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی امت کے ایک آدمی کے گناہوں کے حد نگاہ تک پھیلے ہوئے ننانوے (۹۹) دفتر کاغذ کے ایک پرزے کے مقابلے میں ہلکے ہو جائیں گے جس پر ((أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ)) لکھا ہوگا۔

[ترمذی۔ ابواب الایمان۔ باب فیمن یموت وھو یشھد ان لا الہ الااللّٰہ و صححہ الالبانی]

غرض اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے گا، حساب آسان کر دے گا، مگر شرط یہ ہے کہ آدمی ہر طرح کے شرک ظاہری اور شرک باطنی یعنی ریا سے پاک ہو، پھر اگر گناہ گار توبہ کے بغیر بھی مر

وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝١٠ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ۝١١ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝١٢ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝١٣

اور لیکن وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا گیا۔ ⑩ تو وہ ہلاکت کو پکارے گا۔ ⑪ اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔ ⑫ بلاشبہ وہ اپنے گھر والوں میں بہت خوش تھا۔ ⑬

گیا تو اللہ کی ذات سے رحمت اور آسانیٔ حساب کی توقع ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ﴾ (النساء : ٤٨) ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے جسے چاہے گا بخش دے گا۔“ مشرک کے لیے معافی نہیں، دوسروں کی مغفرت اللہ کی مشیت پر ہے۔ اس لیے نہ اس کے غضب سے بے خوف ہونا چاہیے نہ اس کی رحمت سے مایوس ہونا چاہیے۔

آیت ⑩ یہاں پیٹھ کے پیچھے اعمالنامے ملنے کا ذکر ہے اور سورہ حاقہ میں بائیں ہاتھ میں، غور کریں تو صاف سمجھ میں آ رہا ہے کہ ان مجرموں کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے، جہاں انھیں بائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملے گا۔

آیت ⑪ یعنی عذاب کے ڈر سے ہلاکت کو پکارے گا تاکہ وہ مر کر عذاب سے نجات پا جائے۔

آیت ⑬ اسے دنیا میں آخرت کا کوئی خوف نہ تھا، وہ اپنے بیوی بچوں اور دنیا کی نعمتوں میں ایسا مگن اور خوش تھا کہ پروردگار کے پاس حاضری کو بھول ہی گیا۔ نتیجہ یہ کہ آج جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے برعکس، اہل ایمان اپنی دنیا میں گزری ہوئی زندگی کو یاد کر کے کہیں گے: ﴿قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ..... الخ﴾ (الطور : ٢٦ تا ٢٨) یعنی ”ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرنے والے تھے“ (کہ انجام کیا ہوگا؟) آج وہ اپنے گھر خوش خوش لوٹیں گے: ﴿وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا﴾ ”اور وہ اپنے گھر کی طرف خوش خوش واپس لوٹے گا۔“

إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّن يَحُورَ ﴿١٤﴾ بَلَىٰ ۚ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ﴿١٥﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾
وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ﴿١٨﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ﴿١٩﴾

یقیناً اس نے سمجھا تھا کہ وہ کبھی (اپنے رب کی طرف) واپس نہیں لوٹے گا۔ ⑭ کیوں نہیں!
یقیناً اس کا رب اسے خوب دیکھنے والا تھا۔ ⑮ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی! ⑯ اور
رات کی اور اس چیز کی جسے رات جمع کرتی ہے! ⑰ اور چاند کی جب وہ پورا ہوتا ہے! ⑱ کہ تم
ضرور ہی ایک حالت کے بعد دوسری حالت کو چڑھتے جاؤ گے۔ ⑲

آیت ⑭، ⑮ پیٹھ کے پیچھے ان لوگوں کو اعمالنامہ ملے گا جن کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے نہ کوئی حساب کتاب ہوگا۔ فرمایا، کیوں نہیں! یقیناً تمھارا حساب ضرور ہونا تھا، تمھارا رب تمھارے اعمال، اقوال اور احوال سب کچھ خوب دیکھ رہا تھا اور تمھارا اعمالنامہ بھی تیار کروا رہا تھا، مگر اس نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت تمھیں مہلت دے رکھی تھی، اب وہ مہلت ختم ہو گئی، اب اپنے انکار اور بے فکری کا نتیجہ بھگتو۔

آیت ⑯ قسم سے پہلے ''نہیں'' کا مطلب منکرین کی بات کی نفی ہے۔ ﴿الشَّفَقِ﴾ سورج غروب ہونے کے بعد آسمان کے کنارے کی سرخی جو عشا تک رہتی ہے۔

آیت ⑰ ﴿وَسَقَ﴾ (باب ضرب) جمع کرنا اور اٹھا لینا۔ ساٹھ صاع غلے کا ایک وسق ہوتا ہے۔ اسے وسق کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ غلے کی خاصی مقدار جمع کیے ہوتا ہے۔ ﴿وَمَا وَسَقَ﴾ کے عموم میں تمام آدمی اور جانور آ جاتے ہیں، کیونکہ وہ سب دن بھر چلنے پھرنے کے بعد رات کو آرام کے لیے اپنے اپنے ٹھکانے پر جمع ہو جاتے ہیں۔

آیت ⑱ ﴿إِذَا اتَّسَقَ﴾ اوپر والے وَسَقَ سے باب افتعال ہے، جمع ہونا یعنی چودھویں رات کا پورا چاند بن جائے۔

آیت ⑲ فائدہ ① قرآن مجید میں مذکور قسمیں بعد میں آنے والے جواب قسم کی تاکید کے لیے آتی ہیں اور عام طور پر اس کے یقینی ہونے کی دلیل ہوتی ہیں۔ یہاں جس بات کو ثابت

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۝ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ۝

تو انھیں کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔ ⑳ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے۔ ㉑ بلکہ جن لوگوں نے انکار کیا ہے وہ جھٹلاتے ہیں۔ ㉒

کرنے کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں وہ یہ حقیقت ہے کہ تم ضرور ہی ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے جاؤ گے۔ اب قسموں پر غور کیجیے، تینوں آیات میں مذکور چیزوں کا ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہونا صاف واضح ہے۔ دن بھر کی دھوپ کے بعد سورج غروب ہو کر شفق پھیل جاتی ہے، پھر رات چھا جاتی ہے اللہ کی مخلوق دن کو پھیل جاتی ہے اور رات کو جمع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چاند پہلی رات خنجر نما شکل میں ہوتا ہے، پھر بدلتے بدلتے مہِ کامل بن جاتا ہے، پھر دوبارہ گھٹنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ تمھیں بھی ایک حالت پر دوام نہیں ہے، بلکہ ان اشیاء کی طرح تمھارا ایک حال سے دوسرے میں منتقل ہوتے چلے جانا بھی یقینی ہے۔ اسی طرح زندگی کے بعد موت، پھر زندگی اور ہر عمل کی جزا و سزا کا ہونا بھی یقینی ہے۔

فائدہ ① رسول اللہ ﷺ نے: ﴿ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴾ کی تفسیر فرمائی: ((حَالًا بَعْدَ حَالٍ)) (بخاری۔ تفسیر انشقت) یعنی ''ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں'' آدمی ہر لمحے نئی سے نئی حالت میں منتقل ہوتا ہے، بڑے بڑے تغیرات یہ ہیں: مٹی سے پیدا ہو کر نطفہ، پھر ماں کے پیٹ کی مختلف حالتیں، پھر پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی، بیماری، فقر، غنا، پھر موت، قبر اور قیامت، غرض انسان بے شمار احوال سے گزرتا ہوا جنت یا دوزخ کو پہنچ جاتا ہے۔

آیت ⑳ جب ایک حالت پر قرار نہیں تو یہ لوگ دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ انھیں یہ ضد کیوں ہے کہ ہمیں مر کر اسی حال میں رہنا ہے۔

آیت ㉑ اور پیدا کرنے والے کا کلام سن کر بھی نہیں جھکتے۔

آیت ㉒ یعنی یہ بات نہیں کہ قرآن کے دلائل میں کوئی کمی ہے یا اس کی آواز ان کے دلوں کی

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں۔ ﴿۲۳﴾ پس انھیں ایک درد ناک عذاب کی
خوشخبری دے دے۔ ﴿۲۴﴾ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے
کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ ﴿۲۵﴾

گہرائی تک نہیں پہنچی، بلکہ انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ ہم نے ماننا ہی نہیں۔ چنانچہ یہ کفر و عناد ہی تکذیب کا باعث ہے۔

آیت ﴿۲۳﴾ ﴿یُوْعُوْنَ﴾ جو اعمال وہ آخرت کے لیے جمع کر رہے ہیں، زبانی جھٹلانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے دلوں میں جو کبر و عناد جمع کر رکھا ہے اور آپ کے خلاف جو جو سازشیں انھوں نے تیار کر رکھی ہیں وہ اللہ کو ان سے بھی زیادہ معلوم ہیں۔

آیت ﴿۲۴﴾ بشارت اس خوشی کی خبر کو کہتے ہیں جس کا اثر بَشَرَةٌ (جلد) پر ظاہر ہو جائے یہاں عذاب الیم کے لیے بشارت کا لفظ بطور استہزاء ہے۔

آیت ﴿۲۵﴾ اور وہ جنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جس کی کوئی نعمت نہ کم ہوگی اور نہ ختم۔

رکوعها ۱ | (۸۵) سُورَةُ الْبُرُوجِ مَكِّيَّةٌ (۲۷) | آیاتها ۲۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۭ

قسم ہے برجوں والے آسمان کی! ① اور اس دن کی جس کا وعدہ دیا گیا ہے! ② اور حاضر ہونے والے کی اور جس کے پاس حاضر ہوا جائے! ③

تفسیر سورۃ البروج

یہ سورہ مسلمانوں کو اہل مکہ کی ایذا رسانی پر صبر و استقامت کی تلقین کے لیے نازل ہوئی۔ اس مقصد کے لیے پہلی امتوں کے مسلمانوں کو پیش آنے والے شدید ترین امتحان اور اس پر ان کے صبر و ثبات اور انھیں ستانے والوں کے انجامِ بد کا تذکرہ فرمایا، تاکہ ان کے حالات سن کر انھیں تسلی ہو اور یقین ہو جائے کہ جس طرح اصحاب الاخدود مارے گئے اسی طرح وہ لوگ بھی مارے جائیں گے جو اب مسلمانوں کو امتحان میں ڈال رہے ہیں۔

آیت ① ﴿الْبُرُوْجِ﴾ بُرْجٌ کی جمع ہے، اس کا اصل معنیٰ ہے، نمایاں اور ظاہر ہونے والی چیز۔ تَبَرُّجٌ کا معنیٰ، بے پردہ ہونا، ظاہر ہونا، اس لیے بلند محل کو بُرْجٌ کہتے ہیں۔ شہر کی فصیل کے بلند حصوں کو بھی برج کہتے ہیں۔ آسمان پر ستاروں کے اجتماع سے جو صورتیں نظر آتی ہیں، انھیں بروج کہتے ہیں۔ وہ آسمانی ٹھکانے بھی جن میں شیطانوں سے آسمان کی حفاظت کے لیے فرشتے پہرا دیتے ہیں، بروج کہلاتے ہیں۔ سورج اور چاند کی منزلوں کو بھی بروج کہا جاتا ہے۔

آیت ② قیامت کا دن، جس کا جزا و سزا کے لیے وعدہ کیا گیا ہے۔

آیت ③ ﴿شَاهِدٍ﴾ حاضر ہونے والا ﴿مَشْهُوْدٍ﴾ جس کے پاس حاضر ہوا جائے۔ لفظوں

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِۙ۝ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِۙ۝

مارے گئے اس خندق والے۔④ جو سراسر آگ تھی بہت ایندھن والی۔⑤

کے لحاظ سے اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کہیں حاضر ہو سکتے ہیں اور مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کا مشاہدہ ہو سکتا ہے یا جن کے پاس کوئی حاضر ہو سکتا ہے۔ اہل علم نے شاہد و مشہود کی تفسیر کرتے ہوئے جس چیز کو زیادہ اہم یا معروف یا مناسب سمجھا اس کے ساتھ تفسیر کر دی۔ چنانچہ بہت سے صحابہ و تابعین نے شاہد سے مراد یوم جمعہ اور مشہود سے مراد یوم عرفہ لیا ہے۔ الفاظ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ فرد ہے جو کہیں حاضر ہوتا ہے اور حاضری کا ہر وہ موقع ہے جس میں کوئی فرد حاضر ہوتا ہے۔

آیت ④ یعنی عظیم الشان برجوں والا آسمان، قیامت کا دن، کسی بھی مقام پر حاضر ہونے والے لوگ اور کوئی بھی موقع جس میں لوگ حاضر ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں اگر اپنا وجود رکھتی ہیں اور یقیناً ان کے وجود میں کوئی شبہ نہیں تو یہ بات بھی یقینی سمجھو کہ جن لوگوں نے بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر انھیں آگ سے بھرا، پھر جو اہل ایمان اپنے ایمان پر ڈٹے رہے اور مرتد نہ ہوئے، انھیں اس آگ میں پھینک کر بے دردی سے ان کے جلنے کا تماشا دیکھتے رہے، وہ مارے گئے، کیونکہ وہ زبردست ہستی جو ان برجوں والے آسمان کو تھامے ہوئے ہے، جس نے انصاف کے لیے قیامت کا دن مقرر کر رکھا ہے اور جس کی نگاہ سے نہ کسی جگہ کوئی حاضر ہونے والا غائب ہے اور نہ حاضری کا کوئی موقع، وہ ان سنگدل ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ضرور دے گا اور وہ نہ اس کی نگاہ سے غائب ہو سکیں گے، نہ عذاب سے بچ سکیں گے۔

فائدہ: دنیا میں ایسے کئی واقعات ہوئے، جن میں اہل ایمان کو خندق کھود کر آگ میں جلا دیا گیا، سند کے لحاظ سے سب سے صحیح ایک کافر بادشاہ کا وہ طویل واقعہ ہے جو صحیح مسلم میں صہیب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حدیث لمبی ہے۔ اس کے آخر میں ہے کہ اس کافر بادشاہ کی رعایا کے لوگ مسلمان ہو گئے تو اس نے گلیوں کے کناروں پر گڑھے

اِذْ هُمْ عَلَیْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّ هُمْ عَلٰى مَا یَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ
اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۝ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝

جب وہ اس کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔⑥ اور وہ ایمان والوں کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اس پر مشاہدہ کرنے والے تھے۔⑦ اور انھوں نے ان سے اس کے علاوہ کسی چیز کا بدلہ نہیں لیا کہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو سب پر غالب ہے، ہر تعریف کے لائق ہے۔⑧ وہ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اس کی ہے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔⑨

کھدوا کر ان میں آگ بھڑکائی اور حکم دیا کہ جو شخص اسلام نہ چھوڑے اسے آگ میں پھینک دو، چنانچہ اہل ایمان کو ان گڑھوں میں پھینک دیا گیا۔ مفصل واقعہ کے لیے دیکھیے [صحیح مسلم ج ۲ کتاب الزهد ـ باب قصة اصحاب الاخدود حديث(۷٤۳٦)] تفسیر ابن کثیر میں مومنوں کو آگ میں جلائے جانے کے مزید واقعات بھی لکھے ہیں۔

آیت⑥،⑦ یعنی کنارے پر بیٹھ کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، انھیں جلتے ہوئے دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں کوئی نرمی نہیں آئی۔ اس طرح کے واقعات کافر قوتوں کے زیر سایہ آج بھی ہو رہے ہیں، ان کا انجام بھی اصحاب الاخدود کی طرح ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

آیت⑧ ان اہل ایمان نے ان ظالموں پر یا کسی دوسرے پر کوئی زیادتی نہیں کی تھی جس کا وہ بدلہ لے رہے ہوں، ان کا جرم صرف اللہ پر ایمان لا کر اس پر قائم رہنا تھا۔ آیت میں: ﴿اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْمِنُوْا﴾ فرمایا ہے، جو حال و استقبال پر دلالت کرتا ہے۔ (اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنُوْا) نہیں فرمایا جو ماضی کا صیغہ ہے، یعنی ان کا جرم یہی نہ تھا کہ وہ ایمان لے آئے تھے، بلکہ یہ تھا کہ وہ اب بھی ایمان پر قائم تھے۔

﴿بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ﴾ یعنی ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا کوئی جرم یا غلط کام نہ تھا، بلکہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے تھے جو عزیز و حمید ہے اور آئندہ آیت میں مذکور صفات کا مالک ہے اور ان صفات کی وجہ سے اس کا حق ہے کہ اس پر ایمان رکھا جائے۔ یہ قرآن مجید کا خاص

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ
عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝

یقیناً وہ لوگ جنھوں نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو آزمائش میں ڈالا پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔⑩ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔⑪

اسلوب ہے کہ واقعات بیان کرتے ہوئے بھی وہ عقائد کی درستی اور احکام کی وضاحت کا اہتمام جاری رکھتا ہے۔اس کی ایک مثال یہ آیت ہے۔

آیت⑩ فتنہ کا معنیٰ ہے، کھرے کھوٹے کی آزمائش کے لیے سونے کو آگ میں ڈالنا، پھر یہ لفظ جلانے، ستانے، عذاب دینے اور حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہونے لگا۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا﴾ سے مراد اصحاب الاخدود بھی ہیں، جنھوں نے اہل ایمان کو آگ کی خندقوں میں ڈالا اور کفار قریش اور بعد میں آنے والے وہ تمام ظالم بھی، جو انواع واقسام کے عذاب دے دے کر اہل ایمان کو ایمان سے ہٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ ﴿فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ﴾ جہنم میں کئی طرح کا عذاب ہے۔ سب سے سخت عذاب جلنے کا ہے اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر فرمایا اس کے علاوہ اہل ایمان کو جلانے والوں کے حسب حال جلنے ہی کا عذاب ہے۔ ﴿ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا﴾ ''پھر توبہ نہیں کی'' اللہ کی شان کریمی دیکھیے اہل ایمان کو جلانے والوں کو بھی جہنم کی سزا تب سنائی جب وہ توبہ کے بغیر مریں کیونکہ توبہ کرنے سے گزشتہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔اس سے توبہ کی ترغیب بھی نکل رہی ہے۔

آیت⑪ یہاں ایمان و عمل صالح والے لوگوں کے لیے جنت کی بشارت کے ذکر کی دو مناسبتیں ہیں۔ایک تو یہ کہ اگر مسلمانوں کو ستانے والے لوگ بھی ایمان لا کر صالح عمل والے

﴿ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ۚ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴾

یقیناً تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔⑫ بے شک وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔⑬ اور وہی ہے جو بہت بخشنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے۔⑭

بن جائیں تو ان کے لیے بھی وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ دوسری یہ کہ ایمان اور عمل صالح کے حامل جن مسلمانوں کو آزمائش کی بھٹیوں میں جھونکا جا رہا ہے، وہ غم نہ کریں، یہ وقت گزر جانے والا ہے، آخرت میں ان کے لیے وہ عظیم الشان باغات تیار ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان والوں کو آزمائشوں اور مصیبتوں میں ثابت قدم رکھنے والی چیز اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں جنت دے گا۔ کس قدر ظالم ہیں وہ لوگ جو روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر جنت کا مذاق اڑاتے اور اسے بے وقعت قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیت⑫ ﴿بَطْشَ﴾ وہ پکڑ جس میں تیزی اور سختی پائی جائے۔ رب تعالیٰ کی بطش جسے وہ خود شدید بتا رہا ہے کس قدر سخت ہوگی؟ اہل ایمان کو ایذا پہنچانے والوں کو ڈرایا جا رہا ہے کہ رب تعالیٰ کی پکڑ بہت سخت ہے، اس سے بچ جاؤ۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴾ (ھود: ۱۰۲) ”اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ بستیوں کو اس حال میں پکڑتا ہے کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، یقیناً اس کی پکڑ دردناک ہے، سخت ہے۔“

آیت⑬ یہ نہ سمجھنا کہ دنیا میں تمھارے ظلم وستم پر باز پرس نہیں ہوئی تو مرنے کے بعد بھی نہیں ہوگی۔ جس نے تمھیں پہلے پیدا کیا وہی دوبارہ زندہ کر کے تمھارے اعمال کی جزا دے گا۔

آیت⑭ اللہ تعالیٰ کے قہر وجلال کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی صفات رحمت کا تذکرہ ہے کہ اگر تم توبہ کر لو تو وہ بے حد بخشنے والا ہے ﴿الْوَدُوْدُ﴾ وہ بندوں کا دشمن نہیں بلکہ بہت محبت کرنے والا ہے، سزا صرف اس کو دیتا ہے جو سرکشی پر اتر آئے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ﴿١٥﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿١٦﴾ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ﴿١٧﴾ فِرْعَوْنَ
وَثَمُودَ ﴿١٨﴾ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ﴿١٩﴾ وَاللَّهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ ﴿٢٠﴾ بَلْ هُوَ
قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ﴿٢١﴾ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴿٢٢﴾

جو عرش کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے۔⑮ جو چاہے اسے کر گزرنے والا ہے۔⑯ کیا تیرے پاس ان لشکروں کی خبر پہنچی ہے۔⑰ جو فرعون اور ثمود تھے۔⑱ بلکہ وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا، جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔⑲ اور اللہ ان کے پیچھے سے انھیں گھیرے ہوئے ہے۔⑳ بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے۔㉑ جو اس تختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے۔㉒

آیت⑮،⑯ وہ تمھاری طرح معمولی اور عارضی اقتدار والا نہیں، بلکہ اس عرش عظیم کا مالک ہے جو زمین و آسمان اور ان کے مابین سے بھی بڑا ہے نہ وہ تمھاری طرح کم ظرف ہے کہ معمولی سی قدرت ملے تو ظلم پہ اتر آئے، بلکہ وہ بڑی شان والا ہے اور نہ وہ تمھاری طرح بے بس ہے کہ مجبور ہو کر اسے اپنے ارادے ترک کرنے پڑیں، بلکہ وہ جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔ ایسے زبردست قوت والے پروردگار سے تمھیں ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کی رحمت کا طلب گار رہنا چاہیے۔

آیت⑰،⑱ یہ جو فرمایا تھا کہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے، اس کے دل میں جما دینے کے لیے ثمود و فرعون کے دو قصے جو عرب میں زیادہ مشہور تھے وہ اہل مکہ کو یاد دلائے تا کہ وہ ان قصوں سے عبرت پکڑیں۔ (احسن التفاسیر) اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دلانا بھی مقصود ہے۔

آیت⑲،⑳ حق تو یہ تھا کہ پہلے سرکشوں کا انجام دیکھ کر یہ لوگ ایمان لے آتے مگر یہ الٹا خواہ مخواہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جب چاہے پکڑ لے۔

آیت㉑ تا㉒ اور اگر ان کا جھٹلانا اس خیال سے ہے کہ یہ کلام الٰہی نہیں یا اس میں شیطان کا

کچھ دخل ہے تو ان کی یہ بات بھی غلط ہے، بلکہ یہ بڑی شان والا قرآن ہے، اس لوح میں سے اتارا گیا ہے جس کی فرشتوں کے ذریعے حفاظت کی جاتی ہے، کسی شیطان کا اس میں دخل نہیں ہوسکتا۔ اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر انھیں شبہ ہے تو وہ بھی اس جیسا کوئی ٹکڑا بنا کر لے آئیں، جب یہ نہیں کر سکتے تو اس کے کلام الٰہی ہونے میں کیا شبہ رہ گیا۔

(ماخوذ از احسن التفاسیر)

رکوعہا ۱ (۸۶) سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ (۳۶) اٰیاتہا ۱۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۭ

قسم ہے آسمان کی اور رات کو آنے والے کی! ① اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ② وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ ③ نہیں کوئی جان مگر اس کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے۔ ④

تفسیر سورۃ الطارق

آیت ① تا ④ فائدہ ﴿1﴾ ''طرق'' (باب نصر) کا اصل معنیٰ زور سے مارنا جس سے آواز پیدا ہو۔ مِطْرَقَة (ہتھوڑا) اور طریق اسی سے مشتق ہیں، کیونکہ راستے پر چلنے والوں کے قدم زور سے پڑتے ہیں تو آواز دیتے جاتے ہیں، طارق رات کو آنے والے کو کہتے ہیں، کیونکہ عام طور پر اسے دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ ﴿ اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴾ میں الف لام جنس کے لیے ہے، اگرچہ لفظ واحد ہے مگر اس میں تمام ستارے آجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو پیدا کرنے کا ایک مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ شیطانوں سے آسمان دنیا کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ (دیکھیے صافات: ۶، ۷۔) ﴿ اِنْ ﴾ نفی کے معنیٰ میں ہے اور ﴿ لَمَّا ﴾ بمعنی ''اِلَّا'' ہے۔
فائدہ ﴿2﴾ قسم کسی بات کی تاکید کے لیے اٹھائی جاتی ہے اور عموماً اس بات کی شہادت ہوتی ہے جس کے لیے قسم اٹھائی گئی ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آسمان اور چمکدار ستارے کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ ہر جان کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اور

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝

پس انسان کو لازم ہے دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔⑤ وہ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔⑥ جو پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔⑦

ستاروں کا یہ عظیم الشان سلسلہ جو بغیر کسی سہارے کے قائم ہے اور جس میں کوئی خرابی یا حادثہ پیش نہیں آتا، اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ جس قادر مطلق نے ان کی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے وہی ہر جان کی بھی حفاظت کر رہا ہے، ہر چیز کا اصل حافظ وہی ہے۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لیے اپنی توجہ ہٹالے تو سب کچھ فنا ہو جائے۔ جس طرح اس نے شیطانوں سے آسمانوں کی حفاظت ستاروں کے ذریعے کی ہے، اسی طرح آفات سے حفاظت کے لیے ہر شخص پر باری باری آنے والے فرشتے مقرر کیے ہیں۔ (دیکھیے الرعد : ۱۱) اور اس کے اعمال کو لکھ کر محفوظ کرنے کے لیے کراماً کاتبین مقرر کیے ہیں۔ (الانفطار: ۱۰ تا ۱۳)

آیت ⑤ تا ⑦ ایک مقرر وقت تک انسان کی ذات کی حفاظت اور اعمال کی نگہداشت یوم حساب کے لیے ہے۔ اگر اسے اپنا دوبارہ زندہ کیا جانا محال معلوم ہوتا ہے تو اپنی پیدائش پر غور کر لے کہ کس چیز سے ہوتی ہے؟ ایک اچھلنے والے پانی سے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پانی جیسی مائع چیز پر صورت گری کر کے کسی نمونے کے بغیر ایک کامل انسان پیدا کر دیا جس میں مکمل اعضائے جسم، حیات، قوت، عقل اور ادراک سب کچھ موجود ہے تو یقیناً وہ اس انسان کو اس کی مٹی سے دوبارہ پہلی صورت میں پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ بتاؤ انسان کو پانی سے بنانا مشکل ہے یا اسی کی خاک سے دوبارہ بنا دینا؟ اور پہلی دفعہ بغیر نمونے کے پیدا کرنا مشکل ہے یا پہلے نمونے پر دوبارہ بنا دینا؟

فائدہ: منی اگرچہ بظاہر خصیوں میں بنتی ہے مگر جب پیدا کرنے والے نے بتا دیا کہ اس کا اصل مرکز پیٹھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہے تو اس حقیقت میں شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

اِنَّهٗ عَلٰی رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾

یقیناً وہ اسے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔⑧ جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔⑨

بعض اہل علم کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جدید طب نے بھی تسلیم کیا ہے کہ جنین کے خصیے ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گردوں کے قریب ہوتے ہیں، پھر ولادت سے پہلے اور بعض اوقات اس سے کچھ دیر بعد فوطوں میں اتر آتے ہیں مگر پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا مقام وہی: ﴿ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِ ﴾ رہتا ہے، بلکہ ان کی شریان بھی پیٹھ کے قریب شہ رگ (آورطی) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ سے گزرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ گویا خصیتین بھی اصل میں پیٹھ کا جز ہیں جو جسم کا زیادہ درجہ حرارت برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے باہر فوطوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ اب مادۂ منویہ اگرچہ خصیتین میں پیدا ہوتا اور کیسۂ منی میں جمع ہوتا ہے مگر اسے خون پہنچانے اور حرکت دینے والا مرکز: ﴿ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِ ﴾ ہے۔ دماغ سے اعصاب کے ذریعے جب اس مرکز کو حکم پہنچتا ہے تو اس مرکز کی تحریک سے کیسۂ منی سکڑتا ہے اور ماء دافق پچکاری کی طرح اچھل کر نکلتا ہے۔ الحمد للہ جدید طب بھی اس حقیقت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ بالفرض اگر وہ اس حقیقت تک نہ پہنچ سکتی تو قرآن کا بیان پھر بھی اٹل حقیقت تھا۔ قصور انسانی تجربات و مشاہدات کا تھا جو اپنی نارسائی کی وجہ سے خالق کی بیان کردہ حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

آیت⑨ ﴿ تُبۡلَی ﴾ بَلَا یَبۡلُوۡ (باب نصر) آزمائش کرنا، جانچ پڑتال کرنا۔ یہاں ظاہر کیا جانا مراد ہے، کیونکہ جانچ پڑتال تبھی ہوگی جب چھپے ہوئے اعمال ظاہر ہوں گے۔ ﴿ السَّرَآئِرُ ﴾ سَرِیۡرَۃٌ کی جمع ہے۔ سِرٌّ اور سَرِیۡرَۃٌ اس چیز کو کہتے ہیں جو چھپائی جائے (قاموس) اس سے مراد وہ ارادے، نیتیں اور عقائد ہیں، جن کا علم خود آدمی کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا اور وہ اعمال بھی جن کا علم کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ ﴿ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ ﴾، ﴿ رَجۡعِهٖ ﴾ کی ظرف

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝
اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝

تو اس کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار۔⑩ قسم ہے آسمان کی جو بار بار بارش برسانے والا ہے!⑪ اور زمین کی جو پھٹنے والی ہے!⑫ کہ یقیناً یہ ایک دوٹوک بات ہے۔⑬ اور یہ ہرگز مذاق نہیں ہے۔⑭

ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو اس دن دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔

آیت⑩ آدمی گرفتار ہو جائے تو اپنی قوت سے چھوٹ جاتا ہے یا کسی کی مدد سے، مگر اس دن اس میں نہ خود بچ نکلنے کی قوت ہوگی نہ کوئی مدد کو آنے والا ہوگا۔

آیت⑪، ⑫ ﴿الرَّجْعِ﴾ کی تفسیر مجاہد نے بارش کی ہے۔(صحیح بخاری۔ تفسیر الطارق) اکثر مفسرین نے یہی معنیٰ کیا ہے۔ رجع کا لفظی معنیٰ لوٹنا ہے، چونکہ بارش بار بار پلٹ کر برستی ہے اس لیے اسے رجع کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے، وہ بھاپ پلٹ کر پھر بارش کی صورت میں برستی ہے۔ پھر وہ پانی اڑتا ہے پھر برستا ہے اس لیے اسے رجع کہا ہے۔ صدع کا معنیٰ پھٹنا ہے۔

آیت⑬، ⑭ بعض مفسرین نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ یہ قرآن قول فصل ہے، اس میں شک نہیں کہ قرآن قول فصل ہے، مگر پچھلی آیات اور قسموں کی مناسبت کو مدنظر رکھیں تو مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ قول فصل سے مراد قیامت برپا کرنے اور انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہونے کی بات ہے، یعنی آسمان سے بار بار برسنے والی بارش اور اس کی نمی سے پھٹ کر بیج کو اگا کر باہر لے آنے والی زمین شاہد ہے کہ تمھارے دوبارہ زندہ کیے جانے کی بات دوٹوک بات ہے۔ قیامت کے دن تم بھی اسی طرح زندہ ہو کر زمین سے نکل آؤ گے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو نفخوں کے درمیان چالیس کا فاصلہ ہوگا پھر

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَأَكِيدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾

بے شک یہ لوگ ایک خفیہ تدبیر کر رہے ہیں۔ (١٥) اور میں بھی ایک خفیہ تدبیر کر رہا ہوں۔ (١٦)
سو کافروں کو مہلت دے، مہلت دے انھیں تھوڑی سی۔ (١٧)

آسمان سے بارش ہوگی تو لوگ اس طرح اُگیں گے جس طرح سبزی اُگتی ہے اور انسان کا کوئی حصہ نہیں جو بوسیدہ نہ ہو۔ سوائے ایک ہڈی کے اور وہ دم کی ہڈی ہے قیامت کے دن اسی سے مخلوق کو جوڑا جائے گا۔

[صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب مابین النفختین حدیث: ٧٣٤٠]

﴿ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴾ یعنی دوبارہ زندہ ہونے کی بات تم سے مذاق کے ساتھ نہیں کہی جارہی۔ یہ حکیم وعلیم کا قول ہے، کسی جاہل کا نہیں جو مذاق کر رہا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے گائے ذبح کرنے کے حکم پر ان سے کہا کہ کیا آپ ہمیں مذاق کر رہے ہیں تو انھوں نے فرمایا: ''میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں''۔

آیت (١٥) تا (١٧) یہ لوگ قیامت کو جھٹلانے اور حق کو مٹانے کے لیے خفیہ تدبیریں کر رہے ہیں اور میں خفیہ طور پر ان کے توڑ کے لیے ان سے بھی بڑی تدبیر کر رہا ہوں۔ آپ نہ ان کی مخالفت سے گھبرائیں، نہ جلد عذاب کی دعا کریں، میرے کہنے پر انھیں تھوڑی سی مہلت دیں۔ آخر انھوں نے میرے ہی پاس آنا ہے پھر میں جانوں اور یہ جانیں۔

رکوعہا ۱ (۸۷) سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ (۸) اٰیاتہا ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ

اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے۔ ①

تفسیر سورۃ الاعلیٰ

آیت ① ﴿ سَبِّحِ ﴾ تَسْبِيْحٌ معنی ہے ''ہر برائی سے پاک کرنا''۔ رب اعلیٰ کے نام کو پاک کرنے کے حکم کے مفہوم میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ پہلی یہ کہ کہو: ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب: ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴾ پڑھتے تو کہتے: ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند ہے۔ (ابو داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء فی الصلاۃ و صححہ الالبانی) اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں اس حکم پر عمل کے لیے ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى کم از کم تین دفعہ پڑھتے تھے۔ (مسند احمد، ابو داؤد، بحوالہ صفۃ صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم للالبانی)

دوسری یہ کہ اپنے رب کو ہر قسم کے نقص، عیب، کمزوری اور کسی بھی شریک سے پاک سمجھو اور اس کا اعلان کرتے رہو تاکہ مشرکین اور باطل عقیدہ لوگوں کے کانوں میں یہ آواز پڑتی رہے۔

تیسری یہ کہ رب تعالیٰ کے نام کی تعظیم کرتے رہو، اسے ایسے طریقے سے یا ایسی جگہ پر یا ایسے الفاظ میں یاد نہ کرو جو اس کی شان کے لائق نہ ہو یا جس سے اس کی بے ادبی ہوتی ہو یا استہزاء کا پہلو نکلتا ہو یا اس کے ساتھ کسی کے شریک ٹھہرائے جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے لیے

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ ﴾

جس نے پیدا کیا پس درست بنایا۔ ② اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر ہدایت کی۔ ③

سب سے زیادہ سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو خود اس نے اپنے لیے استعمال کیے ہیں۔

چوتھی یہ کہ اللہ کا نام کسی مخلوق پر نہ بولو مثلاً عبدالرحمٰن کو رحمان مت کہو۔ اگر لفظ مشترک ہو تو مخلوق پر اس انداز سے نہ بولو جس سے خالق کو یاد کرنا چاہیے۔

''اپنے رب کے نام کی تسبیح کر'' یا ''اپنے رب کی تسبیح کر'' دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، کیونکہ ''رب'' بھی اس کا نام ہے۔ نام کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور کنہ تک تو پہنچ ہی نہیں سکتے، تمھاری رسائی اس کے نام تک ہے سو اس کی تسبیح کرتے رہو۔ بعض نے فرمایا کہ جب نام کی تسبیح ضروری ٹھہری تو اس کی ذات تو بالاولیٰ تسبیح کی حقدار ہے۔

آیت ② ﴿ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ ''جس نے پیدا کیا'' مفعول محذوف ہے، یعنی یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ کسے پیدا کیا؟ کیونکہ پیدا کرنا کام ہی اسی کا ہے۔ سب اسی کی مخلوق ہیں۔ ﴿ فَسَوّٰی ﴾ ''پس درست بنایا'' ہر چیز کو ٹھیک متوازن عمدہ ترین شکل میں بنایا، کوئی چیز بے ڈھب غیر متوازن نہیں ﴿ الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ﴾ (السجدہ : ۷) ''وہ جس نے جو چیز پیدا کی، خوبصورت پیدا کی''۔ اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں رب تعالیٰ کی بعض وہ صفات بیان کی ہیں جن کی وجہ سے وہ تسبیح کا مستحق ہے۔

آیت ③ ہر چیز کے متعلق اندازہ لگا کر پہلے لکھ دیا کہ وہ کیا کرے گا؟ اس کا رزق، عمر، سعادت یا شقاوت سب کچھ لکھ دیا۔ اس کا نام تقدیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اندازہ ہمارے اندازے کی طرح نہیں کہ غلط ہو جائے۔ ﴿ فَهَدٰی ﴾ پھر جس نے جو کچھ کرنا تھا اسے اس راہ پر لگا دیا۔ ایک معنیٰ یہ ہے کہ ہر جاندار کو پیدا کر کے اس کی ضرورتوں کا اندازہ مقرر کر دیا کہ اسے کیا کیا ضرورت ہو گی؟ پھر اسے اس کی ضروریات و مصالح حاصل کرنے کا راستہ بتا دیا، مثلاً بچے

وَالَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۙ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ؕ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ؕ

اور جس نے چارا اگایا۔④ پھر اسے سیاہ کوڑا کر دیا۔⑤ ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا۔⑥ مگر جو اللہ چاہے۔ یقیناً وہ کھلی بات کو جانتا ہے اور اس بات کو بھی جو چھپی ہوئی ہے۔⑦

کو پستان چوسنے اور نر و مادہ کو بقائے نسل کا راستہ بتا دیا اور اس پر چلا دیا۔

آیت ④،⑤ حیوانوں کی ایک بڑی ضرورت چارہ تھی جو اس نے اگایا۔ پھر بالتدریج اسے سیاہ کوڑا بنا دیا۔ اشارہ ہے ہر چیز کے کمال کے بعد زوال کی طرف۔

آیت ⑥ ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ﴾ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ القیامۃ آیت ۱۶ تا ۱۹۔ یہ پیشگوئی ابتدائے اسلام میں مکہ کے اندر ہوئی، پھر سب لوگوں نے دیکھا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ کو صرف ایک دفعہ جبریل علیہ السلام سے سن کر کسی کتابت یا تکرار کے بغیر اتنا بڑا قرآن حفظ ہو گیا۔ یہ قرآن کا بھی معجزہ ہے کہ اس کی پیشگوئی پوری ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کا بھی جنھیں قرآن یاد ہوا اور پھر بھولا نہیں۔

آیت ⑦ ﴿ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہے بھلا دے۔ بعض اوقات کچھ آیات اس طرح بھی منسوخ کی جاتی تھیں کہ وہ آپ ﷺ کو بھلا دی جاتیں۔ ﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ﴾ (البقرۃ : ۱۰۶) ’’جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں‘‘۔

﴿ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ﴾ ’’وہ کھلی اور چھپی سب باتیں جانتا ہے‘‘۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ بیان فرمائی ہے کہ وہ کھلی چھپی سب باتیں جانتا ہے۔ اونچی آواز سے بات کی گئی ہو یا آہستہ یا بالکل مخفی ہو، وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (دیکھیے الرعد : ۱۰، طہٰ : ۷، الانعام : ۳، الانبیاء : ۱۱۰، الملک : ۱۳) ابن جوزی کے استاذ وزیر ابن ہبیرہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس بات پر بہت غور کیا کہ چھپی ہوئی باتوں کو تو واقعی صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے مگر بلند

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿۸﴾ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿۹﴾ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا
الْاَشْقَى ﴿۱۱﴾

اور ہم تجھے راستے کے لیے کی سہولت دیں گے۔ ⑧ سو تو نصیحت کر اگر نصیحت کرنا فائدہ دے۔ ⑨ عنقریب نصیحت حاصل کرلے گا جو ڈرتا ہے۔ ⑩ اور اس سے علیحدہ رہے گا جو بڑا بدنصیب ہے۔ ⑪

آواز سے کی گئی باتیں تو ہم بھی جانتے اور سمجھتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان باتوں کے جاننے کو اپنی خاص صفت کے طور پر کیوں بیان فرما رہے ہیں؟ پھر مجھے سمجھ آئی کہ بلند آواز کے ساتھ اگر ایک وقت میں کئی آدمی بولنا شروع کر دیں تو ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہ صرف اللہ ہی کی شان ہے کہ وہ ساری مخلوق کی بلند آواز سے کی ہوئی باتیں سنتا ہے اور چھپی ہوئی باتیں بھی۔ اس مقام پر یہ صفت بیان کرنے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہو رہا ہے کہ جب جبریل پڑھیں تو آپ یاد کرنے کے لیے ساتھ ساتھ نہ پڑھیں، ان کے ساتھ ساتھ پڑھیں گے تو سمجھنا مشکل ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ اللہ ہی کی شان ہے کہ بلند آواز سے کی گئی باتیں ہوں، خواہ کروڑوں لوگوں کی ہوں یا چھپی ہوئی، وہ سب جانتا ہے۔

آیت ⑧ یعنی ہم آپ کے لیے یہ آسانی فرمائیں گے کہ آپ کے خاموش رہ کر سنتے جانے سے آپ کو وحی الٰہی یاد ہو جائے گی۔

آیت ⑨ تا ⑪ ﴿ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴾ ”نصیحت کر اگر نصیحت کرنا فائدہ دے“ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نصیحت فائدہ نہ دے تو کیا نصیحت چھوڑ دی جائے؟ جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں، بلکہ نصیحت کرتے رہنا لازم ہے، تو پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟ آیت کی مختلف تفسیروں میں سے تین تفسیریں زیادہ قریب ہیں۔

پہلی تفسیر: تفسیر ثنائی میں ہے: اس آیت کی بنا پر بعض لوگ گمراہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نصیحت کے نفع دینے کی صورت میں نصیحت کرنے کا حکم ہے ورنہ نہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ آیت میں ﴿ اِنْ ﴾ ہے جب تک انسان کو کسی قطعی دلیل

﴿الَّذِیْ یَصْلَی النَّارَ الْكُبْرٰی ۚ ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی ؕ﴾

وہ جو بڑی آگ میں داخل ہوگا۔⑫ پھر نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔⑬

سے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص کو نصیحت فائدہ نہ دے گی ﴿اِنْ﴾ کا محل رہتا ہے اور قطعی دلیل صرف وحی الٰہی ہے۔ وحی کے بغیر ہر حال میں نصیحت کے مفید ہونے کا امکان باقی ہے۔ اس لیے جب تک تمھیں وحی الٰہی سے معلوم نہ ہو جائے کہ فلاں کو نصیحت نفع نہ دے گی وعظ و نصیحت کرتے جاؤ۔ ظاہر ہے کہ تمھارے پاس وحی الٰہی نہیں اس لیے تم ہمیشہ نصیحت کرتے رہو۔ (انتہی مختصرا)

دوسری تفسیر: ''نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ دے'' کا یہ مطلب نہیں کہ جسے نصیحت فائدہ دے اسے نصیحت کر دوسرے کو نہ کر، کیونکہ یہ تو معلوم ہو نہیں سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصیحت کر اگر کسی ایک کو بھی نصیحت فائدہ دے، گویا: ﴿نَّفَعَتِ﴾ کا مفعول محذوف ہے۔ یعنی (اِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرٰی اَحَدًا) اور ظاہر ہے کسی نہ کسی کو تو فائدہ ہوتا ہی ہے۔ اس لیے آپ ہر شخص کو نصیحت کرتے جائیں۔ ﴿سَیَذَّكَّرُ مَنْ یَّخْشٰی ...... الخ﴾ ''پھر ڈرنے والا قبول کرلے گا اور بدبخت اجتناب کرے گا''۔ آپ کا کام نصیحت کرتے چلے جانا ہے۔ اس امید پر کہ نصیحت کسی کو تو فائدہ کرے گی۔

تیسری تفسیر: ﴿اِنْ﴾ حرف شرط (اِذْ) کے معنیٰ میں ہے، یعنی نصیحت کر جب نصیحت کرنا فائدہ دے۔ موقع محل کا خیال رکھو۔ بے موقع بات مؤثر نہیں ہوتی۔ جب دیکھو کہ سننے کی طرف مائل ہیں، نصیحت کرو۔ جب ضد اور سرکشی پر اترے ہوئے ہوں کنارہ کشی اختیار کرو۔ یہ نہیں کہ نصیحت ہی چھوڑ دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو، نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء نے اپنی اپنی اقوام کو ان پر عذاب آنے تک نصیحت ترک نہیں کی۔

آیت ⑫، ⑬ سب سے بڑی آگ اس لیے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے انہتر گنا بڑھی ہوئی ہے (دیکھیے صحیح بخاری حدیث: ۳۲۶۵) ﴿ثُمَّ لَا یَمُوْتُ.....الخ﴾ نہ مرے گا کہ جان

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ﴿١٥﴾ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾
وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٧﴾ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٨﴾ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ
وَمُوسَىٰ ﴿١٩﴾

بے شک وہ کامیاب ہوگیا جو پاک ہوگیا۔ ⑭ اور اس نے اپنے رب کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی۔ ⑮ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ ⑯ حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔ ⑰ یقیناً یہ بات پہلے صحیفوں میں ہے۔ ⑱ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ ⑲

چھوٹ جائے نہ ایسی زندگی ہوگی کہ کوئی راحت ہو۔

آیت ⑭، ⑮ یعنی کفر و شرک اور گناہوں سے پاک ہو کر اللہ اکبر کہہ کر پانچوں نمازیں پڑھیں۔

آیت ⑯، ⑰ فرمایا آخرت کی بھلائی کے کاموں میں تم اس لیے کوتاہی کرتے ہو کہ دنیا کے مشغلوں کو چھوڑنا تمھیں شاق گزرتا ہے، حالانکہ تم اسے نہ بھی چھوڑو گے تو وہ تمھیں چھوڑ دے گی کیونکہ وہ باقی رہنے والی نہیں ہے اور اگر آخرت کو اختیار کرلو گے تو وہ تمھیں کبھی نہیں چھوڑے گی، پھر سوچ لو کسے ترجیح دینی چاہیے۔ (خلاصہ احسن التفاسیر)

رکوعہا ۱ (۸۸) سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ (۶۸) ایاتہا ۲۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳
تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴

کیا تیرے پاس ڈھانپ لینے والی کی خبر پہنچی۔ ① اس دن کئی چہرے ذلیل ہوں گے۔ ② سخت محنت کرنے والے، تھکے ہوئے۔ ③ سخت گرم آگ میں داخل ہوں گے۔ ④

تفسیر سورۃ الغاشیۃ

آیت ① قیامت جو ہر چیز پر چھا جائے گی۔

آیت ② تا ④ کافر دنیا میں جتنی محنت بھی کرے قیامت کے دن گرد و غبار کی طرح اڑا دی جائے گی۔ (الفرقان : ۲۳) یہی حال دکھاوا کرنے والے اور سنت کو چھوڑ کر خود ساختہ عمل کرنے والے کا ہے کہ سخت محنت کے باوجود جہنم میں جائے گا۔ (دیکھیے الکہف کا آخری رکوع مع تفسیر)۔ اسی مفہوم کے پیش نظر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ سے مراد نصاریٰ لیے ہیں۔ (بخاری تفسیر الغاشیہ) عیسائی راہبوں کی شدید ریاضتیں مشہور ہیں مگر وہ قیامت کے دن کسی کام نہ آئیں گی۔

اسی طرح جو لوگ خود ساختہ ورد، وظیفے یا عبادتیں کرتے ہیں یا اپنے بنائے ہوئے طریقوں پر عبادت کرتے ہیں خواہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر کریں یا الٹے لٹک کر یا سانس بند کر کے کریں یا مشرکین کی طرح کسی مخلوق کا تصور باندھ کر کریں یا ضربیں لگا کر، اتنی سخت مشقتوں کے باوجود قیامت کے دن ذلیل ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن کچھ لوگوں کو میرے پاس آنے سے روک دیا جائے گا تو میں کہوں گا، یہ تو میرے ساتھی

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ
جُوْعٍ ﴿٧﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا
لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿١٣﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿١٤﴾
وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿١٦﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾

انھیں ایک کھولتے ہوئے چشمے سے پلایا جائے گا۔⑤ ان کے لیے کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوگی مگر ضریع سے۔⑥ جو نہ موٹا کرے گا اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے گا۔⑦ کئی چہرے اس دن ترو تازہ۔⑧ اپنی کوشش پر خوش۔⑨ بلند جنت میں ہوں گے۔⑩ وہ اس میں بے ہودگی والی کوئی بات نہیں سنیں گے۔⑪ اس میں ایک عظیم بہنے والا چشمہ ہے۔⑫ اس میں اونچے اونچے تخت ہیں۔⑬ اور رکھے ہوئے آبخورے ہیں۔⑭ اور قطاروں میں لگے ہوئے گاؤ تکیے ہیں۔⑮ اور بچھائے ہوئے مخملی فرش ہیں۔⑯ تو کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں۔⑰

ہیں، تو کہا جائے گا: آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا نئی چیزیں شروع کر دی تھیں، تو میں کہوں گا، پھر جس نے میرے بعد تبدیلی کر دی اسے مجھ سے دور لے جاؤ۔
(صحیح بخاری ، کتاب الرقاق ، باب الحوض ، حدیث ٦٥٨٥)

آیت ⑥ ﴿ضَرِيْعٍ﴾ ایک خاردار پودا ہے جو تازہ ہو تو اہل حجاز اسے (شِبْرِق) کہتے ہیں اور خشک ہو تو ضَرِيْع سخت زہریلا ہوتا ہے۔ (بخاری ، تفسیر الغاشية)

آیت ⑪ دیکھیے سورۃ النبا آیت ۳۵ کی تفسیر۔

آیت ⑫ ﴿عَيْنٌ﴾ ''چشمہ'' یا تو یہ جنس ہے اور لفظ واحد ہونے کے باوجود بے شمار بہنے والے چشمے مراد ہیں یا واحد ہے تو تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔

آیت ⑬ جہاں سے وہ گرد و پیش والی ہر چیز کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔

آیت ⑭ ﴿اَكْوَابٌ﴾ كُوْبٌ کی جمع ہے، وہ پیالے، جن کی نہ دستی ہو نہ ٹونٹی۔

آیت ⑰ قیامت اور قیامت کے دن جہنمیوں اور جنتیوں کا حال ذکر کرنے کے بعد ان

۸۸

وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَى الْاَرْضِ
كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ فَذَكِّرْ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنْ
تَوَلّٰى وَ كَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾

اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیا گیا ہے۔ ⑱ اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے نصب کیے گئے ہیں۔ ⑲ اور زمین کی طرف کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔ ⑳ پس تو نصیحت کر، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، ㉑ تو ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے۔ ㉒ مگر جس نے منہ موڑا اور انکار کیا۔ ㉓ تو اسے اللہ سب سے بڑا عذاب دے گا۔ ㉔

چیزوں کو دیکھنے کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں، نہ کسی نے جنت یا جہنم میں جانا ہے تو ان چار چیزوں کو دیکھ لیں۔ اتنی عظیم الشان چیزیں پیدا کرنے والا پروردگار کیا انھیں دوبارہ نہیں بنا سکتا؟

آیت ⑰ تا ⑳ عرب کا بادیہ نشین تمام شہری تکلفات سے دور اونٹ پر سوار ہو کر سفر کر رہا ہو اور فطرت اپنی اصل صورت میں اس کے سامنے جلوہ گر ہو تو تھوڑا سا غور کرنے پر بھی ہر چیز میں اسے اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت نظر آئے گی۔ اوپر دیکھے تو سورج یا چاند ستاروں سے بھرا ہوا لامحدود محکم آسمان، نیچے دیکھے تو صفائی سے بچھی ہوئی وسیع زمین، دائیں بائیں دیکھے تو زمین میں گڑے ہوئے بلند و بالا پہاڑ، اپنی سواری کو دیکھے تو صحرا کے مطابق بناوٹ رکھنے والا ہفتوں بھوک، پیاس برداشت کرنے والا اونٹ، کوئی چیز بھی تو اس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں۔ اتنی عظیم مخلوق کے مالک کے لیے اس حقیر انسان کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے، جسے پہلے بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔

آیت ㉒ آپ کا کام نصیحت کرنا ہے، زبردستی مسلمان کرنا نہیں: ﴿ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ (البقرة : ٢٥٦) ”دین میں کوئی زبردستی نہیں۔“

آیت ㉓، ㉔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو منہ موڑ کر کفر پر اصرار کرتا ہے، اسے پوچھا ہی نہ

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾

یقیناً ہماری طرف ہی ان کا لوٹ کر آنا ہے۔㉕ پھر بے شک ہمارے ذمے ہی ان کا حساب لینا ہے۔㉖

جائے، بلکہ اگر وہ کافر ہی رہنا چاہتا ہے تو رہے مگر مسلمانوں کی حکومت تسلیم کرے، اپنے ہاتھوں سے انھیں جزیہ دے اور اپنی ذلت کا اقرار کرے (یہ دنیا کا عذاب ہے) ورنہ لڑنے کے لیے تیار رہے۔(التوبة : ۲۹)

اور قیامت کو اس کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں غلامی سے بڑی ذلت کوئی نہیں اور آخرت میں آگ سے بڑا عذاب کوئی نہیں۔

رکوعہا ۱ (۸۹) سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ (۱۰) اٰیاتہا ۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝

فجر کی قسم!① اور دس راتوں کی قسم!② اور جفت اور طاق کی قسم!③

تفسیر سورۃ الفجر

آیت① ﴿ الْفَجْرِ ﴾ سے مراد صبح ہے۔ سورۃ تکویر میں بھی یہ قسم مذکور ہے: ﴿ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴾ (آیت : ۱۸) ضروری نہیں کہ اس سے کسی خاص دن کی صبح ہی مراد لی جائے۔ ہر صبح ہی قیامت کی دلیل ہے، جس کے ساتھ سوئی ہوئی مخلوق بیدار ہو جاتی ہے اور موت کے بعد اٹھنے کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔

آیت② ﴿ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴾ سے بہت سے مفسرین نے ذوالحجہ کی پہلی دس راتیں مراد لی ہیں۔ اہل عرب حج کے ایام کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ ان دنوں میں ہر طرف سے لوگوں کا مکہ میں اجتماع قیامت کے دن کے اجتماع کی یاد دلاتا ہے، مگر لفظ عام ہیں تو بہتر ہے مفہوم بھی عام ہی رکھا جائے۔ چاند کی راتوں کا ہر عشرہ نئے انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے۔ پہلے عشرے میں چاند بڑھتا جاتا ہے، آخری میں گھٹتا جاتا ہے اور درمیانی عشرہ عروج و زوال کا جامع ہونے کے باوجود تقریباً روشن ہوتا ہے۔ یہ انقلاب قیامت قائم ہونے کی دلیل ہے۔

آیت③ جفت وہ عدد ہے، جو دو پر برابر حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ جیسے ۲، ۴، ۶ وغیرہ اور طاق وہ ہے جو اس طرح تقسیم نہیں ہوتا مثلاً ایک، تین، پانچ وغیرہ۔ کائنات کی کوئی بھی چیز گنتی کے وقت ان دو سے خالی نہیں۔ تمام چیزیں بڑھتے وقت بھی طاق سے جفت اور جفت

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝

اور رات کی قسم جب وہ چلتی ہے! ④ یقیناً اس میں عقل والے کے لیے کافی قسم ہے۔ ⑤ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کس طرح کیا۔ ⑥ (وہ عاد) جو ارم (قبیلہ کے لوگ) تھے، ستونوں والے۔ ⑦ وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔ ⑧

سے طاق ہوتی چلی جاتی ہیں اور گھٹتے وقت بھی۔ مثلاً ایک سے دو پھر تین پھر چار وعلی ھذا القیاس اور دس سے نو پھر آٹھ سے سات وعلی ہذا القیاس۔

آیت ④ سورہ مدثر میں فرمایا: ﴿ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴾ یعنی رخصت ہوتی ہوئی رات، قیامت قائم ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

آیت ⑤ قرآن مجید میں مذکور قسمیں عام طور پر کسی نہ کسی بات کی شہادت اور دلیل کے لیے آتی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قسمیں کھا کر عقل والوں کو کیا باور کروایا جا رہا ہے؟ جواب اگرچہ لفظوں میں موجود نہیں مگر آئندہ آیات سے صاف واضح ہے، یعنی ان سب چیزوں پر غور کرو تو تمھیں یقین ہو جائے گا کہ اتنے زبردست تغیرات لانے والا پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ تمھیں دوبارہ زندہ کر کے تمھارے اعمال کی جزا و سزا دے اور اگر تم سرکشی پر اڑے رہے تو عاد و ثمود اور قوم فرعون کی طرح دنیا میں بھی تم پر عذاب کا کوڑا برسا دے۔

آیت ⑥، ⑦ ﴿ اِرَمَ ﴾ نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک آدمی کا نام ہے جس کی نسل سے عاد ارم تھے عاد ارم سے مراد عاد اولیٰ ہے، جن کی طرف ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ عاد ثانیہ یا عاد اخری ثمود کو کہتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ارم خاص اس جگہ کا نام تھا جہاں عاد رہتے تھے۔ واللہ اعلم۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان لوگوں کی باتوں کو خرافات قرار دیا ہے جنھوں نے ارم ایک ایسا شہر بیان کیا ہے جس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی تھی۔

﴿ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ کے لفظی معانی ہیں ''ستونوں والے'' ان کا یہ لقب اس لیے ہے کہ وہ

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿٩﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿١٠﴾ الَّذِينَ طَغَوْا فِي
الْبِلَادِ ﴿١١﴾ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾ إِنَّ رَبَّكَ
لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾

اور ثمود کے ساتھ (کس طرح کیا؟) جنھوں نے وادی میں چٹانوں کو تراشا۔⑨ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (کس طرح کیا)۔⑩ وہ لوگ جو شہروں میں اپنی حد سے بڑھ گئے۔⑪ اور انھوں نے ان میں بہت زیادہ فساد پھیلا دیا۔⑫ تو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔⑬ یقیناً تیرا رب گھات میں ہے۔⑭

بڑے قد آور تھے (جس طرح کھجوروں کے تنے ۔ الحاقہ : ۷) اور اس لیے بھی کہ وہ بڑے بڑے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے اور محض شان وشوکت کے اظہار کے لیے اونچی سے اونچی یادگاریں بناتے تھے۔(الشعراء : ۱۲۸)

آیت⑨ مفسرین کہتے ہیں کہ ثمود پہلے لوگ ہیں جنھوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر گھر بنائے۔ (شوکانی) آج کل اس ''وادی القری'' کا نام ''العلاء'' ہے جو سعودی عرب میں ہے۔ اور وہ مدائن صالح (جو ثمود کا مرکزی شہر تھا) سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ (دیکھیے :الحجر:۸۲،اشرف الحواشی)

آیت⑩ ''میخوں والا''۔ بڑے لشکروں والا، جن کے خیمے گاڑنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں میخیں مہیا رہتی تھیں یا سخت ظالم کہ جس پر ناراض ہوتا اس کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھکوا دیتا تھا۔

آیت⑫ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر وشرک اور اس کی مخلوق پر ظلم وستم (اشرف الحواشی)

آیت⑬ ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر برسانے والی آندھی بھیجی، کسی کو چیخ نے پکڑ لیا، کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔(العنکبوت : ۴۰)

آیت⑭ جب مقرر وقت آتا ہے پکڑ لیتا ہے۔

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝١٥ وَأَمَّا
إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝١٦ كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ
الْيَتِيمَ ۝١٧ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝١٨ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝١٩
وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝٢٠

سو انسان تو ایسا ہے کہ جب اس کا رب اسے آزمائے پھر اسے عزت بخشے اور نعمت دے تو کہتا
ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ ⑮ اور لیکن جب اسے آزمائے اور اس پر اس کا رزق تنگ
کر دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ⑯ ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت
نہیں کرتے۔ ⑰ اور نہ آپس میں مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔ ⑱ اور تم میراث کا
مال سب سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ ⑲ اور مال سے محبت کرتے ہو، بہت زیادہ محبت کرنا۔ ⑳

آیت ⑮ تا ⑰ قیامت کے منکرین کے نزدیک چونکہ سبھی کچھ دنیا ہے اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں جو آسودہ حال ہے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے اور جو تنگ حال ہے اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہے فرمایا یہ بات ہرگز درست نہیں۔ فرعون اور دوسرے لوگوں کے واقعات ابھی تم نے سنے، ان کی خوش حالی اور پھر ان پر آنے والے عذاب کو یاد کرو تو سمجھ لو گے کہ دنیا کی آسودہ حالی یا بدحالی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے کہ کافر خوشحالی میں سرکشی اور تنگی میں شکوہ و ناشکری کر کے ناکام ہو جاتے ہیں اور مومن نعمت پر شکر کے ساتھ اور مصیبت میں صبر کے ساتھ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اور تمھارا حال تو یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ خوشحالی کی نعمت کا شکر ادا کرو اور بطور شکر مستحقین پر خرچ کرو تم اتنا بھی نہیں کرتے کہ یتیم کے ساتھ عزت کا برتاؤ ہی کر لو یا مسکین کو کھلاتے نہیں تو کسی دوسرے کو ترغیب ہی دے دو۔ تم تو میراث کا مال بھی جو تمھیں بغیر محنت کے مل گیا ہے، عطا فرمانے والے کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے حصے پر قناعت کی بجائے سارا ہی لپیٹ جاتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم مال عطا فرمانے والے

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ

ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔ (۲۱) اور تیرا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے۔ (۲۲)

کی بجائے مال سے محبت کرتے ہو اور حد سے بڑھ کر کرتے ہو۔

آیت (۲۱) ﴿ كَلَّآ ﴾ ’’ہرگز نہیں‘‘ یعنی تمھیں ہرگز ایسے نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ وقت سامنے رکھنا چاہیے جب قیامت کے پہلے نفخہ کے ساتھ زمین ریزہ ریزہ کرکے ہموار چٹیل میدان بنا دی جائے گی۔

آیت (۲۲) اور دوسرے نفخہ کے ساتھ تمام لوگ زندہ ہو کر اس چٹیل میدان میں کھڑے ہو کر انتظار کر رہے ہوں گے، اس وقت رب تعالیٰ جس طرح اس کی شان کے لائق ہے نزول فرمائے گا۔ ساتھ ہی فرشتے صف در صف آئیں گے، زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور عمل نامے پیش کیے جائیں گے۔ انبیاء اور گواہوں کو لایا جائے گا اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کیے جائیں گے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (الزمر : ٦٩)

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خود صاف الفاظ میں اس دن اپنے آنے کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آنے کے عجیب عجیب مطلب نکالے ہیں، چنانچہ کسی نے کہا رب کا حکم آئے گا۔ کسی نے کہا یہ صرف تمثیلی انداز ہے، مطلب صرف یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا رعب اس طرح طاری ہوگا جس طرح بادشاہوں کے آنے کے وقت ہوتا ہے۔ بعض بزرگوں نے ترجمہ میں تبدیلی کرکے حاشیہ لکھا ہے کہ (اصل الفاظ ہیں ’’وَجَآءَ رَبُّكَ‘‘ جن کا لفظی ترجمہ ہے ’’تیرا رب آئے گا‘‘ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا) ان بزرگوں کی غلطی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے جیسا سمجھا کہ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے تو اس کا پہلی جگہ سے منتقل ہونا لازم ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے آسمان دنیا پر اترنے یا زمین

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ؕ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۚ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ۙ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ؕ

اور اس دن جہنم کو لایا جائے گا، اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں؟ ۞۲۳ کہے گا اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے آگے بھیجا ہوتا۔ ۞۲۴ پس اس دن اس کے عذاب جیسا عذاب کوئی نہیں کرے گا۔ ۞۲۵ اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھے گا۔ ۞۲۶

پر آنے کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ وہ عرش پر نہیں رہا۔ اب تو اللہ کی مخلوق میں بھی اس کے عجائبات ظاہر ہو رہے ہیں کہ بجلی اپنے مستقر میں ہونے کے باوجود ریموٹ کے ذریعے بغیر تار کے کہاں تک پہنچ جاتی ہے خالق کی صفت تو مخلوق سے بہت ہی برتر ہے۔

پھر اس میں صرف یہی خرابی نہیں کہ اللہ کے آنے کی صفت کا انکار کیا بلکہ اسے مخلوق سے بھی عاجز جانا کہ مخلوق جہاں چاہے آ جا سکتی ہے مگر خالق میدان محشر میں فیصلے کے لیے بھی نہیں آ سکتا۔

مومن کا کام یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ وہ قیامت کے دن آئے گا تو اس پر ایمان رکھے اور یہ بات اللہ کے سپرد کر دے کہ وہ کس طرح آئے گا؟ یقیناً وہ اسی طرح آئے گا جس طرح اس کی شان کے لائق ہے اور جس کی تفصیل سمجھنا عاجز مخلوق کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

آیت ۞۲۳ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس دن جہنم اس حال میں لائی جائے گی کہ اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی، ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ کر لائیں گے۔
(صحیح مسلم۔ کتاب صفة النار۔ بَابٌ فِی ذِکْرِ اَزِمَّةِ النَّارِ)

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۖۗ ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۚ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۙ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۠

اے اطمینان والی جان! ۲۷ اپنے رب کے پاس واپس آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے، وہ تجھ سے راضی۔ ۲۸ پس میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا۔ ۲۹ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ ۳۰

آیت ۲۷ ﴿النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ﴾ ''اطمینان والی جان'' جسے اللہ، اس کے رسول اور ان کے احکام کے حق ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں، بلکہ پوری تسلی ہے۔

رکوعہا ۱ | (۹۰) سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ (۳۵) | آیاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝١ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝٢ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝٣ لَقَدْ خَلَقْنَا
الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝٤

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی! ① اور تو اس شہر میں رہنے والا ہے۔ ② اور جننے والے
کی قسم! اور اس کی جو اس نے جنا! ③ کہ یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ④

تفسیر سورۃ البلد

آیت ① تا ④ قسم سے پہلے "نہیں" کہہ کر ان لوگوں کی بات کی نفی کی گئی ہے جو قسم کے بعد آنے والی بات کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چند قسموں کے بعد فرمایا: یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے، اگر وہ سمجھے کہ میں دنیا میں عیش و آرام کے لیے آیا ہوں تو اس کا خیال غلط ہے۔ اس حقیقت کا یقین دلانے کے لیے پہلی قسم شہر مکہ کی کھائی، جو اس دعوے کی دلیل بھی ہے۔ اس شہر کی آبادی کی ابتدا، اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی زندگی، ان کے بعد کی تاریخ، خصوصاً اس شہر میں رہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، آپ کی یتیمی اور بے سروسامانی، نبوت کی ذمہ داری کے بعد اپنی ہی قوم کا جان لینے کے درپے ہو جانا، یہ سب چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ انسان یقیناً مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جننے والے ماں باپ اور ان کے جنم دیے ہوئے بچے کی قسم ہے۔ ماں باپ کو اولاد کے حصول کی جستجو سے لے کر ان کی پرورش تک جن مصائب سے گزرنا پڑتا ہے اور ان کے جنم دیے ہوئے بچے پر نطفہ ہونے سے لے کر ولادت تک پھر ولادت سے بچپن، جوانی اور بڑھاپے

أَيَحْسَبُ أَن لَّن يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝٥ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝٦ أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ
يَرَهُ أَحَدٌ ۝٧ أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝٨ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝٩ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝١٠

کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہوگا۔⑤ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال برباد کر
ڈالا۔⑥ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟⑦ کیا ہم نے اس کے لیے نہیں
بنائیں دو آنکھیں۔⑧ اور زبان اور دو ہونٹ۔⑨ اور ہم نے اسے دو واضح راستے دکھا دیے۔⑩

تک جو کچھ گزرتا ہے، وہ سب کچھ اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ شروع سے آخر تک سختیاں اور مصیبتیں ہی جھیلتا رہتا ہے۔ کبھی بیماری میں گرفتار ہے، کبھی رنج میں، کبھی فقر و فاقہ میں، کبھی کسی اور فکر میں، اگر کبھی کسی خوشی یا راحت کا کوئی لمحہ آتا بھی ہے تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور ہوتی ہے۔ کوئی اور نہ ہو تو اس کے زوال کا فکر ہی اسے مکدر کرنے کے لیے کافی ہے۔

آیت⑤ جن سختیوں اور مصیبتوں میں آدمی زندگی بسر کرتا ہے ان کا تقاضا تو تھا کہ وہ اپنی حقیقت کو پہچانتا اور اس میں عاجزی اور انکساری کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اکڑفوں دکھاتا ہے اور سمجھتا ہے مجھ پر کون قابو پا سکتا ہے؟ (اشرف الحواشی)

آیت⑥ یعنی دین حق کی مخالفت یا جاہلانہ رسم و رواج میں روپیہ لٹانے کو بڑا کمال سمجھتا ہے اور اسے فخریہ بیان کرتا ہے۔ (اشرف الحواشی)

آیت⑦ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ جب وہ فخر و ریا کے لیے مال لٹا رہا تھا تو کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ یقیناً ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

آیت⑧،⑩ اس نے یہ گمان کیسے کر لیا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ اور نہ کوئی اس سے پوچھنے والا ہے؟ حالانکہ جن آنکھوں سے وہ دیکھ رہا ہے وہ ہم نے بنائی ہیں۔ زبان اور ہونٹ جن سے ڈینگیں مار رہا ہے، وہ بھی ہم نے پیدا کیے ہیں۔ پھر ہم نے اسے خیر و شر کے راستے کا شعور بھی عطا فرمایا ہے۔ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے آنکھیں عطا کرنے والا خود ہی دیکھ نہ رہا

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝

پس نہ گھسا وہ مشکل گھاٹی میں۔⑪ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ مشکل گھاٹی کیا ہے۔⑫ وہ گردن چھڑانا ہے۔⑬

ہو؟ اور اسے زبان اور ہونٹ دینے والا اسے پوچھ بھی نہ سکتا ہو اور خیر وشر کا شعور عطا فرمانے والا اس سے اس شعور کے استعمال کے متعلق باز پرس ہی نہ کرے؟

آیت⑪ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مال کی نعمت جو عطا فرمائی ہے اس کا تقاضا یہ نہ تھا کہ اسے ناحق اڑاتا، بلکہ یہ تھا کہ وہ بلندیاں جو سخت جدو جہد سے حاصل ہوتی ہیں، انھیں سر کرنے کے لیے مشکل گھاٹی میں بے دریغ گھس جاتا۔ مگر اس نے اس مشکل گھاٹی میں گھسنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ مشکل گھاٹی اس لیے فرمایا کہ نفس کو ان کاموں کا سرانجام دینا دشوار ہوتا ہے۔ (عقبہ: گھاٹی، پہاڑ پر چڑھنے کا مشکل راستہ)

آیت⑫، ⑬ مال دار کے لیے بلندیوں پر لے جانے والا مشکل راستہ کیا ہے؟ گردن چھڑانا، کیونکہ غلامی سے بڑی ذلت کوئی نہیں اور آزادی دلانے سے بڑھ کر کسی کے ساتھ کوئی حسن سلوک نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی اولاد اپنے والد کا بدلہ نہیں دے سکتی سوائے اس کے کہ اسے غلامی کی حالت میں پائے اور خرید کر اسے آزاد کر دے۔ (مُسْلِم۔ کِتَابُ الْعِتْقِ۔ بَابٌ فِیْ عِتْقِ الْوَلَدِ الْوَالِدَ)

گردن چھڑانے کی ایک اور فضیلت:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی مسلم گردن کو آزاد کرے اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کا ایک عضو آگ سے آزاد کرے گا حتیٰ کہ اس کی شرم گاہ کے بدلے اس کی شرمگاہ کو آزاد کر دے گا۔ (مسلم، کتاب العتق باب فضل العتق)

گردن چھڑانے میں غلام آزاد کرنے کے ساتھ کسی ناحق گرفتار کو رہائی دلوانا اور کسی

أَوْ إِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝

یا بھوک والے دن کھلانا ہے۔⑭ کسی قرابت والے یتیم کو۔⑮ یا مٹی میں ملے ہوئے کسی مسکین کو۔⑯ پھر (یہ کہ) ہو وہ ان لوگوں میں جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی۔⑰

مقروض کی گردن قرض سے چھڑانا بھی شامل ہے۔

آیت⑭ یوں تو قحط اور بھوک کے وقت کسی بھی یتیم کو کھانا کھلانا ثواب کا کام ہے لیکن جو یتیم رشتہ دار بھی ہو، اس کی خبر گیری کرنا مزید اجر کا باعث ہے۔ اسی معنی میں سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسکین پر صدقہ کرنا صدقہ ہے اور رشتہ دار مسکین پر صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی'۔ (مسند احمد، ترمذی، نسائی و صححہ الالبانی رحمہ اللہ)

آیت⑮ جنت کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے یہی کافی نہیں کہ گردنیں آزاد کرے یا یتیم اور مسکین کو کھانا کھلائے، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ایمان بھی ضروری ہے، اگر ایمان نہیں تو کوئی عمل قبول نہیں۔ [دیکھیے النساء: ۱۴۴، النحل: ۹۷، بنی اسرائیل: ۱۹]

پھر ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کرنے کی وصیت اور تاکید بھی ضروری ہے۔ سورۃ العصر میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

﴿ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ مشکل گھاٹی کی چڑھائی کے لئے جو امور ضروری ہیں ان میں پہلے گردن چھڑانا اور یتیم یا مسکین کو کھانا کھلانا ہے پھر اس کے بعد ایمان لانا اور حق و مرحمت کی وصیت کرنا ہے مگر اہل علم فرماتے ہیں کہ ''ثُمَّ'' ہمیشہ ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہوتا، بعض اوقات ترتیب ذکری کے لیے بھی ہوتا ہے۔ یعنی موقع کی مناسبت سے بعد کی ایک چیز پہلے ذکر کر دی جاتی ہے۔ یہاں مالداروں کے لیے خرچ کرنا چونکہ بہت مشکل کام ہے، اس لیے پہلے اس کا ذکر فرمایا، پھر ایمان اور تواصی بالحق

أُولَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلۡمَيۡمَنَةِ ۝ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بِـَٔايَٰتِنَا هُمۡ أَصۡحَٰبُ ٱلۡمَشۡـَٔمَةِ ۝ عَلَيۡهِمۡ نَارٞ مُّؤۡصَدَةُۢ ۝

یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں۔⑱ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہی بائیں ہاتھ والے ہیں۔⑲ انہی پر (چاروں طرف سے) آگ بند کی ہوئی ہوگی۔⑳

والمرحمۃ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ان کے بغیر گردن چھڑانا، کھانا کھلانا، یا نیکی کا کوئی بھی کام بے سود ہے۔

آیت⑱، ⑲ دائیں ہاتھ والے سے مراد یہ ہے کہ انھیں دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملے گا۔ اسی طرح بائیں ہاتھ والوں کو اس میں اعمالنامہ ملے گا۔ ﴿أَصۡحَٰبُ ٱلۡمَيۡمَنَةِ﴾ کا دوسرا معنیٰ برکت والے، خوش نصیب اور ﴿أَصۡحَٰبُ ٱلۡمَشۡـَٔمَةِ﴾ کا معنیٰ نحوست والے، بدنصیب بھی ہے۔

رکوعہا ۱ (۹۱) سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ (۲۶) آیاتہا ۱۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝

سورج کی قسم! اور اس کی دھوپ کی قسم! ①

تفسیر سورۃ الشمس

آیت ① سے لے کر آیت ⑧ تک تمام قسموں کا جواب قسم یہ ہے کہ ''جس شخص نے اپنے نفس کو پاک کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے مٹی میں دبا دیا وہ ناکام ہوا'' ان قسموں اور جواب قسم کی مناسبت یہ ہے (واللہ اعلم) کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لیے پیدا فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (البقرۃ:۲۹) ''وہ ذات کہ زمین میں جو کچھ ہے اس نے سب تمھارے لیے پیدا فرمایا'' حتیٰ کہ آسمان کی چھت، زمین کا فرش، سورج اور اس کی دھوپ، اس کے بعد چاند اور اس کی چاندنی، دن کو آفتاب کا اُجالا، پھر رات کا اس کو ڈھانپ لینا اسی کے فائدے کے لیے ہے: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴾ (ابراھیم: ۳۳) ''اور اس نے تمھارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو مسلسل چلنے والے ہیں اور تمھارے لیے رات اور دن کو مسخر کر دیا''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور نفس انسانی کو بہترین شکل وصورت میں بنا کر اسے نیکی اور بدی کی پہچان بھی کرا دی۔ ہر آدمی ان سب چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور شعور سے محسوس کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان مخلوقات کو اور ان کے خالق کے احسانات کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر اپنے آپ کو کفر وشرک

وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰىهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰىهَا ۝۳ وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰىهَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵
وَالْأَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ
أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا ۝۱۱

اور چاند کی قسم جب وہ اس کے پیچھے آئے!۲ اور دن کی قسم جب وہ اس (سورج) کو ظاہر کر دے!۳ اور رات کی قسم جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لے!۴ اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بنایا!۵ اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا!۶ اور نفس کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ٹھیک بنایا!۷ پھر اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیزگاری (کی پہچان) اس کے دل میں ڈال دی۔۸ یقیناً کامیاب ہوگیا وہ جس نے اسے پاک کر لیا۔۹ اور نامراد ہوگیا وہ جس نے اسے مٹی میں دبا دیا۔۱۰ قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے (صالح کو) جھٹلا دیا۔۱۱

اور ظلم و زیادتی سے پاک کر لیتا ہے، یقیناً وہ اپنا مقصد تخلیق پورا کر دینے کی وجہ سے کامیاب ہے اور جو شخص ان سب چیزوں سے آنکھیں بند کر کے اپنے نفس کو شہوت، غضب اور شرک و کفر کے کیچڑ میں دبا دیتا ہے، وہ ناکام ہے۔

آیت۲ یعنی سورج غروب ہونے کے بعد جب چاند کی روشنی پھیلتی ہے۔

آیت۳ یعنی جب اس میں سورج پوری روشنی اور گرمی کے ساتھ چمکتا ہے۔

آیت۴ جب رات سورج کی روشنی کو مکمل طور پر چھپا کر خوب اندھیری ہو جاتی ہے۔

آیت۸ یہ پہچان پہلے عقل و فطرت میں رکھی گئی، پھر انبیاء کے ذریعے دوبارہ یاددہانی کروائی گئی تاکہ نافرمانی سے بچیں اور پرہیزگاری اختیار کریں۔

آیت۱۱ بطور مثال تاریخ میں سے ایک قوم کا ذکر فرمایا، جس نے سرکشی کی وجہ سے اپنے آپ کو مٹی میں دبا دیا۔ ثمود، صالح علیہ السلام کی قوم تھی۔ ان کے معجزہ طلب کرنے پر انھیں ایک اونٹنی

إِذِ انۢبَعَثَ أَشْقٰىهَا ۝١٢ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝١٣ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۥ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝١٤ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝١٥

جب اس کا سب سے بڑا بدبخت اٹھا۔ ⑫ تو ان سے اللہ کے رسول نے کہا اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری سے بچو۔ ⑬ تو انھوں نے جھٹلا دیا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں، تو ان کے رب نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پیس کر ہلاک کر دیا، پھر اس (بستی) کو برابر کر دیا۔ ⑭ اور وہ اس سزا کے انجام سے نہیں ڈرتا۔ ⑮

دی گئی اور انھیں کہا گیا کہ ایک دن اس کے پینے کی باری ہوگی اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کی (الشعراء : ۱۵۵)

آیت ⑫ جن لوگوں کے مویشی زیادہ تھے ان پر یہ پابندی بہت شاق گزری اور انھوں نے اسے کاٹ ڈالنے پر اتفاق کر لیا، مگر اس کام کا بیڑا ان کے سب سے بڑے بدبخت نے اٹھایا۔ تاریخ اور شعر عرب میں اس کا نام قُدار بن سَالِف بیان کیا گیا ہے۔

آیت ⑬ ﴿نَاقَةَ اللّٰهِ﴾ ’’اللہ کی اونٹنی‘‘ اس کے شرف اور خصوصیت کی وجہ سے ہے، جیسے بیت اللہ، ورنہ سب اونٹنیاں اللہ ہی کی ہیں۔

آیت ⑭ اگرچہ ایک آدمی نے کونچیں کاٹ کر اسے ہلاک کیا تھا، لیکن چونکہ ساری قوم اس کے ساتھ تھی بلکہ انھی کے کہنے پر اس نے یہ کام کیا تھا، اس لیے ان سب کو مجرم قرار دیا گیا اور فرمایا کہ: ’’انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں‘‘۔

قاموس میں ہے: ’’دَمَّ الْقَوْمَ كَدَمَّهُمْ وَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ طَحَنَهُمْ فَأَهْلَكَهُمْ‘‘ یعنی ﴿دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ﴾ اس نے انھیں پیس کر ہلاک کر دیا۔ اونٹنی کو مار ڈالنے کے تین دن بعد ان پر ایک زبردست غیبی چیخ کے ساتھ عذاب آیا اور وہ اس طرح نابود ہوگئے جیسے کبھی وہاں تھے ہی نہیں۔ صرف صالح علیہ السلام اور اہل ایمان بچے۔ [دیکھیے سورہ ہود آیت ۶۲ تا ۶۸]۔

آیت ⑮ یعنی دنیا کے بادشاہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو ڈرتے ہیں کہ نامعلوم اس کا انجام کیا

ہوگا؟ مقتول کا کون سا وارث بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہو یا ملک میں بغاوت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں۔

رکوعھا ۱ (۹۲) سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ (۹) اٰیاتھا ۲۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۝ اِنَّ سَعْيَكُمْ
لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝

رات کی قسم جب وہ چھا جائے! ① اور دن کی قسم جب وہ روشن ہو! ② اور اس کی قسم جو اس نے پیدا کیا نرا ور مادہ! ③ کہ یقیناً تمھاری کوشش مختلف ہے۔ ④ پس وہ جس نے دیا اور (نافرمانی سے) بچا۔ ⑤ اور سب سے اچھی بات کو سچ مانا ⑥ تو ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ ⑦

تفسیر سورۃ اللیل

آیت ③ یعنی ان چیزوں کی قسم! جو اس نے پیدا کیں، نر ہیں یا مادہ ﴿الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى﴾ ﴿مَا خَلَقَ﴾ سے بدل ہے۔ ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا۔ تیسرا ترجمہ ہے نر اور مادہ کو پیدا کرنے کی قسم۔

آیت ① تا ④ یعنی جس طرح رات دن اور نر و مادہ مخلوقات میں باہمی اختلاف اور تضاد ہے، اسی طرح تمھاری کوششوں اور تمھارے اعمال میں بھی اختلاف ہے۔ پھر ان کا نتیجہ اور جزا و سزا بھی الگ الگ ہے۔

آیت ⑤ تا ⑦ ﴿حُسْنٰى﴾ اَحْسَنُ کی مؤنث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝﴾ (حم السجدہ : ۳۳)
''اور اس شخص سے زیادہ اچھی بات کس کی ہے؟ جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرماں برداروں سے ہوں''۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝۹ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ۝۱۰ وَمَا
يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۝۱۱ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰی ۝۱۲

اور لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا۔ ⑧ اور سب سے اچھی بات کو جھٹلا دیا۔ ⑨ تو ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ ⑩ اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا جب وہ (گڑھے میں) گرے گا۔ ⑪ بلاشبہ راستہ بتانا ہمارے ہی ذمے ہے۔ ⑫

جس شخص میں بھلائی کے یہ تین جامع وصف ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے فراخ دل ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی اور ہر حرام کام سے بچتا ہے اور سب سے اچھی بات یعنی اللہ کے ایک ہونے کو اور اس کی نازل کی ہوئی ہر بات کو سچ مان کر اس کا تابع ہو جاتا ہے۔ اس کے اس میلان اور رجحان کے مطابق ہم بھی اس کے لیے نیکی اور جنت کے راستے پر چلنا آسان کر دیں گے، یعنی اس کے لیے نیکی کرنا آسان ہو جائے گا اور گناہ کرنا مشکل۔

آیت ⑧ تا ⑩ یعنی جس میں شر کے یہ تین جامع وصف ہیں کہ وہ بخل کرتا ہے، اخروی انجام اور حلال و حرام کی پروا ہی نہیں کرتا اور سب سے اچھی بات یعنی اللہ کے ایک ہونے اور اس کی نازل کردہ باتوں کو جھٹلاتا ہے، ہم بھی اسے اس کی خواہش کے مطابق اس راستے پر چلنے دیتے ہیں جو مشکلات و مصائب کا راستہ ہے اور جہنم کی طرف لے جانے والا ہے، یعنی اس کے لیے نیکی کرنا مشکل اور گناہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

آیت ⑪ جب جہنم میں گرے گا تو وہ مال جو اس نے بخل کر کے جمع کیا تھا اس کے کسی کام نہ آئے گا۔

آیت ⑫ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی﴾ (البقرۃ: ۱۲۰) ''کہہ دے اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے''۔ جو راستے لوگوں نے اپنی مرضی سے یا آباء و اجداد کو دیکھ کر یا غیر قوموں کی نقل کرتے ہوئے اختیار کیے ہیں وہ چونکہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں اس لیے

وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ۝ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝

اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہی ہماری ہیں۔⑬ پس میں نے تمھیں ایک ایسی آگ سے ڈرا دیا ہے جو شعلے مارتی ہے۔⑭ جس میں اس بدبخت کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہوگا۔⑮ جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔⑯

کتنے بھی خوشنما ہوں ہدایت نہیں، ضلالت ہیں۔ اللہ کی ہدایت وہ ہے جو خود اس کی طرف سے آئی ہو۔

آیت ⑬ راستہ بتانا صرف ہمارے ذمے کیوں ہے؟ اس لیے کہ دنیا اور آخرت دونوں کے بنانے والے اور مالک ہمیں ہیں تو ان کا راستہ بھی ہم ہی جانتے ہیں۔

آیت ⑭ میرا کام راستہ بتانا ہے، وہ میں نے بتا دیا اور نہ ماننے والوں کو زبردست شعلے مارتی ہوئی آگ سے ڈرا دیا، اب ماننا یا نہ ماننا تمھارا کام ہے۔ سب کو زبردستی مسلمان بنا دینا میری حکمت کے خلاف ہے۔

آیت ⑮ اسی آیت سے مُرجیہ (ایک باطل فرقہ) نے استدلال کیا ہے کہ جہنم میں صرف کافر ہی جائیں گے۔ کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو وہ جہنم میں نہیں جائے گا، لیکن یہ عقیدہ ان صریح آیات و احادیث کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی جن کو اللہ تعالیٰ کچھ سزا دینا چاہے گا، کچھ عرصے کے لیے جہنم میں جائیں گے۔ پھر وہ نبی ﷺ، ملائکہ اور دیگر صالحین کی شفاعت یا محض اللہ کی رحمت سے نکال لیے جائیں گے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ﴾ (النساء : ۱۱۶) یعنی ''بے شک اللہ تعالیٰ یہ بات معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے، اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا''۔ اب اگر وہ شخص جو شرک نہیں کرتا بلکہ مسلمان ہے وہ جہنم میں جائے گا ہی نہیں تو (اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا) بالکل بے معنیٰ

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضَى ۝

اوراس سے دور رکھا جائے گا وہ جو بڑا پرہیز گار ہے۔۱۷ جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔۱۸ حالانکہ اس پر کسی کا احسان نہیں ہے جس کا اسے بدلہ دیا جائے۔۱۹ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کی رضا طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے۔۲۰ اور واقعی وہ راضی ہو جائے گا۔۲۱

کلام بن جائے گا پھر تو یوں کہنا چاہئے کہ اس کے علاوہ وہ سب کچھ معاف کر دے گا "چاہے گا" کی شرط کی ضرورت نہیں۔ صحیح بخاری میں مذکور احادیث شفاعت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ اس میں صرف بڑے بدبخت داخل ہوں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ پکے کافر اور نہایت بدبخت ہیں جہنم دراصل ان ہی کے لیے بنائی گئی ہے جس میں وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے داخل ہوں گے۔ اگر کچھ نافرمان قسم کے مسلمان جہنم میں جائیں گے تو وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے نہیں جائیں گے بلکہ بطور سزا ان کا یہ دخول عارضی ہوگا۔

آیت ۱۷، ۱۸ جہنم سے وہی شخص دور رہے گا جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ وہ خود بھی پاک ہو جائے اور اس کا مال بھی۔

آیت ۱۹ وہ مال اس لیے خرچ نہیں کرتا کہ کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا چاہتا ہے۔

آیت ۲۰ بلکہ خرچ کرنے سے اس کی نیت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رضا اور جنت میں اس کا دیدار نصیب ہو جائے۔

آیت ۲۱ یعنی جنت کی بے بہا نعمتیں اور بلند مراتب پا کر ضرور خوش ہوگا۔

اکثر مفسرین نے صحیح احادیث و آثار کی رو سے کہا ہے کہ اس سورہ میں خرچ کرنے والے سے مراد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں کہ وہ کمزور غلام مسلمانوں کو کفار کے مظالم سے بچانے

کے لیے خرید کر آزاد کر دیتے اور نیکی کا ہر کام خوشی خوشی محض رضائے الٰہی کے لیے کرتے تھے۔ یقیناً ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان آیات کا اولین مصداق ہیں مگر لفظ عام ہیں اس لیے ان میں ہر وہ مسلمان داخل ہے جو ان صفات کا حامل ہے۔

رکوعہا ۱ (۹۳) سورۃ الضحیٰ مکیۃ (۱۱) آیاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ

دھوپ چڑھنے کے وقت کی قسم! ① اور رات کی قسم جب وہ چھا جائے! ② کہ نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ تجھے ناپسند کیا۔ ③

تفسیر سورۃ الضحیٰ

آیت ① تا ③ جندب بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے تو دو یا تین راتیں (تہجد کے لیے) نہیں اٹھے۔ ایک عورت آئی اور کہنے لگی، اے محمد! مجھے امید ہے کہ تمھارا شیطان تمھیں چھوڑ گیا ہے۔ دو تین راتوں سے میں نے اسے تمھارے پاس آتے نہیں دیکھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل فرمائی۔ (صحیح بخاری، تفسیر والضحیٰ)

جندب رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ ایک دفعہ جبریل علیہ السلام نے آنے میں دیر کر دی۔ یہاں تک کہ مشرکین کہنے لگے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل فرمائی۔ (تفسیر ابن جریر سورۃ والضحیٰ)

قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ دوپہر کو سورج خوب روشن ہوتا ہے اس کے بعد سیاہ رات چھا جاتی ہے تو کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی وجہ سے ہے تو وحی کی روشنی کے بعد کچھ دیر اگر وقفہ ہو گیا تو کیوں سمجھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دن بھر آفتاب کی روشنی و گرمی کے بعد انسانی جسم کو آرام اور سکون کے لیے رات کی ضرورت ہے اسی طرح وحی کے بارگراں کے بعد طبیعت کو سکون

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷

اور یقیناً پیچھے آنے والی حالت تیرے لیے پہلی سے بہتر ہے۔④ اور تیرا رب تجھے ضرور (اتنا) عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا۔⑤ کیا اس نے تجھے یتیم نہ پایا، پس جگہ دی۔⑥ اور تجھے راستے سے ناواقف پایا تو راستہ دکھا دیا۔⑦

اور مزید وحی کے تحمل کے لیے وقفہ کی ضرورت ہے۔

آیت④ اس میں آپ کو تسلی دلائی کہ ہر آنے والا لمحہ آپ کے لیے پہلے لمحہ سے بہتر آیا ہے۔ اسی طرح آئندہ بھی بعد کی ہر حالت آپ کے لیے پہلی سے بہتر ہوگی۔ نبوت کے بعد کی زندگی آپ کے لیے پہلے سے بہتر اور آخرت دنیا سے بہتر ہوگی۔

آیت⑤ یہ مزید تسلی ہے اس میں اللہ کی فتح و نصرت، لوگوں کا فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا، زمین کے مشارق و مغارب کا آپ کی امت کے قبضے میں آنا، قیامت کو آپ کے ہاتھ میں لِوَاءُ الْحَمْدِ ہونا، مقام محمود ملنا، شفاعت کبریٰ، امت کی مغفرت، غرض وہ سب کچھ شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا اور دے گا۔

آیت⑥ اس میں آپ کے ابتدائی حالات کا بیان ہے۔ آپ پیٹ میں تھے کہ والد فوت ہوگئے۔ والدہ نے آپ کو پالا، ۶ برس کے تھے کہ والدہ فوت ہوگئیں، پھر دادا نے پرورش کی۔ آٹھ برس کے تھے کہ وہ بھی فوت ہوگئے، پھر چچا ابوطالب نے بیٹوں سے بڑھ کر پالا۔ یہ سب اسباب اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے فضل سے مہیا کیے۔

آیت⑦ نبوت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی برائی سے آپ کی حفاظت فرمائی، حتیٰ کہ فرمایا: ''انھیں کہہ دو کہ میں نے نبوت سے پہلے ایک عمر تم میں گزاری ہے کیا تم عقل نہیں کرتے''۔ (یونس : ۱۶) مگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہ آپ کو معلوم نہ تھا۔ یہ اس وقت معلوم ہوا جب اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَكَذٰلِكَ

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ۝ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

اور تجھے تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔ ⑧ پس جو یتیم ہے اس پر سختی نہ کر۔ ⑨ اور جو سوال کرنے والا ہے اسے مت جھڑک۔ ⑩ اور جو تیرے رب کی نعمت ہے اسے بیان کر۔ ⑪

أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ ﴾ (الشوریٰ : ۵۲)

”اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے وحی نازل فرمائی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے؟ اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے؟“ اس آیت میں اس احسان کا ذکر ہے کہ تم راستے سے ناواقف تھے، وہ تمھیں ہم نے بتایا۔

آیت ⑧ نبی ﷺ کے والد نے میراث میں صرف ایک اونٹنی اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔ پھر آپ چند قیراط پر اہل مکہ کی بکریاں چراتے رہے۔ اتنے افلاس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح غنی کر دیا کہ مکہ کی سب سے مالدار خاتون خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہلے آپ کو تجارت میں شریک کیا پھر نکاح کر لیا اور اپنا تمام مال آپ کے حوالے کر دیا۔

آیت ⑨ آپ نے یتیمی دیکھی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں بھی دیکھی ہیں۔ اب دونوں چیزوں کا تقاضا ہے کہ یتیم پر سختی نہ کرو بلکہ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرو۔

آیت ⑩ اسی طرح آپ نے تنگدستی دیکھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا غنی کرنا بھی، ان دونوں کا تقاضا ہے کہ سائل کی ضرورت پوری کرو۔ اگر نہیں کر سکتے تو لطف و کرم سے پیش آؤ، جھڑکی نہ دو اور آپ نے کتاب اور ایمان سے ناواقفی کا زمانہ دیکھا ہے، پھر اللہ نے آپ کو یہ نعمتیں دیں، اب اگر کوئی علم کے متعلق سوال کرے یا کسی چیز کا سوال کرے تو اسے ڈانٹنا ہرگز نہیں۔

آیت ⑪ اور شکر ادا کرنے کے لیے اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہو۔

رکوعہا ۱ (۹۴) سورۃ الانشراح مکیۃ (۱۲) آیاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝

کیا ہم نے تیرے لیے تیرا سینہ نہیں کھول دیا؟① اور ہم نے تجھ سے تیرا بوجھ اتار دیا۔② جس نے تیری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔③

تفسیر سورۃ الم نشرح

آیت ① سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کے حق ہونے پر اطمینان، دل کا نور ہدایت سے روشن ہونا اور ذکر الٰہی سے نرم ہونا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ (الانعام آیت ۲۶) ''جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے'' اور فرمایا: ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰي نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الزمر: ۲۲) ''کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے (وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو ایسا نہیں؟) پس ویل ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل سخت ہیں۔ یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں''۔

اس کے علاوہ شرح صدر سے مراد طبیعت کا رسالت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے خوشدلی کے ساتھ آمادہ ہونا بھی ہے، جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تو انھوں نے کہا ﴿وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ﴾ ''میرا سینہ اس سے تنگ ہوتا ہے'' اور دعا کی: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ (طٰہٰ: ۲۵) ''اے میرے رب میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔''

آیت ②، ③ بوجھ اتار دینے سے مراد وحی الٰہی برداشت کرنے کی استعداد پیدا کرنا ہے جس

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۵﴾ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۶﴾

اور ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر دیا۔④ کیونکہ یقیناً مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہے۔⑤ بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔⑥

کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ﴾ (مزمل: ۵) ''یقیناً ہم تجھ پر ایک بھاری بات نازل کریں گے''۔ حدیث میں ہے جب آپ پر وحی اترتی تو اس کے بوجھ سے وہ اونٹنی جس پر آپ سوار ہوتے، بیٹھ جاتی۔ (مسند احمد ۱۱۸/۶ حدیث ۲۴۷۴۹۔ اس کی سند صحیح ھے)

اس کے علاوہ نبوت کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی مراد ہے۔ جسے آپ بہت شدت سے محسوس کرتے تھے۔ ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴾ (الشعراء: ۳) ''شاید آپ اپنے آپ کو اس لیے ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے''۔ اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کا طریقہ سکھا کر یہ بوجھ بھی اتار دیا۔

آیت④ یعنی دنیا اور آخرت میں آپ کا نام بلند کیا، زمین کے مشرق و مغرب تک آپ کی امت کی حکومت پھیلا دی، کلمہ شہادت، اذان، اقامت، خطبہ، تشہد وغیرہ میں اللہ کے نام کے ساتھ آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ اللہ کی اطاعت کے ساتھ آپ کی اطاعت فرض ہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں جس میں کہیں نہ کہیں آپ کا ذکر خیر نہ ہو رہا ہو۔ قیامت کو اولاد آدم کی سیادت، کوثر، لواء الحمد، مقام محمود، شفاعت کبریٰ کے ساتھ آپ کا ذکر بلند ہوگا۔

آیت⑤، ⑥ اس میں آپ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بشارت ہے کہ مشکلات کے دن تھوڑے ہیں۔ ہر مشکل کے بعد بلکہ اس کے ساتھ ہی آسانی شروع ہو جاتی ہے: ﴿ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ کا یہی مطلب ہے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ ایک ایک مشکل کے ساتھ دو دو آسانیاں ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے اللہ تعالیٰ نے دہرا کر یہ بات فرمائی ہے کہ: ﴿ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ اور عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی اسم دوسری دفعہ

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر۔⑦ اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کر۔⑧

معرفہ ہو کر آئے خواہ پہلی دفعہ وہ نکرہ کی صورت میں آیا ہو یا معرفہ کی صورت میں، تو اس سے مراد پہلا اسم ہی ہوتا ہے اور اگر وہ پہلے نکرہ آئے اور دوبارہ بھی نکرہ ہو کر آئے تو وہ پہلے نکرہ سے الگ ہوتا ہے۔ یہاں دوسری دفعہ اَلْعُسْرِ معرفہ آیا ہے جب کہ يُسْرًا نکرہ ہو کر آیا ہے تو معنیٰ یہ ہوا کہ اسی پہلی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے یعنی ایک مشکل کے ساتھ دو آسانیاں ہیں۔ اس قاعدے کی ایک مثال سورہ مزمل کی آیات ہیں: ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ...... الخ﴾ ”ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شہادت دینے والا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی ......الخ“ پہلے رسول سے مراد ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں، دوسرے سے موسیٰ علیہ السلام، تیسرا الرَّسُوْل معرفہ آیا ہے اس سے مراد وہی رسول ہے جو اس سے پہلے مذکور ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

آیت ⑦، ⑧ آپ کے دنیا کے کام ہوں یا تبلیغ دین یا جہاد فی سبیل اللہ، اگرچہ یہ سب عبادات اور نیکیاں ہیں مگر ان میں پھر بھی مخلوق سے کچھ نہ کچھ رابطہ رہتا ہے۔ جب بھی ان کاموں سے کچھ فراغت ملے، ہر چیز سے منقطع ہو کر اپنے رب سے تعلق جوڑ کر ذکر الٰہی، تلاوت قرآن اور قیام، رکوع وسجود کی محنت کریں اور اپنی تمام رغبت اپنے رب ہی کی طرف رکھیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ مزمل کے شروع میں کہی گئی ہے: ﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝﴾ ”یقیناً تجھے دن میں بہت لمبی مصروفیت ہے تو اپنے رب کا نام ذکر کیا کر اور تمام مخلوق سے کٹ کر اس کی طرف متوجہ ہو جا“۔

رُكُوْعُهَا ۱ — (۹۵) — سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ — (۲۸) — اٰيَاتُهَا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا
الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵

انجیر کی قسم! اور زیتون کی قسم! ① اور طور سینین کی قسم! ② اور اس امن والے شہر کی قسم! ③ کہ یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔ ④ پھر ہم نے اسے لوٹا کر نیچوں سے نیچا کر دیا۔ ⑤

تفسیر سورۃ التین

اٰیت ① انجیر اور زیتون دو پھل ہیں جو اپنی جامعیت اور فوائد کی کثرت میں انسان کے جامع الفضائل ہونے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔ اس لیے انھیں انسان کے احسن تقویم میں پیدا کیے جانے کے شاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین نے انجیر اور زیتون سے مراد سر زمین شام لی ہے، جہاں یہ کثرت سے اُگتے ہیں اور جہاں عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے بہت سے پیغمبر پیدا ہوئے۔

اٰیت ② طور سینا جہاں اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے۔

اٰیت ③ شہر مکہ جو ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے آباد کیا اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

اٰیت ④ قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ سر زمین شام میں پیدا ہونے والے جلیل القدر پیغمبروں اور طور سینا اور شہر مکہ کی شہرت کا باعث بننے والے پیغمبروں کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔

اٰیت ⑤ پھر اگر یہ اپنا مقصد حیات پورا نہ کرے تو اس سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں: ﴿اُولٰٓىِٕكَ

﴿ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿٦﴾ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ﴿٧﴾ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ﴿٨﴾ ﴾

مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔⑥ پس اس کے بعد کون سی چیز تجھے جزا کے بارے میں جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے۔⑦ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟⑧

كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ﴾ (الاعراف : ۱۷۹) ''یہ لوگ جانوروں کی طرح بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں''۔

آیت⑥ اور اگر یہ احسن تقویم کے مطابق ایمان لا کر عمل صالح کرے تو اس کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

آیت⑦ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا پھر بعض نے تو اس ساخت کے تقاضوں کے مطابق ایمان اور عمل صالح اختیار کیا اور بعض نافرمانی کی وجہ سے اسفل سافلین ٹھہرے۔ ان دونوں کے عمل کا لازمی نتیجہ ہے کہ ایک دن ایسا ہو جس میں ہر ایک کو نیکی اور بدی کی جزا دی جائے۔ اتنی واضح دلیل کے بعد اے انسان! تجھے کون سی چیز آمادہ کر رہی ہے کہ تو جزا کو جھٹلا دے۔ اس کا دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے نبی! اس کے بعد کون ہے جو تجھے جزا کے بارے میں جھٹلائے''۔

آیت⑧ کوئی معمولی سا انصاف کرنے والا ہو وہ بھی اپنے اختیار میں جزا و سزا کا اہتمام کیے بغیر نہیں رہے گا تو اللہ جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے وہ اس کا اہتمام کیوں نہیں کرے گا؟

فائدہ: ترمذی وغیرہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی سورۃ والتین والزیتون پڑھے اور: ﴿ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ﴾ پر پہنچے تو کہے: بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ (کیوں نہیں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں) مگر یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ ترمذی نے فرمایا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اعرابی

نے یہ روایت بیان کی ہے جس کا نام ہی معلوم نہیں۔ (ترمذی ، ابواب التفسیر ، سورۃ التین)

رکوعہا ۱ (۹۶) سُورَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ (۱) آیاتہا ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ ①

تفسیر سورۃ العلق

یہ قرآن مجید کی پہلی وحی ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک لمبی حدیث میں وحی کے آغاز کا ذکر ہے کہ وہ سچے خوابوں سے ہوا پھر آپ غار حرا میں کئی کئی راتیں خلوت اختیار کرنے لگے، وہیں آپکے پاس فرشتہ آیا اور آپ سے کہا ((اِقْرَاْ)) (پڑھ) آپ نے کہا: ((مَا اَنَا بِقَارِئٍ)) (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں)۔ جبریل علیہ السلام نے آپ کو زور سے دبایا اور پھر وہی لفظ ((اِقْرَاْ)) کہا۔ آپ وہی جواب ((مَا اَنَا بِقَارِئٍ)) دیتے رہے۔ تیسری دفعہ زور سے دبانے کے بعد فرشتے نے کہا: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ...... مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴾ تک (بخاری تفسیر اقرء باسم ربك)

آیت ① فائدہ ① پہلی وحی میں پڑھنے کا حکم دینے سے پڑھنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

فائدہ ② معلوم ہوتا ہے فرشتے نے لکھے ہوئے یہ الفاظ آپ کے سامنے پیش کر کے پڑھنے کے لیے کہا تھا ورنہ اگر سن کر دہرانا مقصود ہوتا تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ ((مَا اَنَا بِقَارِئٍ))

''الدر المنثور'' میں عبدالرزاق اور عبد بن حمید کے حوالے سے زہری اور عمرو بن دینار کی مرسل روایت ہے کہ نبی ﷺ حرا میں تھے کہ فرشتہ آپ کے پاس ریشم کا نمدہ لے کر

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ

انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ ②

آیا، جس میں: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ...... مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴾ تک لکھا ہوا تھا۔ اس مرسل کی سند صحیح ہے۔

یہی روایت حاکم نے ثقہ راویوں سے روایت کی ہے جس میں عمرو بن دینار نے یہ روایت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے مگر ساتھ ہی لکھا ہے کہ ابوعلی حافظ نے فرمایا کہ جابر رضی اللہ عنہ کا ذکر اس میں وہم ہے۔ بہرحال قرائن اور اس مرسل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل علیہ السلام یہ آیت کسی چیز میں لکھی ہوئی لائے تھے مگر یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کیونکہ یہ روایت صحت و اتصال کے مطلوبہ درجے کو نہیں پہنچتی۔

فائدہ 3 پھر اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا حکم دیتے وقت اپنے رب ہونے اور پیدا کرنے کی نعمت کا ذکر فرمایا کیونکہ سب سے پہلی اور بڑی نعمت پیدا کرنا ہے، باقی نعمتیں اس کے بعد ہیں، خلق ہی نہ ہوتو کچھ بھی نہیں۔ دوسری نعمت رب ہونا، پرورش کرنا ہے، یعنی ان نعمتوں والی ہستی کے نام کی برکت سے پڑھ۔ اس کی برکت سے تو قاری بھی بن جائے گا۔

فائدہ 4 ﴿ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ ''جس نے پیدا کیا''۔ مفعول حذف کر دیا ہے کہ کسے پیدا کیا؟ یعنی پیدا کرنا کام ہی اسی کا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کسے پیدا کیا؟

آیت ② رحم میں قرار پکڑنے کے بعد نطفہ سب سے پہلے علقہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ عَلِقَ يَعْلَقُ چمٹنے کو کہتے ہیں، عَلَقَة جما ہوا خون جو رحم کی دیوار کے کسی حصے سے چپک جاتا ہے۔ عَلَقَة کا دوسرا معنیٰ جونک ہے، وہ بھی کسی نہ کسی کو چمٹ جاتی ہے۔ خون کی وہ پھٹکی شکل وصورت میں جونک سے ملتی جلتی ہوتی ہے، اس میں نہ جان ہوتی ہے نہ شعور اور نہ عقل وعلم، پھر اللہ تعالیٰ اس حقیر سی پھٹکی سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرما دیتا ہے۔

اِقۡرَاۡ وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾ كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰی ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجۡعٰی ؕ﴿۸﴾

پڑھ اور تیرا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ ③ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔ ④ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ⑤ ہرگز نہیں، یقیناً انسان حد سے نکل جاتا ہے۔ ⑥ جب وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غنی ہوگیا ہے۔ ⑦ یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ⑧

آیت ③، ④ فائدہ ① رسول اللہ ﷺ کے دہشت زدہ ہو جانے کی وجہ سے دوبارہ فرمایا، پڑھ، تجھے وہ پڑھا رہا ہے جس سے زیادہ کرم والا کوئی نہیں۔

فائدہ ② یہ اس کے کرم کی انتہا ہے کہ اتنی حقیر چیز سے پیدا ہونے والے انسان کو علم جیسی بلند ترین صفت سے نواز دیا بلکہ قلم کے ساتھ علم سکھایا، جس سے علم محفوظ ہوتا اور ایک آدمی سے دوسرے آدمی اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا ہے، یہ نہ ہوتا تو علم محدود اور پھر معدوم ہو جاتا۔

آیت ⑤ انسان پیدا ہوتا ہے تو کچھ بھی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ ہی اسے آہستہ آہستہ سب کچھ سکھاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی اپنے ایک ان پڑھ بندے کو عالم بلکہ عالموں کا استاد بنائے گا۔

آیت ⑥ تا ⑧ فائدہ ① ﴿ كَلَّاۤ ﴾ کا معنی ”ہرگز نہیں“۔ ”خبردار“ ”حق یہ ہے“ میں سے موقع کی مناسبت سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

فائدہ ② یہ آیات پہلی پانچ آیات کے بعد وقفہ سے نازل ہوئیں۔ جب ابوجہل نے آپ کو نماز پڑھنے سے روکا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل آیا، کہنے لگا کیا میں نے تمھیں اس سے منع نہیں کیا؟ تین بار کہا۔ نبی ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو اسے ڈانٹا تو ابوجہل کہنے لگا تم جانتے ہو اس شہر میں مجلس کے ساتھی مجھ سے زیادہ کسی کے نہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں: ﴿ فَلۡیَدۡعُ نَادِیَهٗ ۙ﴿۱۷﴾ سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَةَ ﴾ (ترمذی تفسیر باسم ربک) ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔

فائدہ ③ انسان اتنی نعمتیں، جو اوپر ذکر ہوئیں، ملنے کے باوجود احسان ماننے اور شکر کرنے کی

أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ﴿٩﴾ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ﴿١٠﴾ أَرَءَيْتَ إِن كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ ﴿١١﴾ أَوْ أَمَرَ
بِالتَّقْوَىٰ ﴿١٢﴾ أَرَءَيْتَ إِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٣﴾ أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ﴿١٤﴾ كَلَّا لَئِن لَّمْ
يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ
الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے۔⑨ ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔⑩ کیا تو نے دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہو۔⑪ یا اس نے پرہیز گاری کا حکم دیا ہو۔⑫ کیا تو نے دیکھا اگر اس (منع کرنے والے) نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔⑬ تو کیا اس نے یہ نہ جانا کہ یقیناً اللہ دیکھ رہا ہے۔⑭ ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور اسے پیشانی کے بالوں کے ساتھ گھسیٹیں گے۔⑮ پیشانی کے ان بالوں کے ساتھ جو جھوٹے ہیں، خطا کار ہیں۔⑯ پس وہ اپنی مجلس کو بلا لے۔⑰ ہم جہنم کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔⑱

بجائے سرکشی اختیار کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اسے ضرورت کی ہر چیز دے کر دوسروں سے غنی کر دیتا ہے تو وہ بندگی کی حد سے نکل کر مقابلے پر آ جاتا ہے۔ فرمایا، بندے! جتنی چاہے سرکشی کر لے یقیناً تجھے اپنے رب کے پاس واپس آنا ہے۔

آیت ⑨ تا ⑭ ان آیات میں ابوجہل کے رویے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا، اے مخاطب! بھلا تو نے اس شخص کو دیکھا جو اللہ کے بندے یعنی رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے؟ بھلا یہ بھی کوئی جرم ہے جس سے وہ منع کر رہا ہے۔ پھر تو نے دیکھا اگر یہ نماز پڑھنے والا راہ راست پر ہو یا امر بالمعروف کر رہا ہو تو کیا اس سے یہ سلوک ہونا چاہیے؟ پھر کیا تو نے دیکھا کہ اگر یہ منع کرنے والا جھٹلا رہا ہو اور منہ موڑ رہا ہو تو کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ ﴿ أَرَءَيْتَ إِن كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ ۝ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ ﴾ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ کیا تو نے دیکھا کہ یہ نماز سے منع کرنے والا نماز سے روکنے کی بجائے ہدایت پر ہوتا یا نیکی کا حکم دیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

آیت ⑮ تا ⑱ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوجہل نے کہا: کیا محمد ﷺ تمھارے ہوتے

كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩

نہیں نہیں، اس کا کہنا مت مان اور سجدہ کر اور قرب حاصل کر۔ ⑲

ہوئے اپنا چہرہ زمین پر رکھتا ہے؟ کہا گیا ہاں۔ ابوجہل نے کہا لات اور عزیٰ کی قسم! اگر میں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا یا اس کے چہرے کو مٹی سے لت پت کر دوں گا۔ چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے اس کا ارادہ آپ کی گردن کو روندنے کا تھا، اچانک لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایڑیوں پر واپس پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھوں کے ساتھ کسی چیز سے بچ رہا ہے، اس سے پوچھا گیا تجھے کیا ہوا؟ اس نے کہا: میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق، بڑا ہولناک منظر اور پر ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کو ایک ایک عضو کر کے اچک لیتے۔ [صحیح مسلم کتاب صفۃ القیامۃ۔ باب قولہ ان الانسان لیطغیٰ]۔

آیت ⑲ فرمایا وہ آپ کو نماز سے روکتا ہے تو آپ اس کا کہنا ہرگز نہ مانیں بلکہ نماز پڑھتے، سجدہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ اللہ کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو تو (سجدے میں) دعا زیادہ کیا کرو۔ (صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود)

صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ (مسلم، کتاب المساجد باب سجود التلاوۃ)

رکوعہا ۱ (۹۷) سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ (۲۵) آیاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱

بلاشبہ ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا۔ ①

تفسیر سورة القدر

آیت ① فائدہ 1 ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ ’’ہم نے اسے قدر کی رات میں نازل کیا‘‘ یعنی قرآن کو۔ جب کوئی چیز اتنی مشہور ہو کہ خود بخود ذہن میں آ جاتی ہو تو اس کی عظمت واضح کرنے کے لیے نام لینے کی بجائے اس کی ضمیر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

فائدہ 2 قدر کا معنیٰ تقدیر ہے۔ یعنی تقدیر کی رات۔ اس معنیٰ کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔ ﴿ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ (الدخان : ٤) ’’اس رات میں ہر محکم کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے‘‘۔ یعنی سال بھر میں جو کام ہونا ہوتا ہے، لوح محفوظ سے نقل کر کے ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے سرانجام دیتے ہیں۔

قدر کا دوسرا معنیٰ عظمت ہے، یعنی عظمت والی رات، اس کے بعد اس کی عظمت پر دلالت کرنے والی چیزیں بیان کی ہیں، یعنی اس کا ہزار مہینے سے بہتر ہونا، ملائکہ اور جبریل علیہ السلام کا اترنا اور اس کا سراسر سلامتی ہونا، یہ معنیٰ بھی درست ہے۔

فائدہ 3 لیلۃ القدر میں اتارنے کا مطلب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر میں پورا قرآن ایک ہی دفعہ آسمان دنیا پر نازل کیا گیا پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے کئی سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی

وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ
وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝

اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ قدر کی رات کیا ہے؟ ② قدر کی رات ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ ③ اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر امر کے متعلق اترتے ہیں۔ ④

موافقت کی ہے۔ مستدرک حاکم، تفسیر سورۃ انا انزلنہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن مجید کے نزول کی ابتدا لیلۃ القدر میں ہوئی یہ معنیٰ شعبی رحمہ اللہ نے کیا ہے (طبری)

فائدہ ④ یہ رات رمضان میں ہونے کی تصریح خود قرآن میں ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (بقرہ : ۱۸۵) اور صحیح احادیث میں ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کی کوئی ایک طاق رات ہے، یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ اور ۲۹۔ متعین نہ کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مسلمان ان راتوں میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرلیں۔ رسول اللہ ﷺ پورے آخری عشرے میں ہی شب بیداری، اعتکاف اور گھر والوں کو جگانے کا اہتمام کرتے تھے۔ (بخاری، کتاب فضل لیلۃ القدر، باب العمل فی العشرالاواخر)

آیت ② یہ سوال اس رات کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، یعنی مخلوق میں سے کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو اس رات کی عظمت جان سکے اور بتا سکے۔ یہ جاننا اور بتانا اللہ ہی کا کام ہے۔

آیت ③ یعنی اس میں عبادت کرنا ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے جن میں یہ رات نہ ہو۔ پھر ہزار ماہ سے یا تو یہ عدد مراد ہے یا عربوں کے عام دستور کے مطابق کثرت مراد ہے۔ جو اس عدد سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہاں بعض مفسرین نے بنو امیہ کے ایام حکومت (جو ایک ہزار ماہ تھے) کی مذمت میں ایک روایت لکھی ہے، حالانکہ ترمذی نے اسے روایت کرکے خود ہی ضعیف قرار دیا ہے۔ (ترمذی، التفسیر، سورۃ القدر)

آیت ④ فائدہ ① روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ (الشعراء : ۱۹۳) ''یہ قرآن الروح الامین لے کر اترے ہیں''۔ ملائکہ میں شامل

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

وہ رات فجر طلوع ہونے تک سراسر سلامتی ہے۔⑤

ہونے کے باوجود ان کے شرف کی وجہ سے ان کا الگ ذکر فرمایا۔

فائدہ 2 یعنی ملائکہ اور جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر امر کے متعلق آئندہ سال میں جو کچھ ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے وہ لے کر زمین پر اترتے ہیں۔

آیت⑤ یعنی مغرب سے فجر تک رات بھر اس میں اہل ایمان شیطان کے شر اور ہر قسم کے فتنے سے سلامت رہتے ہیں اور اپنے دلوں میں عجیب اطمینان وسکون اور سلامتی محسوس کرتے ہیں۔

رکوعہا ١ (٩٨) سورۃ البینۃ مدنیۃ (١٠٠) آیاتہا ٨

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ (اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آتی۔① اللہ کی طرف سے ایک رسول آتا، جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا،② جن میں مضبوط احکام لکھے ہوئے ہیں۔③

تفسیر سورۃ البینۃ

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ پڑھ کر سناؤں۔ ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: اور کیا اللہ نے میرا نام بھی لیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں۔ تو ابی رضی اللہ عنہ (یہ سن کر خوشی سے) رونے لگے۔ (بخاری، تفسیر لم یکن الذین کفروا)

آیت① یعنی پیغمبر آخرالزمان اور قرآن بھیجنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) اور مشرکین عرب کو راہ حق پر لایا جائے کیونکہ یہ لوگ اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ ان کا راہ حق پر آنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک پیغمبر آئے جو ایک مقدس آسمانی کتاب جس میں عمدہ و دل نشین مضامین ہوں، انھیں پڑھ کر سنائے، کسی حکیم یا صوفی یا عادل بادشاہ کے بس کی بات نہ تھی کہ انھیں راہ راست پر لے آتا۔ (اشرف الحواشی)

آیت②،③ کسی شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پاک صحیفوں اور ان میں لکھے

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی، جدا جدا نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیل آ گئی۔ ④

ہوئے مضبوط احکام کی پاکیزگی اور مضبوطی معلوم کرنے کا شوق ہو تو وہ قرآن مجید کا بائبل کے مجموعے میں موجود پہلے صحیفوں کے ساتھ موازنہ کر لے جن میں صحیح باتوں کے ساتھ عقل و اخلاق سے گری ہوئی باتیں، واضح تحریف شدہ احکام اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اور انبیائے کرام کی توہین اور ان پر تہمتوں کی نجاست صاف نظر آتی ہے۔

آیت ④ اس آیت میں اہل کتاب کے ایک جرم کا ذکر فرمایا، مشرکین کا نام نہیں لیا کیونکہ جب پڑھے لکھوں کا یہ حال ہے تو جاہل مشرکین کی ضد اور عناد کا اندازہ خود کر لیں۔ اہل کتاب کا یہ جرم ان کا باہمی تفرقہ تھا اور اس جرم کا ارتکاب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بھی کیا اور آپ کی آمد پر بھی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ بہتر فرقوں میں بٹ چکے تھے، اس آیت میں وضاحت فرمائی کہ ان کے الگ الگ (۷۲) فرقے بننے کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں اللہ کے حکم کا علم نہ تھا، نہیں! بلکہ **بیّنہ** (کھلی دلیل اور واضح حکم) موجود ہونے کے باوجود باہمی ضد اور عناد کی وجہ سے کسی نے احبار و رُهبان میں سے کسی ایک کے اقوال کو حجت مان کر اس کے نام پر فرقہ بنا لیا کسی نے دوسرے کے نام پر۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنو اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی جو سب کے سب آگ میں جائیں گے مگر ایک، پوچھا گیا وہ کون ہیں تو فرمایا جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔ (ترمذی، كتاب الايمان، باب ماجاء فى افتراق هذه الامة، حديث ٢٦٤١ ـ وصححه الالبانى رحمه الله)

اس افتراق کا حل پہلے بھی یہ تھا اور اب بھی یہی ہے کہ تمام امت اللہ کے نازل کردہ احکام پر متفق ہو جائے، علماء کے اقوال سے کتاب و سنت سمجھنے میں مدد لی جائے مگر ان میں

وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلْقَيِّمَةِ ۝٥ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ وَٱلْمُشْرِكِينَ فِى نَارِ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَآ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ ٱلْبَرِيَّةِ ۝٦

اور انھیں اس کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرکے، یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔⑤ یقیناً اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا جہنم کی آگ میں ہوں گے اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہ لوگ مخلوق میں سب سے برے ہیں۔⑥

سے کسی کے قول کو شرع سمجھ کر فرقہ نہ بنایا جائے بلکہ جہاں اس کی بات وحی الٰہی کے خلاف ہو خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اسے یکسر ترک کر دیا جائے۔

اور آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد آپ پر ایمان نہ لانے کی وجہ یہ ہرگز نہ تھی کہ انھیں آپ کے سچا ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ پہلی کتابوں میں آپ کی واضح بشارت اور نشانیاں موجود ہونے کی وجہ سے وہ آپ کو اپنے بیٹوں کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پہچانتے تھے مگر محض حسد اور عناد کی وجہ سے آپ کے بارے میں جدا جدا ہو گئے، کوئی ایمان لے آیا اور کوئی کفر پر ڈٹا رہا۔ حسد اور عناد ایک تو یہ تھا کہ آپ بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل سے کیوں ہیں؟ اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی مذہبی سرداری چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

آیت⑤ اس آیت میں دین کا خلاصہ بیان فرما دیا کہ پہلی امتیں ہوں یا یہ امت سب میں ایک ہی حکم ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کریں، جو ہر قسم کے شرک اور ریا سے پاک اور خالص اللہ کے لیے ہو اور باطل پر چلنے والے تمام گروہوں سے ہٹ کر ایک اللہ کی طرف یک سو ہو جائیں، جس طرح ابراہیم علیہ السلام ہو گئے تھے اور صلاۃ قائم کریں اور زکاۃ ادا کریں الخ۔ جب اس امت میں بھی وہی پہلا ہی حکم ہے تو انھیں ماننے سے انکار کیوں ہے؟

آیت⑥ یعنی جانوروں سے بھی بدتر ہیں: ﴿أُو۟لَٰٓئِكَ كَٱلْأَنْعَٰمِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ (الاعراف :

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴿٧﴾ جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ﴿٨﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے وہی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔⑦ ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے۔ یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈر گیا۔⑧

---

۱۷۹) ''یہ لوگ جانوروں کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں'' کیونکہ وہ جان بوجھ کر حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

آیت⑦،⑧ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لائے اور انھوں نے صالح عمل کیے ان کے لیے تین بڑی بڑی بشارتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، کیونکہ اپنے اختیار سے گناہ چھوڑ کر ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کا درجہ یقیناً ان لوگوں سے بلند ہے جن میں نافرمانی کی استعداد ہی نہیں۔ دوسری یہ کہ ان کے لیے ہمیشہ رہنے کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ تیسری یہ کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی جو آخرت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ (التوبة : ۷۲) ''اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے'' اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے یعنی بیشمار نعمتوں کے بعد بھی اگر ان کا دل ہی خوش نہ ہوا تو کیا فائدہ؟ یہ نعمتیں اس کے لیے ہیں جو اپنے رب سے ڈر گیا۔ خالی بے روح کلمہ پڑھنے، بلا خشیت نماز اور بوجھل دل کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے اور بطور رسم عبادات ادا کرنے سے یہ مرتبہ نہیں ملتا، بلکہ اس کا مدار اللہ کے ڈر پر ہے: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ﴾ (الرحمن : ٤٦) ''جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اس کے لیے دو باغ ہیں''۔

رکوعہا ۱ (۹۹) سُوْرَۃُ الزِّلْزَالِ مَدَنِیَّۃٌ (۹۳) آیاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ

جب زمین اپنے زلزلے سے سخت ہلا دی جائے گی۔ ① اور وہ اپنے بوجھ نکال باہر کرے گی۔ ②

تفسیر سورۃ الزلزال

انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اذا زلزلت'' کو قرآن کے نصف کے برابر قرار دیا ہے مگر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ان روایات کو منکر اور ضعیف قرار دیا ہے۔ (دیکھیے سلسلة الاحادیث الضعیفه و الموضوعه حدیث نمبر ۱۳۴۲)

آیت ① اس سے مراد دوسرے نفخہ کے ساتھ آنے والا زبردست زلزلہ ہے کیونکہ دوسرے نفخہ کے ساتھ ہی مردے قبروں سے نکلیں گے: ﴿ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ (الزمر : ٦٨) ''پھر اس میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو یک لخت وہ کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے''۔ اپنے زلزلے سے مراد یہ ہے کہ زمین کو سخت ہلا دینے کے لیے جتنا زبردست زلزلہ ہونا چاہیے اس قسم کے زلزلے کے ساتھ وہ سخت ہلا دی جائے گی۔

آیت ② ﴿ اَثْقَالَ ﴾ ﴿ ثَقَلٌ ﴾ کی جمع ہے ''مسافر کا سامان اور نفیس چیزیں جن کی وہ حفاظت کرتا ہے''، یعنی زمین نے جو کچھ سنبھال کر رکھا ہوا ہے اسے باہر نکال دے گی یا ثِقْلٌ کی جمع ہے جو حمل کو کہتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ ﴾ (الاعراف : ۱۸۹) ''اے میرے رب میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔'' اس صورت میں زمین کو حاملہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے، یعنی اتنا شدید زلزلہ ہوگا کہ زمین پھٹ جائے گی اور اس میں جو فوت شدہ لوگ ہیں یا جو کچھ بھی

وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝۴ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا ۝۵
يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝۶

اور انسان کہے گا اسے کیا ہے؟③ اس دن وہ اپنی خبریں بیان کرے گی۔④ اس لیے کہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہوگی۔⑤ اس دن لوگ الگ الگ ہو کر واپس لوٹیں گے، تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔⑥

زمین نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے باہر نکال کر خالی ہو جائے گی۔ ﴿وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ﴾ (الانشقاق: ٤) ''اور اس میں جو کچھ ہے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی''۔

آیت③ ہر انسان ہی اچانک پیش آنے والے واقعات سے دہشت زدہ ہو کر یہ الفاظ کہے گا، خصوصاً کافر جو قیامت کا منکر تھا اس کے لیے تو یہ بات حد سے بڑھ کر تعجب انگیز ہوگی۔

آیت④ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ پڑھی۔ پھر آپ نے فرمایا: تم جانتے ہو اس کی خبریں کیا ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس کی خبریں یہ ہوں گی کہ وہ ہر بندے اور بندی پر ہر اس عمل کی شہادت دے گی جو اس نے اس کی پیٹھ پر کیا، وہ کہے گی اس نے ایسا ایسا عمل کیا، یہ اس کی خبریں ہوں گی۔ (ترمذی و صححہ، تفسیر سورۃ اذا زلزلت)

آیت⑤ کیونکہ اس کے رب نے اسے یہ حکم دیا ہوگا۔

آیت⑥ فائدہ① ﴿يَصْدُرُ﴾ ''واپس لوٹیں گے'' یعنی پہلے قبروں میں گئے تھے اب وہاں سے حساب کے لیے میدان محشر میں اللہ کے حضور واپس لوٹیں گے۔ ﴿ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (البقرہ: ٢٨) ''پھر وہ تمھیں مارے گا پھر زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے''۔

فائدہ② ﴿أَشْتَاتًا﴾ شَتٌّ کی جمع ہے، الگ الگ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اکیلا اکیلا اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے لیے پیش ہوگا، اس کا قبیلہ، پارٹی، دوست احباب کوئی ساتھ نہ

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾

تو جو شخص ایک ذرہ بھر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ ⑦ اور جو شخص ایک ذرہ بھر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ ⑧

ہوں گے۔ ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام : ۹۵) ''اور تم ہمارے پاس اس طرح اکیلے آئے ہو جیسے ہم نے تمھیں پیدا کیا تھا''۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ الگ الگ گروہوں کی شکل میں میدان محشر کی طرف روانہ ہوں گے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حضور فرداً فرداً پیش ہوں گے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ﴾ (النمل : ۸۳) ''اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گروہ ان لوگوں کا اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے پھر ان کی جدا جدا قسمیں بنائی جائیں گی''۔

آیت ⑦ فائدہ ① ''ذَرَّةٍ'' بکھرے ہوئے غبار کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ، جو روشندان میں سورج کی شعاؤں سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ چھوٹی چیونٹی کو بھی ذَرَّةٌ کہتے ہیں۔

فائدہ ② کافر ہو یا مسلمان، ذرہ بھر نیکی کی ہوگی تو دیکھ لے گا اور ذرہ بھر برائی کی ہوگی تو دیکھ لے گا، اعمال کے دفتر سے کوئی چیز غائب نہیں ہوگی: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ (الکھف : ۴۹) ''اور انھوں نے جو کچھ کیا ہوگا، اسے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا''۔

البتہ اعمال کی جزا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہوگی، چنانچہ کافروں کے اعمال ضائع کر دیے جائیں گے، انھیں آخرت کی بجائے دنیا ہی میں بدلہ دے دیا جائے گا۔ ''انھیں کوئی سفارش فائدہ نہیں دے گی''۔ (المدثر : ۴۸) (دیکھیے الاعراف : ۱۴۷ الاحقاف : ۲۰)

قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں ان کے اعمال ضائع ہونے اور سفارش کے مفید نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔ ان پر جنت حرام ہے۔ البتہ بعض اعمال یا کسی شفاعت کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہو سکتی ہے، جیسا کہ ابوطالب کو صرف

آ گ کا جوتا پہنایا جائے گا اور کفار اپنے اپنے اعمال کے لحاظ سے جہنم کے مختلف درکات میں ہوں گے۔ منافقین آ گ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے۔ اہل ایمان کو ان کی برائیوں کی جزا تب ملے گی جب یہ شرطیں موجود ہوں۔ ① گناہ کبیرہ ہوں۔ (النساء: ۳۱) ② ان سے توبہ کیے بغیر فوت ہو جائیں ۔ ③ ان کی نیکیاں میزان میں بھاری نہ ہو سکیں ۔ ④ ان کے حق میں کوئی سفارش قبول نہ ہو ۔ ⑤ ان کا کوئی عمل ایسا نہ ہو جس سے وہ مغفرت کے مستحق ہو چکے ہوں مثلاً اہل بدر ۔ ⑥ اللہ تعالیٰ نے وہ گناہ معاف نہ کر دیا ہو، کیونکہ گناہ گار مومن اللہ کی مرضی پر ہے چاہے تو اسے عذاب دے، چاہے تو بخش دے۔

فائدہ③ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو جامع اور بے نظیر آیت قرار دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کے متعلق فرمایا: «اَلْخَيْلُ لِثَلَاثَةٍ لِرَجُلٍ اَجْرٌ وَلِرَجُلٍ سِتْرٌ وَعَلٰى رَجُلٍ وِزْرٌ» ”گھوڑے تین طرح کے ہیں: ایک گھوڑا آدمی کے لیے اجر ہے، ایک گھوڑا پردہ ہے اور ایک گھوڑا بوجھ ہے۔ اس پر آپ ﷺ سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے اس کے متعلق اس جامع بے نظیر آیت کے علاوہ کچھ نازل نہیں فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ......الخ﴾ (صحیح بخاری تفسیر اذا زلزلت)

رکوعہا ۱ (۱۰۰) سورۃ العٰدیٰت مکیۃ (۱۴) ایاتہا ۱۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾

قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پیٹ اور سینے سے آواز نکالتے ہوئے دوڑنے والے ہیں!① پھر جو سم مار کر چنگاریاں نکالنے والے ہیں!②

تفسیر سورۃ العٰدیات

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ راجح یہی ہے کہ یہ مکی ہے۔ اس میں شواہد کے ساتھ انسان کا ناشکرا ہونا اور بخیل و حریص ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قیامت کا تذکرہ ہے۔

آیت① ﴿ وَالۡعٰدِیٰتِ ﴾ دوڑنے والے۔ ﴿ ضَبۡحًا ﴾ ضَبۡحٌ اس آواز کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کے جوف سے نکلتی ہے جو نہ سانس کی آواز ہوتی ہے، نہ ہنہنانے کی، اس لیے اس کا معنی ''ہانپ کر'' کرنا محل نظر ہے۔ آیت میں اگرچہ گھوڑوں کا لفظ نہیں مگر لغت عرب میں ضَبۡحًا لفظ گھوڑے کے لیے آتا ہے یا کتے کے لیے کیونکہ یہ مخصوص آواز انھی دو جانوروں سے نکلتی ہے۔ اس جگہ کتے مراد ہو ہی نہیں سکتے، اس لیے گھوڑے ہی مراد ہیں۔ یہاں تیز دوڑنے والے گھوڑوں کو بطور شاہد پیش کیا گیا ہے، مسلمانوں کے ہوں یا کافروں کے۔ انھیں غازیوں کے ساتھ مخصوص بھی نہیں کیا گیا، کیونکہ مقصد گھوڑوں کی فضیلت بیان کرنا نہیں بلکہ انھیں آئندہ آنے والے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرنا ہے۔

آیت② تیز دوڑتے ہوئے ان کے سم پتھروں پر پڑتے ہیں تو ان میں چنگاریاں نکلتی ہیں۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝

پھر جو صبح کے وقت لوٹ ڈالتے ہیں!③ پھر اس کے ساتھ غبار اڑاتے ہیں!④ پھر اس کے ساتھ کسی جماعت کے درمیان جا گھستے ہیں!⑤ یقیناً انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے!⑥ اور یقیناً وہ اس بات پر خود گواہ ہے۔⑦ اور یقیناً وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہے۔⑧

آیت ①، ⑦ اس سورہ میں پہلی پانچ آیات میں قسمیں اٹھانے کے بعد چھٹی آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان یقیناً اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ یہ پانچوں قسمیں اس دعوے کی دلیل اور شاہد کے طور پر لائی گئی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ گھوڑے اپنے مالک کے ایسے وفادار اور شکر گزار ہیں کہ رات جب وہ انھیں لے کر نکلتے ہیں تو وہ بلا چون و چرا چل پڑتے ہیں، نہ اپنے آرام کی پروا کرتے ہیں، نہ رات کی تاریکی کی۔ پھر وہ مالک کے کہنے پر صدق نیت کے ساتھ اس طرح سرپٹ دوڑتے ہیں کہ ان کے جوف سے آواز نکلنے لگتی ہے اور تیزی سے دوڑتے ہوئے ان کے سم جہاں پڑتے ہیں ان کی ٹھوکر اور رگڑ کے ساتھ پتھروں سے چنگاریاں نکلتی جاتی ہیں۔ پھر صبح کے وقت جب ہر چیز آرام کر رہی ہوتی ہے، ان کے مالک انھیں لے کر دشمن کو لوٹنے کے لیے دھاوا بولتے ہیں تو اس وقت بھی وہ غبار اڑاتے ہوئے دوڑتے چلے جاتے ہیں، خواہ غبار کے ساتھ سانس گھٹ رہا ہو یا آگے دشمن کی تلواریں، تیر اور نیزے ان کے سینے چھید رہے ہوں یہ کسی بھی چیز کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی حالت میں دشمن کی جماعت کے وسط میں جا گھستے ہیں۔ گھوڑے اپنے اس مالک کے لیے اتنی تگ و دو کرتے ہیں جو ان کی تھوڑی بہت خدمت کرتا ہے، جس نے نہ انھیں پیدا کیا ہے نہ حقیقی رازق ہے تو کیا انسان اللہ تعالیٰ کے کہنے پر جو اس کا خالق بھی ہے، مالک اور رازق بھی، اتنی تگ و دو کرنے اور قربانی دینے پر تیار ہے؟ وہ خود مانے گا کہ یقیناً نہیں تو پھر اس کے ناشکرا ہونے میں کیا شک ہے؟

آیت ⑧ یعنی اس ناشکری کا سبب مال کی شدید محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝٩ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝١٠ إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝١١

تو کیا وہ نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ ہے باہر نکال پھینکا جائے گا۔ ⑨ اور جو کچھ سینوں میں ہے، ظاہر کر دیا جائے گا۔ ⑩ یقیناً ان کا رب اس دن ان کے متعلق خوب خبر رکھنے والا ہے۔ ⑪

حرص، طمع اور بخل کی بد عادتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ اپنے منعم حقیقی کو بھلا بیٹھا ہے۔

آیت ⑨ یعنی کیا اسے اس وقت کا کوئی ڈر نہیں؟ (اشرف الحواشی)

آیت ⑩ دوسرے اعمال تو پہلے ہی ظاہر ہو چکے تھے مگر دل کی نیت اور ارادے کے متعلق خیال ہو سکتا تھا کہ اسے کون جانتا ہے مگر اس وقت وہ بھی ظاہر کر دیے جائیں گے، جس طرح فرمایا: ﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ﴾ (الطارق : ۹) ''جس دن پوشیدہ راز ظاہر کیے جائیں گے''۔

آیت ⑪ اس آیت پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ تو ہمیشہ ہی بندوں کے حالات سے باخبر ہے پھر اس دن کو خاص کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن جب ظاہری اعضا سے سرزد ہونے والے اعمال کے علاوہ دلوں کے اعمال ظاہر کر کے ان کی بھی جزا و سزا دی جائے گی تو اگر پہلے کسی کو شک تھا تو اس دن وہ بھی دور ہو جائے گا کہ یقیناً ان کا رب ان کے متعلق خوب خبر رکھنے والا ہے۔

(۱۰۱) سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ (۳۰)
رکوعہا ۱ آیاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔

اَلْقَارِعَةُ ۙ مَا الْقَارِعَةُ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۭ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ

وہ کھٹکھٹانے والی۔ ① کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟ ② اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ کھٹکھٹانے والی کیا ہے؟ ③ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں گے۔ ④

تفسیر سورۃ القارعہ

یہ سورہ مکی ہے اور اس میں قیامت کے احوال، اعمال کے وزن اور ان کی جزا وسزا کا بیان ہے۔

آیت ① تا ③ فائدہ 1 ''قَرْعٌ'' شدت کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹانے کو کہتے ہیں۔ ﴿ اَلْقَارِعَةُ ﴾ قیامت کا ایک نام ہے کیونکہ صور کی آواز کانوں اور دلوں بلکہ ہر ایک چیز کے ساتھ شدت سے ٹکرائے گی۔

فائدہ 2 یعنی وہ قارعہ کیا ہے؟ کس قدر عجیب اور کتنی خوفناک ہے؟ تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ قارعہ کیا چیز ہے؟ یعنی وہ اتنی عظیم الشان اور عجیب وغریب ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اس کی شدت وعظمت جانتا ہی نہیں کہ تجھے بتائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اس لیے اس نے خود ہی اگلی آیت میں اپنے فضل سے اس کا کچھ حال بیان فرما دیا۔

آیت ④ جس طرح پروانے بے شمار تعداد میں ایک دوسرے کے گرد اڑتے، گھومتے، آپس میں ٹکراتے ہوئے آگ کی طرف تیزی سے جارہے ہوتے ہیں، اسی طرح سب لوگ ایسی ہی پریشانی اور تیزی کے ساتھ میدان محشر میں بلانے والے کی طرف جائیں گے۔ ﴿ خُشَّعًا

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ ﴿٥﴾ فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ﴿٦﴾

اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔⑤ سو وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہوگئے۔⑥

﴿خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ۝ مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ .. الخ﴾ (القمر: ۸،۷) ”ان کی آنکھیں ڈری ہوئی ہوں گی، قبروں سے اس طرح نکلیں گے جیسے بکھری ہوئی ٹڈیاں“ بلانے والے کی طرف تیز دوڑنے والے: ﴿مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ﴾ (ابراھیم : ٤٣) ”تیز دوڑنے والے، سر اٹھائے ہوئے، ان کی نگاہ ان کی طرف نہیں پلٹے گی اور ان کے دل ہوا ہوں گے“۔ ﴿يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ﴾ (طه : ١٠٨) ”اس دن وہ پکارنے والے کا پیچھا کریں گے، اس سے ہٹ نہیں سکیں گے“۔ اور وہاں پہنچ کر بھی انھیں قرار نہیں ہوگا، بلکہ اسی طرح بے قرار و بیتاب گھومتے اور چکر لگاتے پھریں گے: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ...... الخ﴾ (عبس : ٣٣ تا ٣٧) ”جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا ...... الخ“

آیت⑤ ﴿كَالْعِهْنِ﴾ اون یا رنگین اون۔ ﴿الْمَنفُوشِ﴾ ۔ دھنی ہوئی۔ قیامت کے دن پہاڑ دھنک کر اون یا روئی کے گالوں کی طرح کر دیے جائیں گے، جیسے فرمایا: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا﴾ (طه : ١٠٥) ”اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، تو کہہ دے کہ میرا رب انھیں خوب اچھی طرح دھنک کر رکھ دے گا“ چونکہ پہاڑ سرخ، سیاہ، سفید اور بے شمار رنگوں والے ہیں اس لیے جب وہ دھنکے جائیں گے تو مختلف رنگوں میں رنگی اور دھنکی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔

آیت⑥ اس کے بعد وزن اعمال ہوگا۔ ”جس کے پلڑے بھاری ہوگئے“ سے مراد نیکیوں کے پلڑے ہیں۔

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ

مَا هِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔⑦ اور وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے۔⑧ تو اس کی ماں ہاویہ ہے۔⑨ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ ہاویہ کیا ہے؟⑩ ایک سخت گرم آگ ہے۔⑪

آیت⑨ ﴿هَاوِيَةٌ﴾ هَوٰى يَهْوِيْ هُوِيًّا باب ضرب) گرنا۔ ہاویہ کا لفظی معنی گڑھا ہے جس میں گرا جائے، مراد جہنم ہے۔ ﴿اُمُّهٗ﴾ ''اس کی ماں'' مراد اس کا ٹھکانا ہے۔ جس طرح ماں اپنے بچے کو گود میں جگہ دیتی ہے۔

آیت⑩ فائدہ① ﴿مَاۤ اَدْرٰىكَ ؟﴾ کے ساتھ سوال اس کی ہولنا کی نمایاں کرنے کے لیے ہے۔

فائدہ② ﴿مَا هِيَهْ﴾ اصل میں ''مَا هِيَ'' ہے (وہ کیا ہے؟) یا کے فتحہ کی حفاظت کے لیے وقف کے وقت اس کے بعد ساکن ہا لگا دیتے ہیں، اسے ہائے وقف کہتے ہیں جو ملا کر پڑھیں تو گر جاتی ہے بعض قراء ملا کر پڑھنے کی صورت میں بھی اسے باقی رکھتے ہیں۔

آیت⑪ ﴿حَامِيَةٌ﴾ حَمِيَ يَحْمٰى حَمْيًا باب سمع) (گرم ہونا) سے اسم فاعل ہے، یعنی وہ صرف ایک بے انتہا گہرا گڑھا ہی نہیں بلکہ سراسر آگ ہے، جو سخت گرم ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھاری آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ (اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے)۔ (صحيح بخاری كتاب بدء الخلق باب صفة النار، حديث ٣٢٦٥)

رکوعہا ۱ (۱۰۲) سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ (۱۶) اٰیاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ

تمھیں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے غافل کر دیا۔①

تفسیر سورۃ التکاثر

ابومطرف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾ تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ابن آدم کہتا ہے: میرا مال، میرا مال، اور اے آدم کے بیٹے! تیرے مال میں سے تیرا مال تو صرف وہی ہے، جو تو نے کھایا اور فنا کر دیا یا پہنا اور پرانا کر دیا یا صدقہ کیا اور آگے بھیج دیا۔ (صحيح مسلم / الزهد ح ٧٣٤٦)

آیت ① فائدہ 1 ﴿ التَّكَاثُرُ ﴾ اَلْهٰى يُلْهِيْ لَهْوًا سے ہے۔ جس کا معنی کسی چیز کے ساتھ اتنا لگاؤ اور دلچسپی ہے، جو اسے اہم چیزوں سے غافل کر دے۔ ﴿ التَّكَاثُرُ ﴾ مال، اولاد، جاہ و شرف، الغرض دنیا کی ہر چیز دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص اور پھر حاصل ہو جانے پر دوسروں پر فخر کرنا۔

فائدہ 2 اس حرص کی حد کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر ابن آدم کے پاس مال کی بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی تلاش کرے گا اور آدم کے بیٹے کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ کوئی چیز نہیں بھرتی اور اللہ اس کی طرف پلٹ آتا ہے جو واپس پلٹ آئے۔ (بخاري، الرقاق، باب مايتقى من فتنة المال)

فائدہ 3 سب سے زیادہ نقصان دہ حرص دو چیزوں کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو بھوکے بھیڑیے، جو بھیڑ بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں، انھیں اتنا خراب نہیں کرتے، جتنا

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ
تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ثُمَّ
لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝

یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔② نہیں نہیں، تم جلدی جان لو گے۔③ پھر ہرگز ایسا نہیں چاہیے، تم جلدی جان لو گے۔④ ہرگز نہیں، کاش! تم یقینی جاننا جان لیتے۔⑤ کہ تم ضرور جہنم کو دیکھو گے۔⑥ پھر تم ضرور ہی اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔⑦ پھر اس دن تم نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے۔⑧

آدمی کے مال اور شرف (اونچا ہونے) کی حرص اس کے دین کو خراب کرتی ہے۔(ترمذی ، باب الزهد ، باب ٤٣ حديث ٢٣٧٦ وصححه الالبانی رحمہ اللہ)

فائدہ④ کس چیز سے غافل کر دیا؟ اللہ کے احکام سے، اس کے دین سے، آخرت سے۔

آیت② یعنی موت آنے تک یہ غفلت طاری رہی، بلکہ جیسے جیسے موت قریب آتی گئی، غفلت کا یہ نشہ بڑھتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ دو چیزیں بڑی ہوتی جاتی ہیں، مال کی محبت اور لمبی عمر کی محبت۔ (صحيح بخاری ، الرقاق، باب من بلغ ستين سنة)

آیت③، ④ یعنی اپنی غفلت کا انجام جان لو گے، تاکید کے لیے بات دہرائی ہے۔

آیت⑤، ⑥ مسلمان، کافر، سبھی جہنم کو دیکھیں گے، جیسے فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم : ٧١) (تم میں سے ہر کوئی اس پر وارد ہوگا) پھر اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لیں گے، کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا۔

آیت⑦ یعنی صحت، عافیت، کھانے پینے اور دوسری تمام نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا کہ ان کا کہاں تک شکر ادا کیا؟ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی لذت اور معمولی سے معمولی عافیت ایسی نہیں، جس کے بارے میں سوال نہ ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ ایک دن نبی ﷺ ، ابوبکر اور عمر بھوک کی وجہ سے گھر سے نکلے اور ایک انصاری کے گھر آئے، اس نے مہمانی میں کھجوریں اور بکری کا گوشت پیش کیا۔ آپ نے گوشت اور کھجوریں کھائیں اور اوپر سے شیریں پانی پیا۔ جب خوب سیر ہو چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم سے قیامت کے دن اس نعمت کے بارے میں (بھی) سوال ہوگا۔ (صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، اشرف الحواشی)

رکوعہا ۱ (۱۰۳) سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ (۱۳) اٰیاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَالْعَصْرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

زمانے کی قسم!① کہ یقیناً ہر انسان ضرور ہی گھاٹے میں ہے۔② سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔③

تفسیر سورۃ العصر

یہ سورہ قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورتوں میں سے ایک ہے، مگر نہایت جامع سورہ ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ مفتاح دارالسعادہ میں فرماتے ہیں: شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا اگر لوگ اس سورہ میں غور وفکر کریں تو یہی ان کے لیے کافی ہے۔

آیت ① تا ③ فائدہ ① قرآن مجید کی قسمیں عام طور پر اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہیں جو قسموں کے بعد مذکور ہوتا ہے۔ اس سورہ کا مفہوم سمجھنے کے لیے خسارے کا مفہوم ذہن میں لانا ضروری ہے۔ خسارہ یا نفع کسی نہ کسی تجارت اور بیع میں ہوتا ہے جس میں آدمی اپنا رأس المال (سرمایہ) لگاتا ہے۔ اگر رأس المال فروخت ہو جائے اور رأس المال اور محنت سے بڑھ کر آمدنی ہو جائے تو یہ نفع ہے ورنہ خسارہ ہے۔ اس سورہ میں زمانے کی قسم کھا کر یہ حقیقت مدلل کی گئی ہے کہ چار صفات والے لوگوں کو چھوڑ کر ہر انسان ہی خسارے میں ہے، کیونکہ انسان کے پاس رأس المال صرف اور صرف زمانے کا کچھ حصہ یعنی اس کی عمر ہے: ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾ (فاطر: ۳۷) ’’کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہ دی

تھی جس میں جو نصیحت حاصل کرنا چاہے کرسکتا تھا اور تمھارے پاس ڈرانے والا بھی آیا‘‘ اور یہ سرمایہ ایسا ہے کہ جو بہت تیزی سے خود بخود ختم ہو رہا ہے اگر ختم ہونے سے پہلے پہلے اس سے قیمتی چیز یعنی وہ چاروں صفات حاصل کر لیں تو نفع ہے ورنہ خسارہ ہی خسارہ۔ جس طرح برف بیچنے والا اس کے پگھلنے سے پہلے پہلے اسے فروخت کر لے اور اس کی اچھی قیمت حاصل کر لے تو نفع ہے، ورنہ برف اس کا انتظار نہیں کرے گی کچھ دیر کے بعد خود بخود تحلیل ہو جائے گی پھر اس کے خسارے میں کیا شک ہے؟

فائدہ ② حقیقت یہ ہے کہ انسان کا خسارے سے بچنا بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ خسارہ رأس المال ضائع کرنے کا نام ہے، انسان کا رأس المال عمر ہے اور ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی عمر ضائع نہ کر رہا ہو کیونکہ آدمی پر جو گھڑی گزرتی ہے اگر اللہ کی نافرمانی میں گزری تو خسارے میں کوئی شک ہی نہیں، اگر مباح اور جائز کاموں میں گزری پھر بھی خسارہ ہے، کیونکہ اس گھڑی سے آدمی آخرت کے لیے کچھ حاصل نہ کر سکا اور اگر طاعت اور نیکی میں گزری تو یہی نیکی اس سے بہتر طریقے پر یا اس سے بہتر کوئی اور نیکی بھی کر سکتا تھا، کیونکہ نیکی کے درجات کی کوئی انتہا نہیں اور اللہ کے جلال وقہر کے مراتب کی بھی کوئی انتہا نہیں، اب جس قدر کسی شخص کو ان درجات کا علم ہوگا، ان پر عمل کرے گا اور دوسروں کو ان کی تعلیم دے گا اور خود صبر اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرے گا، اس قدر خسارہ کم ہوتا جائے گا ورنہ اعلیٰ درجہ کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ پر اکتفا تو ایک قسم کا خسارہ ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کسی نہ کسی قسم کے خسارے سے ضرور ہی دو چار رہتا ہے۔ (خلاصہ از رازی)

فائدہ ③ بعض لوگوں نے اس سورہ سے ثابت کیا ہے کہ اعمال ایمان سے الگ ہیں، اس میں داخل نہیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تب بھی ایمان کامل ہے، کیونکہ دونوں کو عطف کے ساتھ الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ بات درست نہیں بلکہ ایمان، دل، زبان اور ارکان تینوں کے اعمال کا نام ہے۔ اگر عطف کی وجہ سے یہ دونوں الگ الگ ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ حق کی وصیت

عمل صالح میں شامل نہیں، بلکہ عمل صالح سے الگ کوئی چیز ہے۔ اسی طرح صبر کی وصیت، حق کی وصیت اور عمل صالح دونوں سے الگ کوئی چیز ہے۔ جب کہ یہ تینوں باتیں ہی درست نہیں۔ حق یہ ہے کہ ایمان کے بعد عمل صالح کو الگ اس لیے ذکر کیا کہ ایمان کے اس جز کو کوئی شخص معمولی سمجھ کر اس سے بے اعتنائی نہ کر بیٹھے اور عمل صالح میں سے حق کی وصیت اور صبر کی وصیت کو الگ اس لیے ذکر فرمایا کہ کوئی شخص اپنی ذات کی حد تک عمل صالح کر کے یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں اب خسارے سے محفوظ ہوں۔ نہیں، بلکہ اسے یہ علم و عمل اور اس پر صبر دوسروں کو بھی سکھانا ہوگا۔

فائدہ ④ خسارے سے بچنے کے لیے عمل سے خالی ایمان کافی نہیں، نہ صرف خود عمل کر لینا کافی ہے، بلکہ ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید کرنا بھی ضروری ہے۔ حق سے مراد توحید، قرآن اور اتباع رسول ہے۔ پھر ان تینوں چیزوں یعنی حق کی معرفت حاصل کرنے، اس پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں بیشمار مصائب و تکالیف پیش آ سکتی ہیں، ان پر خود صبر کرنا ہوگا اور تمام مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کریں۔ ﴿وَتَوَاصَوْا﴾ فرمایا ہے، "أَوْصَوْا" نہیں فرمایا، جس کا مطلب ہے کہ سب مسلمان ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں۔ چند آدمیوں کے ادا کرنے سے یہ فرض ادا نہیں ہوتا۔

فائدہ ⑤ صبر کا معنی باندھنا اور روکنا ہے۔ یہ تین قسم کا ہے ① حق پر صبر اور اس کی مسلسل پابندی مثلاً توحید، اتباع سنت، نماز، روزہ پر پابند رہنا۔ ② برائی سے صبر مثلاً شرک، زنا، قتل ناحق، جھوٹ وغیرہ سے صبر۔ ③ مصیبت پر صبر اور ہر قسم کے جزع فزع سے پرہیز۔

رکوعہا ١ (١٠٤) سُوْرَۃُ الْهُمَزَۃِ مَکِّيَّةٌ (٣٢) اٰیاتہا ٩

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ۙ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ

ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے۔① جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔②

تفسیر سورۃ ہمزۃ

آیت ① ﴿ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ﴾ مبالغہ کے صیغے ہیں، دونوں کے معنی آپس میں اس قدر ملتے ہیں کہ بعض نے انھیں ہم معنیٰ قرار دیا ہے بعض نے فرق کیا ہے، دونوں کے مفہوم میں اشارہ بازی، طعن اور عیب جوئی شامل ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۣ بِنَمِيْمٍ ۙ ﴾ (القلم : ١٠، ١١) ''ہر بہت قسمیں کھانے والے حقیر کی اطاعت نہ کر، جو بہت طعنہ مارنے والا (یا عیب لگانے والا) چغلی کھانے والا ہے'' اور فرمایا: ﴿ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ (الحجرات: ١١) ''آپس میں عیب نہ لگاؤ''۔

آیت ② فائدہ ❶ یعنی لوگوں کی عیب جوئی، ان پر طعنہ زنی اور ان کی تحقیر کا اصل باعث اس کی مال جمع کرنے کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور شدید بخل ہے۔ اس بخل نے چونکہ اس میں فراخ دلی یا ہمدردی وغیرہ کی کوئی خوبی باقی نہیں چھوڑی، اس لیے وہ اپنی خِسّت و کمینگی پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر صاحب خیر پر طعن کرتا اور اس کی عیب جوئی کرتا ہے، تاکہ کوئی اس کے بخل و حرص کی مذمت کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے۔ منافقین بھی یہی کام کرتے تھے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ ﴾ (التوبہ : ٧٩) ''یہ وہ لوگ ہیں جو خوشی سے صدقہ کرنے

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ﴿٣﴾ كَلَّا ۖ لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿٤﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿٥﴾

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔③ ہرگز نہیں، (قسم ہے کہ) وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا۔④ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ حطمہ کیا ہے؟⑤

والے مومنوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور ان پر بھی جن کے پاس اپنی محنت کی کمائی کے علاوہ کچھ نہیں، پس یہ ان سے مذاق کرتے ہیں‘‘۔اس کے علاوہ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کے لیے دوسروں کی بدگوئی اور عیب جوئی کرتا ہے اور اپنے آپ کو صاف ستھرا ظاہر کرتا ہے، تاکہ لوگ ہر سودے اور ہر کام میں کسی اور سے معاملہ کرنے کی بجائے صرف اس سے معاملہ کریں اور اس کا مال بڑھتا رہے۔ اگر هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ کا واضح نقشہ دیکھنا ہو تو جمہوری انتخابات میں کھڑے ہونے والے امیدواروں کے بیانات پڑھ لیں کہ وہ سیٹ کے حصول کے لیے اپنے حریفوں پر کس قدر طعن اور بہتان تراشی کرتے ہیں۔

فائدہ② یعنی مال جو انسان کی ضرورت پوری کرنے اور آسائش حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اس کے لیے اصل مطلوب بن گیا، اب وہ اسی کو جمع کرنے اور گن گن کر رکھنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔

آیت③ اس کا طرزِ عمل بتاتا ہے کہ وہ مال کو موت سے بچانے والا سمجھتا ہے، کیونکہ اتنی عمر ہونے کے باوجود وہ مال جمع ہی کرتا جاتا ہے، نہ اللہ کا حق ادا کرتا ہے، نہ بندوں کا، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ جمع کیا ہوا مال اسے مرنے نہیں دے گا بلکہ ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

آیت④ یعنی یہ خیال ہرگز درست نہیں، بلکہ قسمیہ بات ہے کہ اسے ہر حال میں اس دنیا سے جانا ہے۔ پھر اس کے برے اعمال کی پاداش میں اسے حُطَمَة میں پھینک دیا جائے گا۔ پھینکنے کے لفظ سے اس کی تذلیل و تحقیر نمایاں ہو رہی ہے۔

آیت⑤ یہ سوال اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی تم جان ہی نہیں سکتے کہ وہ کس

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿6﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿7﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿8﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿9﴾

اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔⑥ جو دلوں پر جھانکتی ہے۔⑦ یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی ہے ⑧ لمبے لمبے ستونوں میں۔⑨

قدر خوفناک چیز ہے۔ ﴿حُطَمَةٌ﴾ حَطَمَ يَحْطِمُ (باب ضرب) سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت ہی توڑ پھوڑ دینے والی۔ اس میں جو چیز ڈالی جائے گی اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((رَأَيْتُ جَهَنَّمَ يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا)) (بخاری، الاذان : العمل فی الصلاۃ باب اذا انفلت الدابۃ فی الصلاۃ) ”میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کے اپنے حصے ایک دوسرے کو توڑ رہے تھے“۔

آیت ⑥ ﴿نَارُ اللّٰهِ﴾ ”اللہ کی آگ“ کہنے میں اس آگ کی جو ہولنا کی بیان ہوئی ہے وہ کسی اور لفظ میں بیان ہو ہی نہیں سکتی۔

آیت ⑦ ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ ”جو دلوں پر جھانکتی ہے“، یعنی وہ صاحب شعور ہے، دلوں میں جو کفر و نفاق اور بخل و کمینگی ہے یا ایمان اور سخاوت و کرم ہے، سب دیکھ لیتی ہے اور جلاتی اس کو ہے جو جلانے کے قابل ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی آگ بھی اگرچہ ہر چیز کو جلا ڈالتی ہے، مگر یہاں دل تک پہنچنے سے پہلے ہی آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جہنم کی آگ جسم کو جلاتے ہوئے دل تک پہنچ جائے گی مگر آدمی مرے گا نہیں۔ دلوں تک آگ اس لیے پہنچے گی کہ دل ہی گندے عقائد، خبیث نیتوں اور کفر و نفاق کا مرکز ہے۔

آیت ⑧، ⑨ ﴿عَمَدٍ﴾ عَمُوْدٌ کی جمع ہے، یعنی انھیں جہنم میں لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ باندھ کر چاروں طرف سے بند کر دیا جائے گا حتیٰ کہ کوئی دروازہ یا کھڑکی بلکہ کوئی شگاف یا درز بھی باقی نہیں چھوڑی جائے گی۔ اعاذنا اللہ منہا

دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ اس آگ کے شعلے لمبے لمبے ستونوں کی شکل میں ہوں گے۔

رکوعہا ۱ (۱۰۵) سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ (۱۹) آیاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ؕ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کس طرح کیا۔①

تفسیر سورۃ الفیل

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر اپنا احسان ذکر فرمایا ہے کہ اس نے کس معجزانہ طریقے سے بیت اللہ کی حفاظت فرمائی اور اس کو گرانے کے لیے آنے والوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس بادشاہ کو برباد نہ کرتا تو اہل مکہ جس امن و چین اور آزادی کے ساتھ بیٹھے ہیں یہ امن وچین انھیں کہاں نصیب ہوتا؟ سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس واقعہ کے پچاس روز بعد پیدا ہوئے۔

آیت ① فائدہ ① ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کا لفظی معنی ہے کیا تو نے نہیں دیکھا مگر مجاہد رحمہ اللہ (جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں) نے اس کا معنی کیا ہے ''اَلَمْ تَعْلَمْ'' کیا تجھے معلوم نہیں؟

(صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الفیل)

جب قرآن اترا اس وقت یہ واقعہ اتنا معروف تھا گویا لوگوں کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔ بعض لوگوں نے اس لفظ سے یہ کشید کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی ﷺ نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ کہ آپ عالم الغیب تھے۔ درحقیقت یہ کلام عرب اور اسلوب قرآن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (یٰسین: ۷۷) ''کیا انسان نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے پیدا کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑالو ہے''۔ اب کیا کسی انسان نے اپنے آپ کو

نطفہ سے پیدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ ”کیا تجھے معلوم نہیں؟ کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟“

فائدہ ② ہاتھی والوں سے مراد یمن کا ایک عیسائی حاکم ابرہہ اور اس کا لشکر ہے۔ ابرہہ نے ایک عظیم الشان گرجا بنا کر یہ چاہا کہ لوگ کعبہ کی طرح اس کی زیارت کے لیے آیا کریں۔ جب وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا تو ایک بہت بڑا لشکر جس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے، اپنے ہمراہ لے کر بیت اللہ کو ڈھانے کی نیت سے مکہ پہنچا۔ جب مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان اس وادی میں پہنچا جس کا نام بعد میں وادی محسر پڑا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے گروہ در گروہ پرندے نمودار ہوئے جن کے پنجوں اور چونچوں میں کنکر تھے۔ انھوں نے اس لشکر پر وہ کنکریاں پھینکیں جن سے ابرہہ اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا۔ یہ سیرت اور تاریخ میں مذکور واقعہ کا خلاصہ ہے۔ (دیکھیے سیرت ابن هشام اور تفسیر ابن کثیر ، سورة الفیل)

صحیح اسانید کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے بھی اس واقعہ کا مختصر ذکر موجود ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا اور اس پر اپنے رسول اور ایمان والوں کو غلبہ عطا فرما دیا تو یہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور میرے لیے بھی دن کی ایک گھڑی کے لیے حلال ہوا ہے۔ اب میرے بعد کسی کے لیے حلال نہیں ہوگا (یعنی اس میں لڑنا)

(صحیح بخاری، اللقطة، باب کیف تعرف لقطة اهل مكة، حديث : ٢٤٣٤)

دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کے زمانے میں نکلے، جب اس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے مکہ میں اترا جاتا تھا تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی، لوگوں نے (اسے اٹھانے کے لیے) کہا حَلْ حَلْ لیکن وہ بیٹھی رہی۔ لوگوں نے کہا قصواء اڑ گئی، قصواء ہلتی نہیں تو نبی ﷺ نے فرمایا: قصواء اڑی نہیں بلکہ اسے ہاتھیوں کو روکنے والے نے روک دیا ہے۔ [صحیح بخاری/ کتاب الشروط/ باب الشروط فی الجهاد، حدیث نمبر: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲] ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھی والے جب مکہ پر حملہ کے لیے آئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں روک دیا تھا۔

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِم
بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝

کیا اس نے ان کی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا؟② اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دیے۔③ جو ان پر کھنگر (پکی ہوئی مٹی) کی پتھریاں پھینکتے تھے۔④ پھر انھیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔⑤

آیت② ﴿ تَضْلِيلٍ ﴾ کا لفظی معنیٰ گمراہ کرنا ہے، یعنی ان کی تدبیر اس طرف نہیں جانے دی، جس طرف وہ لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی تدبیر سیدھی نہیں پڑنے دی۔

آیت③ ﴿ أَبَابِيلَ ﴾ عام طور پر ایک خاص قسم کی چڑیوں کو ابابیل کہا جاتا ہے، مگر یہ درست نہیں۔ ابابیل ان گھوڑوں یا پرندوں کو کہا جاتا ہے جو گروہ در گروہ اور جھنڈ کے جھنڈ آئیں۔ یہ لفظ جمع ہی استعمال ہوتا ہے۔ بعض نے اس کی واحد ''إِبَّالَةٌ'' بیان کی ہے۔

آیت④ ﴿ سِجِّيلٍ ﴾ کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا سنگ و گل۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الم تر)۔ یعنی پکی ہوئی مٹی جسے کھنگر کہا جاتا ہے۔ لاوا اگلنے والے پہاڑوں کے اردگرد اس قسم کے جلے ہوئے سخت سنگریزے عام ملتے ہیں۔

آیت⑤ کھائے ہوئے بھس سے مراد یہ ہے کہ جانور بھس کھا کر لید کرتا ہے اور پھر وہ خشک ہو کر ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ سنگریزوں کے عذاب سے ان کے اعضا کے بکھر جانے کو اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے (طبری رحمہ اللہ)۔ اللہ تعالیٰ الفاظ کے استعمال میں اعلیٰ درجے کی شائستگی اختیار فرماتے ہیں اس مفہوم کو ''لید'' کی بجائے ''کھائے ہوئے بھُس'' کے الفاظ میں ادا کیا ہے، اس سے ان کی زبوں حالی بھی نمایاں ہو رہی ہے۔ (قاسمی بحوالہ شهاب)

یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ جانوروں کے کھانے کے بعد جو بھوسہ بچ جاتا ہے، وہ اسے پاؤں میں روند دیتے ہیں اور وہ ادھر اُدھر بکھر جاتا ہے۔ وہ اس بھوسے کی طرح ہو گئے۔

رکوعہا ۱ (۱۰۶) سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَّكِّيَّةٌ (۲۹) اٰیاتہا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ
الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ

قریش کے دل میں محبت ڈالنے کی وجہ سے۔① یعنی ان کے دل میں سردی اور گرمی کے سفر کی محبت ڈالنے کی وجہ سے۔② تو ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔③ جس نے انھیں بھوک سے (بچا کر) کھانا دیا اور خوف سے (بچا کر) امن دیا۔④

تفسیر سورہ قریش

آیت ① تا ④ فائدہ ① ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے کئی احسانات ذکر فرمائے ہیں۔ قریش مکہ معظّمہ میں رہتے تھے اور کعبہ کے متولی تھے۔ یہ لوگ سال میں دو تجارتی سفر کرتے تھے۔ گرمی کے موسم میں شام کی طرف، کیونکہ وہ سرد علاقہ ہے اور سردی میں یمن کی طرف کیونکہ وہ گرم علاقہ ہے۔

پہلا احسان تو یہ کہ ان کے دل میں سفر کی محبت ڈال دی، نہ انھیں سردی کے سفر میں مشقت محسوس ہوتی ہے نہ گرمی میں اور سفر ہی دنیا میں وسیلۂ ظفر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو سفر سے مانوس نہ کرتا تو وہ بھی اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے اور سفر سے جو مال و دولت، تجربہ وعلم اور دنیا بھر کے لوگوں اور علاقوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے وہ کبھی حاصل نہ ہوتی۔ سفر سے مانوس ہونے کی یہی نعمت قریش کو آگے چل کر ہجرت کے سفر میں کام آئی، پھر کفار کے ساتھ لڑائی میں اور اس کے بعد روم وشام، عراق وفارس، ہند وسند، مصر وافریقہ بلکہ مشرق ومغرب کی فتوحات میں کام آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم قوم کے دنیا پر غالب آنے اور

غالب رہنے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ سفر سے نہ گھبرائیں اور جب نکلنے کا موقع ہو زمین سے ہی نہ چمٹ جائیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کافر اقوام ہی برّی، بحری اور فضائی سفروں کی اجارہ دار ہیں مسلمان اکثر بیشتر یہ سبق بھول چکے ہیں۔

دوسرا احسان یہ کہ اس وقت تمام عرب میں سخت بدامنی تھی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ کب اس پر حملہ ہو جائے اور اسے قتل کر دیا جائے، یا اٹھا لیا جائے یا مال لوٹ لیا جائے اور عورتیں و بچے غلام بنا لیے جائیں، ایسے حالات میں صرف اہل مکہ ہی کو یہ امن حاصل تھا کہ کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھتا تھا: ﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ (العنکبوت : ٦٧) ''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک امن والا حرم بنایا ہے جبکہ ان کے ارد گرد سے لوگ اچک لیے جاتے ہیں۔'' تیسرا احسان یہ کہ حرم کے باشندے ہونے کی وجہ سے تجارتی سفروں میں کوئی نہ ان کا قافلہ لوٹتا، نہ ان سے وہ ٹیکس لیے جاتے جو ہر قبیلہ اور ہر قوم اپنے علاقے سے گزرنے والوں سے لیتی تھی۔ نہ انھیں کہیں جانے سے روکا جاتا تھا۔ چوتھا یہ کہ تمام دنیا کے لوگ حج اور عمرہ کے لیے مکہ میں آتے اور دنیا بھر کا سامان تجارت یہاں پہنچتا۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے پھل ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے نتیجے میں یہاں پہنچتے: ﴿ أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا ﴾ (القصص:٥٧) ''کیا ہم نے انھیں ایسے امن والے حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھنچ کر لائے جاتے ہیں، یہ ہماری طرف سے رزق ہے''۔

ان تجارتی سفروں اور مکہ کی تجارت کے مالک ہونے کی وجہ سے قریش نہایت مالدار تھے اور حرم کی برکت سے امن و امان سے بھی بہرہ ور تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام نعمتیں اللہ کے گھر کی برکت سے تھیں۔ اور صرف اور صرف رب تعالیٰ کا عطیہ تھیں۔ پھر جب یہ تمام نعمتیں اس گھر کے مالک نے دی ہیں تو تم اس اکیلے کی عبادت کیوں نہیں کرتے؟ اور کیوں دوسروں کو اس کا شریک بنا کر ان کے آگے سجدے کرتے، ان کے آستانوں پر نذریں دیتے اور

چڑھاوے چڑھاتے ہو؟

فائدہ ② ﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ﴾ (قریش کے دل میں محبت ڈالنے کی وجہ سے) کیا ہونا چاہیے؟ یہ جار مجرور کس کے متعلق ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ ﴿فَلْيَعْبُدُوا﴾ کے متعلق ہے، یعنی اس وجہ سے انھیں اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے۔ یہ مشہور امامِ نحو خلیل بن احمد کا قول ہے۔ مگر اس پر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ پھر ''فا'' کیوں آئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں شرط محذوف ہے، جس کے جواب میں فا آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ان دوسری بے شمار نعمتوں کی وجہ سے یہ لوگ ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے تو اس گھر کا رب ہونے کی وجہ سے ہی اس کی عبادت کریں جس گھر کی برکت سے انھیں سردی وگرمی میں سفر کرنے، دائمی امن وامان اور وافر رزق کی نعمتیں میسر ہیں۔ (زمخشری)

کسی بھی جگہ میں امن اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ہمیں بھی رزق کی فراخی اور امن جیسی نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اسی کی عبادت کرنی چاہیے غیر اللہ کی عبادت اور شرک سے بچنا چاہیے شرک کے اڈوں کی تعمیر وترقی کی بجائے توحید کے مراکز کی تعمیر وترقی کرنی چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو رزق کی تنگی اور بدامنی وفساد کا سامنا کرنا پڑے گا جیسا کہ کرنا پڑ رہا ہے۔

رکوعہا ۱ (۱۰۷) سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ (۱۷) آیاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کو جھٹلاتا ہے۔ ① تو یہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ ② اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ ③

تفسیر سورۃ الماعون

اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین کا اختلاف ہے، مگر دکھاوے کے لیے نماز پڑھنے والوں کے تذکرے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مدنی ہے، کیونکہ مکہ میں کسی کو دکھانے کے لیے نماز پڑھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

آیت ① تا ③ یہ اولاً رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے (کیا تو نے اس شخص کو دیکھا......الخ) اس کے بعد ہر شخص اس کا مخاطب ہے۔ ان آیات میں قیامت کے دن اعمال کی جزا کو جھٹلانے کی وجہ سے کسی شخص میں جو سنگدلی اور شقاوت پیدا ہوتی ہے، اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے سامنے چونکہ دنیا ہی دنیا ہوتی ہے اور یتیم سے ہمدردی اور مسکین کی غمخواری پر اسے کسی فائدے کی توقع ہوتی ہے نہ ان کے حقوق غصب کرنے پر کسی باز پرس اور سزا کا خوف، اس لیے وہ ان بے بس لوگوں کے معاملہ میں نہایت بے رحم ہوتا ہے۔ یتیم اپنے باپ کی وراثت مانگے یا اپنا کوئی اور حق، وہ اسے دھکے مار کر باہر نکال دیتا ہے۔ مسکین پر رحم کرتے ہوئے اسے خود کھانا کھلانا تو دور کی بات ہے وہ کسی دوسرے کو اس کے لیے کہنے پر بھی تیار نہیں ہوتا۔ یتامیٰ اور مساکین سے ہمدردی صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو جزا و سزا پر ایمان رکھتا ہو۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝

پس ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔④ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔⑤ جو دکھاوا کرتے ہیں۔⑥

آیت⑤ ،⑥ ان آیات میں منافقین کا ذکر ہے، آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ نماز پڑھنا نہیں چاہتے تھے مگر اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کے لیے انھیں پڑھنا پڑتی تھی حقیقت میں وہ اپنی نماز سے غافل تھے۔ یہ غفلت کئی طرح تھی:

① صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے تھے، لوگوں کے سامنے ہوتے تو پڑھ لیتے ورنہ چھوڑ ہی دیتے (ابن عباس، الدرالمنثور)

② اور پڑھتے بھی تو وقت ضائع کر کے پڑھتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ نماز منافق کی نماز ہے کہ وہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگے مارتا ہے اس میں اللہ کو یاد نہیں کرتا مگر تھوڑا۔ (صحیح مسلم / کتاب الصلاۃ / باب استحباب التبکیر بالعصر)

③ ان کا نماز ادا کرنے کا انداز بتاتا تھا کہ انھیں اپنی نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴾ (النساء : ۱۴۲) ”منافق لوگ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ وہ اللہ ان کو دھوکا دینے والا ہے اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے، مگر کم“

④ نماز میں بھول تو مخلص مسلمان سے بھی ہو سکتی ہے، رسول اللہ ﷺ سے بھی ہو گئی تھی جب ظہر کی دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا تھا، مگر نماز ہی سے بھول ہو جائے، یہ نفاق ہے۔ اس لیے ”هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ“ نہیں فرمایا کہ ”ان سے ان کی نماز میں بھول ہو جاتی ہے“ بلکہ فرمایا: ﴿ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ یعنی وہ اپنی نماز ہی سے بھولے ہوئے ہیں

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

اور عام برتنے کی چیزیں روکتے ہیں۔ ⑦

انھیں خیال ہی نہیں کہ ہمیں نماز پڑھنا ہے۔ پڑھتے ہیں تو یاد ہی نہیں ہم کہاں کھڑے ہیں، نہ خشوع ہے نہ خضوع، ڈاڑھی اور کپڑوں سے کھیل رہے ہیں، جمائیاں لے رہے ہیں، ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں، غرض ساری نماز پڑھ جاتے ہیں مگر کچھ پتا نہیں کہ کیا پڑھا؟

آیت ⑦ آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ تو ان کی نمازوں ہی سے ظاہر ہے لوگوں سے بھی ان کا معاملہ درست نہیں، وہ معمولی چیز کے ساتھ بھی کسی کو فائدہ پہنچانے پر تیار نہیں ہیں، جب اس کے عوض انھیں دنیا میں کچھ ملنے کی توقع نہ ہو۔

﴿ الْمَاعُوْنَ ﴾ مَعْنٌ سے ہے، جس کا معنی شَيْءٌ قَلِيْل ہے۔ اس سے مراد علی رضی اللہ عنہ اور بعض مفسرین نے زکاۃ لی ہے، کیونکہ وہ کل مال کے مقابلہ میں بالکل قلیل یعنی اڑھائی فیصد ہوتی ہے، یعنی یہ لوگ اتنا معمولی صدقہ کرنے پر بھی تیار نہیں۔ ابوہریرہ، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور بہت سے مفسرین نے اس سے گھروں میں برتنے کی وہ چیزیں مراد لی ہیں جو ہر وقت ہر گھر میں نہیں ہوتیں بلکہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے سے مانگ لی جاتی ہیں۔ مثلاً سوئی، ہانڈی، کلہاڑی، پیالہ، آگ پانی وغیرہ اور عام طور پر ماعون کا اطلاق انھی چیزوں پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ کسی کو معمولی سے معمولی چیز جو استعمال کے بعد واپس انھیں مل جائے گی، دینے پر بھی تیار نہیں، کیونکہ آخرت میں اس کے ثواب کی انھیں امید نہیں اور دنیا میں انھیں اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آخرت کو جھٹلانے والے ایسے لوگوں کے لیے تباہی اور بربادی کی وعید ذکر فرمائی ہے۔

رکوعھا ۱ (۱۰۸) سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ (۱۵) ایاتھا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ

بلا شبہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی۔ ①

تفسیر سورۃ الکوثر

مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے دعوت اسلام دینے کے بعد آپ پر بہت مشکل حالات گزرے۔ سب لوگ دشمن، ہر طرف مخالفت، مالی پریشانیاں الگ، ایمان لانے والے بالکل تھوڑے سے، مزید یہ کہ نرینہ اولاد جو ہوئی، فوت ہو گئی۔ اس پر دشمن کا خوش ہونا اور آپ کا غمگین اور پریشان ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح سورہ والضحیٰ میں آپ کو تسلی دی اور فرمایا: ﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۙ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴾ ''اور یقیناً پیچھے آنے والی حالت تیرے لیے پہلی سے بہتر ہے اور تیرا رب تجھے ضرور (اتنا) عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا۔'' اور سورۃ الم نشرح میں فرمایا: ﴿ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ ''اور ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر دیا۔'' اسی طرح اس سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا تذکرہ فرما کر آپ کو تسلی دی ہے۔

آیت ① کوثر سے کیا مراد ہے؟

﴿ الْكَوْثَرَ ﴾ کثرۃ میں سے فَوْعَلٌ کا وزن ہے، یعنی بے انتہا کثرت۔ یعنی دشمن تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کے پاس کچھ نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپ کو بہت ہی کچھ دیا ہے۔ کوثر میں وہ ساری خیر کثیر شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی، مثلاً اسلام، نبوت، اخلاق حسنہ، بہترین تابعدار امت، جنت اور دوسری نعمتیں جو شمار نہیں ہو سکتیں۔ لغت کے لحاظ

سے کوثر کا معنیٰ یہی ہے۔

البتہ بہت سی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوثر ایک نہر ہے جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے، اسی طرح آپ نے، محشر میں آپ کو عطا کیے جانے والے حوض کا نام بھی کوثر بتایا، اس لحاظ سے یہ تفسیر مقدم ہے مگر ترجیح کی ضرورت تب ہے جب دونوں تفسیروں میں تعارض ہو، جو یہاں ہے ہی نہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ انھوں نے کوثر کے متعلق فرمایا اس سے مراد وہ خیر ہے جو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی۔ راوی کہتا ہے میں نے سعید بن جبیر سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے؟ تو انھوں نے کہا: جنت میں جو نہر ہے وہ بھی اس خیر میں شامل ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الکوثر)

فائدہ ① ﴿نہر کوثر﴾ جنت میں ہے۔ حوض کوثر محشر کے میدان میں ہوگا۔ بعض اوقات اس پر بھی نہر کوثر کا لفظ آتا ہے۔ اس حوض میں بھی جنت کے دو پرنالوں سے پانی گر رہا ہوگا۔ گویا حوض کا اصل بھی جنت والی نہر کوثر ہے۔ (فتح الباری)

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب نبی ﷺ کو آسمان کی طرف لے جایا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: میں جنت میں چلا جارہا تھا تو اچانک ایک نہر آ گئی جس کے کنارے کھوکھلے موتیوں کے قبے تھے۔ میں نے کہا: جبریل! یہ کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا یہ کوثر ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی ہے۔ پھر دیکھا تو اس کی مٹی یا خوشبو مہکنے والی کستوری کی طرح تھی۔ (صحیح بخاری، الرقاق، باب فی الحوض و تفسیر الکوثر)

فائدہ ② ﴿حوض کوثر﴾ میدان محشر میں رسول اللہ ﷺ حوض کوثر پر اپنی امت کا استقبال کریں گے اور انھیں پانی پلائیں گے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ حوض کوثر کی روایات تیس سے زیادہ صحابہ سے آئی ہیں جن میں سے بیس صحابہ کی احادیث صحیحین میں ہیں، باقی دوسری کتابوں میں ہیں۔ ان کی نقل صحیح ہے اور ان کے راوی مشہور ہیں۔ (فتح

الباری، کتاب الرقاق، باب الحوض)

فائدہ③ [حوض کوثر میں جنت کے پرنالوں کا گرنا اور حوض کی تفصیل] ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! حوض کے برتن کیسے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اس کے برتن آسمان کے تاروں سے زیادہ ہیں۔ یاد رکھو تارے بھی اس رات کے، جو تاریک ہو اور بادل کے بغیر ہو۔ جنت کے برتن ایسے ہیں کہ جو ان سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا، اس وقت کے آخر تک جو اس پر گزرے گا۔ اس حوض میں جنت سے دو پرنالے گرتے ہیں جو اس سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ اس کا عرض طول کے برابر ہے، جتنا عمان سے ایلہ تک فاصلہ ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (صحیح مسلم / کتاب الفضائل/ باب اثبات حوض نبینا صلی اللہ علیہ وسلم)

فائدہ④ [کوثر کا ایک اور معنیٰ] مشہور امام فقہ ابن جنی نے: ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ کی مناسبت سے کوثر کا معنیٰ ذرية كثيرة (کثیر اولاد) کیا ہے۔ کفار قریش اور آپ سے دشمنی رکھنے والے کہتے تھے کہ آپ ابتر (بے اولاد) ہیں۔ فوت ہو گئے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے آپ کو کوثر یعنی اولاد کثیر عطا فرمائی۔ مراد اولاد فاطمہ ہے۔ کیونکہ بیٹی کی اولاد بھی قرآن کی رو سے اولاد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ﴾ اور "اس (ابراہیم) کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو ہدایت دی"۔ اس کے بعد کئی پیغمبروں کا نام لے کر فرمایا: ﴿وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ﴾ (الانعام: ٨٤، ٨٥) یعنی "اس (ابراہیم) کی اولاد میں سے زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی ہدایت دی"۔ معلوم ہوا عیسیٰ علیہ السلام بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، حالانکہ ان کا باپ بالاتفاق تھا ہی نہیں بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بیٹی مریم کی اولاد ہیں۔ معلوم ہوا کہ آدمی کی بیٹی کی اولاد بھی اس کی اولاد ہوتی ہے۔ (قاسمی)

یہ معنی یعنی اولاد کثیر بھی الکوثر کے اس معنی میں شامل ہے جو ابن عباس نے کیا ہے یعنی خیر کثیر۔ اور اس کی الابتر کے ساتھ مناسبت بھی ہے۔

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾

پس تو اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔ ②

آیت ② فائدہ 1 عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اس آیت میں نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا گیا ہے حالانکہ یہاں اصل مفہوم یہ ہے کہ نماز پڑھو تو صرف اپنے رب کے لیے، اور قربانی کرو تو وہ بھی اس کے لیے، کسی غیر کے لیے نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے کھڑے ہو کر نماز پڑھو تو اس سے مراد نماز پڑھنے کا حکم دینا نہیں ہوتا بلکہ یہ حکم ہوتا ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھو، بیٹھ کر نہ پڑھو۔ یہی مفہوم اس آیت میں ادا ہوا ہے: ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)
''کہہ دے بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرمان بردار ہوں''۔

فائدہ 2 اللہ تعالیٰ نے کوثر عطا فرمانے کا احسان ذکر کر کے صرف رب ہی کے لیے نماز اور قربانی کا حکم دیا، کوثر (خیر کثیر) کے لفظ میں وہ سب کچھ آ گیا جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا، کوئی چیز ایسی نہیں جو اس میں شامل نہ ہو اس لیے اس کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی ہر عبادت (بدنی ہو یا مالی) صرف اسی کے لیے ہونی چاہیے، کسی غیر کے لیے نہیں۔ یہ انتہائی ناشکری ہے کہ ہر نعمت اللہ نے دی ہو اور بدنی یا مالی بندگی کسی اور کی ہو۔

فائدہ 3 بظاہر کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی پس تو ہمارے ہی لیے نماز پڑھ اور قربانی کر، مگر فرمایا ''تو اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر) اسے التفات من المتکلم الی الغائب کہتے ہیں۔ مقصد توجہ دلانا ہے کہ رب ہونے کی وجہ سے ہمارا حق ہے کہ ہماری ہی عبادت کرو کسی اور کی نہیں۔

فائدہ 4 بعض روایات میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ﴿وَانْحَرْ﴾ کا معنیٰ (نماز میں سینے پر

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝

یقیناً تیرا دشمن ہی لاولد ہے۔③

ہاتھ باندھ) ہے مگر وہ روایات صحیح نہیں البتہ سینے پر ہاتھ باندھنے کا مسئلہ دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

آیت ③ فائدہ ① ﴿شَانِئَكَ﴾ شَانِي شَنِئَهُ (سمع و فتح) شَنْأً (بروزن فلس) وَ شَنَآنًا (نون کے فتح اور سکون کے ساتھ) سے اسم فاعل ہے۔ اس کا معنیٰ دشمنی رکھنے والا ہے۔

﴿الْأَبْتَرُ﴾ جس کی اولاد نہ ہو، اصل میں یہ "بَتَرَهُ" سے مشتق ہے، جس کا معنیٰ ہے (قَطَعَهُ) یعنی اس نے اسے کاٹ دیا حِمَارٌ أَبْتَرُ وہ گدھا جس کی دم کٹی ہوئی ہو۔ دم کٹے سانپ کو بھی ابتر کہتے ہیں۔

هو کی ضمیر لانے کے علاوہ أَبْتَرُ پر الف لام لانے سے کلام میں مزید حصر پیدا ہوگیا، یعنی تمہارا دشمن ہی لاولد ہے، تم نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دشمن کہتے تھے محمد ﷺ اکیلے ہیں، ان کی اولاد نہیں، مر گئے تو کوئی نام لینے والا نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کے نام لینے والے بے شمار ہوں گے اور قیامت تک رہیں گے۔ کلمہ پڑھتے وقت، اذان میں، اقامت میں، نماز میں، درود میں، غرض آپ کا ذکر ہمیشہ رہے گا۔ آپ کی نسبت پر لوگ فخر کریں گے۔ اولاد بھی بہت ہوگی۔ مگر آپ کے دشمن کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔ اگر ان کی نسل چلی بھی تو اسے اپنے کافر باپ کی طرف منسوب ہونے پر کوئی فخر نہیں ہوگا۔

رکوعہا ۱ (۱۰۹) سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ (۱۸) آیاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

کہہ دے اے کافرو! ① میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ ② اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ ③ اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی۔ ④ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ ⑤ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔ ⑥

تفسیر سورة الکافرون

آیت ① تا ⑥ فائدہ ① **شان نزول** : طبرانی اور تفسیر ابن ابی حاتم وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایتیں آئی ہیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ اور چند دیگر مشرکوں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دو اور اس طرح ہم اور تم مل جل کر مکہ میں رہیں، ایک سال تم ہمارے بتوں کی پوجا کر لیا کرو، دوسرے سال ہم تمھارے الٰہ کی بندگی کر لیا کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل فرمائی۔ اگرچہ اس شان نزول کی روایت کی سند میں ایک شخص ابوحنیفہ عبداللہ ضعیف ہے لیکن آیت: ﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ﴾ (الزمر : ٦٤) ”کہہ دے: کیا اللہ کے غیر کے بارے میں تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں اس کی عبادت کروں؟ اے جاہلو!“ کے مضمون سے اس شان نزول کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ قریش کی جس فرمائش کا ذکر اس شان نزول کی روایت میں ہے، آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی فرمائش

ضرور کی تھی (احسن التفاسیر)

فائدہ ② صحیح مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کی رکعتوں میں یہ سورت اور: ((قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ)) پڑھی۔ (مسلم ، الحج، باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

صحیح مسلم ہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں فجر کی دو رکعتوں (سنتوں) میں پڑھیں۔ (مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب رکعتی الفجر) تین وتر پڑھتے تو اس کی دوسری رکعت میں یہ سورۃ پڑھا کرتے تھے۔ (ترمذی، ابواب الوتر، مایقرء به فی الوتر)

فائدہ ③ سورۃ کا مضمون: یہ ہے کہ ساری دنیا کے کافروں کو سنا دو کہ مسلمان غیر اللہ کی عبادت کسی صورت نہیں کر سکتے، اس مسئلے پر سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں۔

فائدہ ④ [تکرار کی حکمت] (الف) بہت سے اہل علم نے فرمایا کہ آیات میں تکرار تاکید کے لیے ہے کہ مسلمان کسی صورت بھی توحید کے متعلق کفار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور یہ کلام عرب اور قرآن مجید کا عام اسلوب ہے، جیسے فرمایا: ﴿ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (النبا: ٤ ، ٥) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں علی رضی اللہ عنہ کو دوسرے نکاح کی اجازت کے متعلق فرمایا: ((فَلَا آذَنُ ثُمَّ لَا آذَنُ)) میں اس کی اجازت نہیں دیتا پھر اس کی اجازت نہیں دیتا (دیکھیے بخاری حدیث : ٥٢٣٠)۔ اسی طرح سورۃ الرحمان اور مرسلات میں آیات کا بار بار تکرار ہے۔ یہاں تکرار کا مقصد یہ ہے کہ یہ کبھی ممکن ہی نہیں کہ میں توحید کا راستہ چھوڑ کر شرک کا راستہ اختیار کر لوں اور نہ یہ ممکن ہے کہ تم کافر رہتے ہوئے غیر اللہ کی عبادت کو یکسر ترک کر کے ایک اللہ کی عبادت پر قانع ہو جاؤ۔ شوکانی نے تکرار تاکید کے لیے ہونے کے علاوہ دوسری توجیہات کو تکلف قرار دیا ہے۔

(ب) ابن جریر طبری اور امام بخاری نے یہ تفسیر فرمائی ہے کہ: ﴿ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے کہ میں اب موجود وقت میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو اور

﴿ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴾ کا مطلب ہے کہ آئندہ بھی جب تک میں زندہ ہوں کبھی اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم نے عبادت کی ہے۔ اسی طرح کفار کے متعلق فرمایا کہ نہ اب زمانہ حال میں تم اس (اکیلے اللہ) کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں کرتا ہوں نہ آئندہ استقبال میں۔

اس پر ایک سوال ہے کہ کافروں کے متعلق کیسے فرمایا کہ وہ آئندہ ایک اللہ کی عبادت نہیں کریں گے؟ ہوسکتا ہے آئندہ وہ مسلمان ہو جائیں اور فی الواقع بے شمار کافر مسلمان ہوئے بھی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کافر رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں، مسلمان ہو جائیں تو الگ بات ہے۔ دوسرا جواب بخاری نے ذکر فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ آیات سن کر ان کے کفر میں اضافہ ہی ہوتا ہے، ایمان ان کی قسمت میں نہیں، جیسے فرمایا: ﴿ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴾ (المائدہ : ٦٨) ''اور جو وحی آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل کی گئی ہے، وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کی سرکشی اور کفر میں اضافہ ہی کرے گی''۔

(ج) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس معنیٰ کو ترجیح دی ہے کہ پہلی دو آیات میں ما موصولہ ہے دوسری دو میں مصدریہ، معنیٰ یہ ہوگا کہ میں اس چیز کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو (یعنی معبودان باطل کی) اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں کرتا ہوں (یعنی ایک اللہ کی) اور نہ میں وہ عبادت کرنے والا ہوں جو تم کرتے ہو (یعنی جس طرح تم تالیاں اور سیٹیاں بجا کر ذکر کرتے ہو، کپڑے اتار کر ننگے ہو کر طواف کرتے ہو) میں اس طرح عبادت نہیں کرتا اور نہ تم وہ عبادت کرنے والے ہو جو میں کرتا ہوں یعنی صرف اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر عبادت کرو، تم ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

(د) حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ جملہ فعلیہ ہے، اس کا معنیٰ ہے نہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس کی تم کرتے ہو۔ ﴿ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴾ جملہ

اسمیہ ہے جس میں نفی کی زیادہ تاکید ہے، یعنی میری شان ہی نہیں اور نہ کسی وقت مجھ سے ممکن ہے کہ (رسول ہوتے ہوئے) شرک کا ارتکاب کروں، یعنی نہ مجھ سے یہ فعل واقع ہوا ہے نہ مجھ سے اس کا شرعی امکان ہے۔ ﴿مَا عَبَدْتُّمْ﴾ ماضی شاید اس لیے فرمایا کہ میری نبوت سے پہلے بھی تم نے جو شرک کیا اس وقت بھی وہ میرے لائق نہیں تھا، نہ میں نے اس وقت یا بعد میں کسی غیر کی پرستش کی۔ کفار کا حال دونوں جگہ جملہ اسمیہ سے بیان فرمایا: ﴿وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ﴾ یعنی تم میں استعداد ہی نہیں، نہ تم سے ممکن ہے کہ تم بلاشریک غیرے اللہ واحد کی پرستش کرو۔

فائدہ 5 ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِىَ دِينِ﴾ کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیات جہاد سے منسوخ ہے، مگر یہ درست نہیں اب بھی کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں۔ ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِى ٱلدِّينِ﴾ ''دین میں زبردستی نہیں۔'' اگر وہ کفر پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو جزیہ ادا کر کے کفر پر رہ سکتے ہیں ہاں فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔

اس آیت سے ان لوگوں کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے جو اسلام، موجودہ عیسائیت، یہودیت، ہندو ازم اور تمام مذاہب کو ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر قرار دے کر سب کو درست قرار دیتے ہیں۔

رکوعہا ۱ (۱۱۰) سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۴) آیاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ﴿۱﴾ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔① اور تو لوگوں کو دیکھے کہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔② تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔③

تفسیر سورۃ النصر

آیت ① تا ③ فائدہ ﴿1﴾ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے بہت سی جنگوں میں رسول اللہ ﷺ کی نصرت فرمائی اور آپ کو فتح حاصل ہوئی مگر تمام عرب کے لوگ منتظر تھے کہ اگر مکہ پر آپ کا قبضہ ہو گیا تو آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، کیونکہ اصحاب الفیل کا واقعہ گزرے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اس سورہ میں فتح مکہ کا ذکر ہے۔ مکہ رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانہ میں فتح ہوا، یعنی وفات سے قریباً اڑھائی سال پہلے۔ اس فتح سے گویا آپ کی بعثت کا بنیادی مقصد پورا ہو گیا۔ اسلام قبول کرنے کی راہ میں تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں، اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے، حتیٰ کہ پورے عرب پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اس وقت یہ سورہ نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان کا کام مکمل ہونے پر اپنے پاس بلانے کی خبر دی۔

فائدہ ﴿2﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اشیاخ بدر کی موجودگی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بلوایا اور حاضرین سے پوچھا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ بعض نے کہا کہ اس میں ہمیں حکم ہوا ہے کہ جب ہمیں فتح و نصرت حاصل ہو تو اللہ کی حمد اور

استغفار کریں اور بعض خاموش رہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ابن عباس! تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا تو تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ ''جب اللہ کی نصرت اور فتح آ گئی''۔ یہ آپ کی موت کی علامت ہے۔ اب آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے استغفار کیجیے یقیناً وہ توّاب ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس سورہ کے متعلق مجھے بھی یہی معلوم ہے۔ (صحیح بخاری، تفسیر اذا جاء نصرالله)

فائدہ ③ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اشیاخ بدر نے جو تفسیر کی ہے وہ بھی بہت خوبصورت مفہوم ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد آٹھ رکعت ادا فرمائی۔ اس لیے امیر لشکر کے لیے مستحب ہے کہ کوئی شہر فتح کرنے کے بعد اس میں داخل ہو تو آٹھ رکعت پڑھے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما نے مدائن فتح کیا تو ایسے ہی کیا تھا۔

البتہ عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو مفہوم سمجھا ہے کہ اس میں آپ کو آپ کی موت کی اطلاع دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا کام مکمل ہو چکا، اب آپ کو ہمارے پاس آنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی سمجھا۔ اس لیے اس کے بعد تسبیح، تحمید، استغفار کثرت سے کرنے لگے۔

فائدہ ④ اس سورہ کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے بھی زیادہ آخرت کی تیاری شروع کر دی اور زیادہ سے زیادہ تسبیح و تحمید اور استغفار کرنے لگے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز نہیں پڑھی جس میں یہ نہ پڑھا ہو۔ ((سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ)) (صحیح بخاری/ تفسیر اذا جاء نصرالله)

بخاری ہی کی دوسری روایت میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ رکوع اور سجدے میں کثرت سے یہ دعا پڑھتے تھے ((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ

آپ یہ دعا قرآن پر عمل کرتے ہوئے پڑھتے تھے۔(بخاری تفسیر اذا جاء نصرالله)

فائدہ﴿5﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے، اس میں شور و غل زیادہ کر بیٹھے پھر اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے یہ پڑھ لے تو اس مجلس میں اس سے جو کچھ ہوا وہ معاف کر دیا جاتا ہے۔((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ))(ترمذی ۔ الدعوات/ باب مایقول اذا قام من مجلسه ۔ صحیح الترمذی : ۲۷۳۰)

رکوعہا ۱ (۱۱۱) سورۃ اللھب مکیۃ (۶) آیاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝

ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوگئے اور وہ خود ہلاک ہوگیا۔①

تفسیر سورۃ اللھب

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب آیت: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝﴾ اتری یعنی ”(اے نبی!) اپنے سب سے قریبی خاندان والوں کو ڈرا“ تو نبی ﷺ صفا پر چڑھے اور آواز دی، اے بنی فہر! اے بنی عدی!...... قریش کے قبیلوں کے نام لے لے کر پکارا، یہاں تک کہ وہ جمع ہو گئے۔ کوئی آدمی خود نہ آ سکا تو اس نے کسی کو بھیج دیا تا کہ دیکھے کہ کیا بات ہے؟ ابولہب اور قریش کے دوسرے لوگ آ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ اگر میں تمھیں اطلاع دوں کہ وادی میں ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟ انھوں نے کہا، ہاں! ہم نے آپ سے سچ کے علاوہ کبھی تجربہ نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا: تو پھر میں تمھیں ایک سخت عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہوں۔ ابولہب کہنے لگا: سارا دن تیرے لیے ہلاکت ہو! تو نے ہمیں اسی لئے جمع کیا ہے؟ تو یہ سورت اتری: ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝﴾ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ الشعراء، باب وانذرعشیرتک)

آیت① فائدہ〈1〉 ابولہب رسول اللہ ﷺ کا چچا تھا نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب۔ لہب شعلے کو کہتے ہیں۔ شعلے کا باپ یا شعلے والا۔ رخساروں کی خوبصورتی اور سرخی کی وجہ سے یا طبیعت کی تیزی اور جوش کی وجہ سے ابولہب کے نام سے مشہور ہوا۔ جہنمی ہونے کی وجہ سے فی الواقع شعلے والا ہی بن گیا۔ اس شخص کو رسول اللہ ﷺ سے سخت عداوت تھی۔ باوجود اس کے

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝

نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا۔ ②

کہ چچا باپ کی طرح ہوتا ہے، یہ ہر موقع پر آپ کی مخالفت کرتا اور ایذا کی کوشش کرتا۔ آپ کے دشمنوں میں سے یہ واحد شخص ہے، جس کے نام سے قرآن میں اس کے برے انجام کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں نسب اور خاندان کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ایمان اور کفر کی بنیاد پر اپنے اور غیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔

فائدہ 2 رسول اللہ ﷺ کی سخت مخالفت اور آپ کو ہلاکت کی بد دعا دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾ اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ خود ہلاک ہو گیا۔ یہ معنیٰ تو ظاہر ہے۔ دوسرا یہ کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو جائیں اور وہ (فی الواقع) ہلاک ہو گیا۔ یہ معنیٰ فرّاء نے کیا ہے۔ یعنی اس کی بد دعا کے مقابلے میں اہل ایمان کی بد دعا کی جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ فرما دیے کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو جائیں پھر بتایا کہ وہ ہلاک ہو چکا۔

فائدہ 3 ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے۔ ہاتھوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ ایذا رسانی میں ہاتھوں کا حصہ دوسرے تمام اعضا سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور زیادہ تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہاتھوں کے ہلاک ہونے کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہاتھوں سے مراد اولاد اور ساتھی ہیں، جو مددگار ہوتے ہیں، دست و بازو بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ایسا ہی ہوا اس کے مددگار جنگ بدر میں برباد ہو گئے، وہ خود جنگ میں نہیں گیا، شکست کی خبر آئی تو اسی صدمے سے مر گیا۔

آیت ② نہ اس کے کام اس کا مال آیا، نہ جو کچھ اس نے کمایا۔ کمائی سے مفسرین نے اس کے بیٹے مراد لیے ہیں، علاوہ ازیں اس نے اپنے خیال میں جو اعمال نیکی سمجھ کر کیے تھے، اس کے کسی کام نہ آئے۔ قرآن کی اس صریح آیت کی رو سے اسے ثُوَيْبَة (لونڈی) کا آزاد کر دینا

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

عنقریب وہ شعلے والی آگ میں داخل ہوگا۔③ اور اس کی بیوی (بھی آگ میں داخل ہوگی) ایندھن اٹھائے ہوئے۔④ اس کی گردن میں مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی۔⑤

کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ غیر نبی کے خواب سے کوئی شرعی مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔

آیت ③،④ ﴿ وَّامْرَاَتُهٗ ﴾ یعنی وہ اور اس کی بیوی شعلے مارتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل کا نام اروٰی بنت حرب بن امیہ تھا۔ یہ قریش میں اونچے نسب والی عورت تھی۔ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہما کی بہن اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھی اور اپنے خاوند کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت عداوت رکھتی تھی۔ (ابن کثیر)

﴿ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴾ وَّامْرَاَتُهٗ سے حال ہے، یعنی اس کی بیوی ایندھن اٹھائے ہوئے آگ میں داخل ہوگی۔ یعنی گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے جہنم میں داخل ہوگی، جو جہنم کو بھڑکانے کے لیے ایندھن ہے۔ ایندھن اٹھائے ہوئے ہونے کا دوسرا مطلب ہے کہ وہ لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عداوت کی آگ بھڑکاتی رہتی ہے۔ تیسرا یہ کہ اپنی پیٹھ پر ایندھن لا کر آپ کی راہ میں کانٹے بچھاتی رہتی ہے۔

آیت⑤ ﴿ مَّسَدٍ ﴾ کھجور کی چھال کی رسی یا گوگل کے درخت کی چھال کی رسی یا کسی بھی چیز کی بنی ہوئی رسی یا خوب مضبوط بٹی ہوئی رسی، لوہے کی رسی کو بھی ''مسد'' کہتے ہیں۔ یعنی جہنم میں اس حال میں داخل ہوگی کہ اس کی گردن میں مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی۔ صحیح بخاری میں مجاہد سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ زنجیر ہے جو آگ میں ہوگی جس میں مجرم پروئے جائیں گے: ﴿ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴾ (الحاقة : ۳۲) ''پھر ایک زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے اسے داخل کر دو۔''

رکوعہا ۱ (۱۱۲) سُوْرَةُ الْإِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ (۲۲) اٰیاتہا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

تفسیر سورہ اخلاص

اس سورہ کے صحیح احادیث میں بہت سے فضائل آئے ہیں، اختصار کی وجہ سے چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں۔

① ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک آدمی کو (سحر کے قیام میں) قل ھواللہ احد بار بار پڑھتے ہوئے سنا (اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں پڑھ رہا تھا) صبح ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے اس کا ذکر کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے کم سمجھ رہا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ سورہ قرآن کے تیسرے حصے کے برابر ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب قل ھواللہ احد، حدیث: ۵۰۱۳، ۵۰۱۴)

② عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا، وہ نماز میں اپنی قراءت کو قل ھو اللہ احد کے ساتھ ختم کرتا تھا۔ جب وہ لوگ واپس آئے تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے پوچھو وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: اس لیے کہ یہ رحمان کی صفت ہے اور مجھے اس کے پڑھنے سے محبت ہے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے بتا دو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھتا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم امته الی توحید الله تبارك و تعالٰی)

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝﴾

کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔①

سوتے وقت اور دوسرے اوقات میں معوذتین کے ساتھ ملا کر یہ سورہ پڑھنے کی احادیث معوذتین کے شروع میں آئیں گی، ان شاء اللہ۔

تنبیہ: بعض روایات میں اس سورہ کو روزانہ دوسو مرتبہ یا سو مرتبہ یا پچاس مرتبہ پڑھنے کی مختلف فضیلتیں آئی ہیں مگر ان روایات کی سندیں صحیح نہیں ہیں۔ شوکانی نے فتح القدیر میں وہ روایات درج کر کے ان کا ضعف واضح کیا ہے۔ ابن کثیر نے بھی ان روایات پر کلام کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سورہ کو تین سے زیادہ کسی عدد میں مسنون سمجھ کر پڑھنا درست نہیں۔ ہاں اپنی سہولت کے لیے کوئی شخص کوئی عدد مقرر کر لے، اسے مسنون نہ سمجھے تو درست ہے۔

شانِ نزول

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مشرکین نے کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے لیے اپنے رب کا نسب بیان کیجیے تو اللہ عزوجل نے: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ نازل فرمائی۔ (حاکم، تفسیر سورہ اخلاص، سند صحیح ہے مستدرك ج ۲ ص ۵۴۰)

آیت① فائدہ 1 ﴿هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اس کی ترکیب کئی طرح کی گئی ہے۔ زیادہ واضح دو ہیں:

(الف) ''هُوَ'' مبتدا ہے ''اللّٰهُ'' پہلی خبر اور ''اَحَدٌ'' دوسری خبر، معنیٰ یہ ہوگا (ہمارے جس رب کا نسب پوچھ رہے ہو) وہ اللہ ہے (وہ) ایک ہے۔

(ب) ''هُوَ'' مبدل منہ اور ''اللّٰهُ'' بدل، دونوں مل کر ''مبتدا'' اور ''احد'' خبر ہے۔ معنیٰ یہ ہوگا وہ اللہ (جس کے متعلق تم پوچھ رہے ہو) ایک ہے۔

فائدہ 2 ﴿اللّٰهُ﴾ کائنات کے خالق اور پروردگار کے بے شمار ناموں میں سے لفظ ''اللّٰهُ'' بطور علم یعنی اصل نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ باقی نام اس کی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کا اصل اَلْاِلٰهُ ہے ''اِلٰهٌ'' کا معنیٰ معبود ہے۔ اللہ کا معنیٰ یہ ٹھہرا کہ وہ خاص

ہستی جو عبادت کے لائق ہے، کیونکہ اس میں کمال کی تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ ﴿هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ رب جس کے متعلق تم پوچھ رہے ہو وہ کوئی نئی یا نامعلوم ہستی نہیں بلکہ وہ اللہ ہے جسے تم بھی جانتے اور مانتے ہو، وہی جو معبود برحق ہے۔ وہ اللہ ایک ہے۔

فائدہ 3 ﴿اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کے تین معانی ہو سکتے ہیں، تینوں یہاں درست ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ ایک ذات ہے۔ دو یا تین یا زیادہ نہیں۔ اس کی ذات میں تعدد نہیں، دوسرا یہ کہ وہ معبود برحق ہونے میں اکیلا ہے، اس کا کوئی ثانی یا شریک نہیں، تیسرا یہ کہ وہ ایک ہے اس کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ نہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوسکتا ہے۔ اس ایک ہی آیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی قسم کا شریک بنانے والوں کی تردید ہوگئی خواہ وہ مجوس (آتش پرست) ہوں، جو دو خالق مانتے ہیں، ایک خیر کا خالق (یزداں) دوسرا شر کا خالق (اہرمن) خواہ تثلیث (تین خداؤں) کو ماننے والے ہوں، خواہ ہندو ہوں جو کروڑوں دیوتاؤں کو خدائی میں حصہ دار مانتے ہیں اور خواہ وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہوں، جو ہر چیز ہی کو خدا مانتے ہیں، کیونکہ اگر ہر چیز ہی خدا ہے یا ہر چیز میں خدا ہے تو اللہ ایک تو نہ رہا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ ایک ہے اس میں تعدد اور کثرت نہیں۔

☆ اسی طرح ان لوگوں کے عقیدہ کی بھی تردید ہوگئی جو اللہ کے علاوہ کسی کو عالم الغیب یا اختیارات کا مالک سمجھ کر مدد کے لیے پکارتے ہیں اور انہیں خدائی اختیارات میں اللہ کا شریک بناتے ہیں۔

☆ اور ان لوگوں کی بھی تردید ہوگئی جو اللہ کی ذات سے ٹکڑوں کے جدا ہونے کے قائل ہیں، کوئی کہتا ہے عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، کوئی کہتا ہے عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، کوئی کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور میں سے پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ ان تمام صورتوں میں کوئی نہ کوئی ہستی اللہ کی شریک ٹھہرتی ہے، وہ ایک نہیں رہتا۔

میں نے ایک صاحب کی تقریر سنی وہ کہہ رہے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور میں سے نور

ہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں اللہ کے نور میں سے نور کس طرح جدا ہو سکتا ہے؟ میں آپ کو مثال سے سمجھا تا ہوں دیکھیے یہ ایک موم بتی جل رہی ہے اس میں سے ایک اور موم بتی جلا لیں تو کیا پہلی کے نور میں کوئی کمی واقع ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح نبی ﷺ اللہ کے نور میں سے نور ہیں اور اللہ کے نور میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس بیچارے نے یہ نہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مثالیں بیان کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (النحل : ٧٤) ''پس اللہ کے لیے مثالیں مت بیان کرو کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اور نہ یہ سمجھا کہ پہلی موم بتی میں کوئی کمی ہو یا نہ ہو، دو موم بتیاں تو بن گئیں، جب کہ اللہ ایک ہے اور نہ یہ سمجھا کہ اللہ کا نور نہ کسی سے نکلا ہے نہ اس سے کوئی نکلتا ہے، یہ عقیدہ تو بعینہ وہی عقیدہ ہے جو عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختیار کیا۔

☆ اس طرح ﴿ اَللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ سے ان لوگوں کی بھی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ بندہ جب زیادہ عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں اتر آتا ہے پھر وہ اللہ ہی بن جاتا ہے اور دلیل میں صحیح بخاری کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا فرمان نقل ہوا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ الخ

ان لوگوں نے سورہ اخلاص پر غور نہ کیا کہ اس صورت میں اللہ ایک تو نہ رہا جب کہ اس کا سب سے پہلا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ ایک ہے اور نہ اس حدیث کے آخر پر غور کیا جس میں واضح لفظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا وہ بندہ اگر مجھ سے مانگے تو میں اسے دوں گا اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دوں گا اگر ''من تو شدم تو من شدی'' کے مطابق اللہ اور بندہ ایک ہو گئے تو پھر مانگے گا کون اور دے گا کون؟ پناہ مانگنے والا کون ہو گا اور دینے والا کون؟

☆ اسی طرح ان لوگوں کی بھی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ بندہ عبادت کرتے کرتے اللہ

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ

اللہ ہی بے نیاز ہے۔②

کے ساتھ اس طرح واصل ہو جاتا ہے کہ وہ وہی بن جاتا ہے جس طرح لوہا گرم ہوتے ہوتے آگ بن جاتا ہے۔ اس غلطی کی بنیادی وجہ بھی اللہ کے لیے مخلوق کی مثالیں بیان کرنا ہے جبکہ اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ ان بیچاروں نے یہ نہ سوچا کہ آیت (اللہ ایک ہے) اس کی نفی کر رہی ہے۔ بندہ تو اللہ سے الگ ایک ذات ہے۔ مخلوق اور خالق دو ہیں، ایک نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ دو ایک کیسے بن گئے؟ یہ تو وہی عیسائیوں والا عقیدہ ہے کہ باپ خدا، بیٹا خدا، روح القدس خدا، مگر تین نہیں بلکہ ایک خدا۔ اللہ کے بندو! دو یا تین ایک کیسے بن گئے؟

الغرض یہ ایسی مبارک سورہ ہے کہ اللہ کی توحید کے خلاف جتنے عقیدے ہیں اور ان کی جتنی بھی توجیہیں کی جاتی ہیں یہ اکیلی سورہ بلکہ اس کی ایک آیت ہی ان کی تردید کے لیے کافی ہے پھر اگر رسول اللہ ﷺ نے اسے قرآن کا ثلث (ایک تہائی) قرار دیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

آیت ② فائدہ ① ﴿ اَلصَّمَدُ ﴾ کی تفسیر میں سلف کے کئی اقوال ہیں، ان کا خلاصہ تین اقوال میں آجاتا ہے۔ ① صمد وہ سردار ہے جس کی طرف لوگ قصد کر کے جائیں، جس سے بڑا کوئی سردار نہ ہو۔ صَمَدَ (باب فتح ونصر) "قصد کرنا" سے مشتق ہے۔ گویا صمد بمعنی مصمود ہے۔ اکثر سلف نے یہی معنی کیا ہے۔ ② جو کھاتا پیتا نہ ہو۔ ③ جس کا پیٹ نہ ہو، جو کھوکھلا نہ ہو جس سے کچھ نکلتا نہ ہو۔ اللہ پر تینوں معنیٰ صادق آتے ہیں۔

فائدہ ② عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب خبر پر الف لام آجائے تو کلام میں حصر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر "اَللّٰهُ صَمَدٌ" ہوتا تو معنی یہ تھا کہ اللہ صمد ہے۔ اب: ﴿ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴾ فرمایا تو معنیٰ یہ ہے کہ اللہ ہی "صمد" ہے، کوئی اور صمد نہیں۔ اس سے پہلی آیت میں: ﴿ اَللّٰهُ اَحَدٌ ﴾

﴿ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ﴾

نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا۔③

فرمایا جس کا معنی ہے اللہ ایک ہے۔ وہاں ''اللّٰہ الاحد'' نہیں فرمایا کہ اللہ ہی ایک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں حصر کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ وہ ہستی جو ایک ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے کسی اور کو احد کہہ ہی نہیں سکتے۔ ہر ایک کا ثانی کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔ کسی اور چیز میں اس کا ثانی نہ ہو تو مخلوق ہونے میں اس کے بیشمار ثانی موجود ہیں، اس لیے اس کائنات میں ایک ہستی صرف اللہ کی ہے اس لیے وہاں حصر کی ضرورت ہی نہیں، جبکہ صمد ہونے کے دعوے دار بیشمار ہیں۔ جن کے پاس لوگ اپنی ضرورتوں کے لیے جاتے ہیں۔ اس لیے فرمایا اصل صمد صرف وہ ہے کیونکہ دوسرے لوگ کتنے بھی بڑے سردار ہوں، لوگ ان کے پاس اپنی حاجتوں کے لیے جاتے ہوں، مگر وہ خود کسی نہ کسی کے محتاج ہیں، یہ صرف اللہ کی ہستی ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، باقی سب اس کے محتاج ہیں، وہ سب کو کھلاتا ہے، خود کھانے کا محتاج نہیں: ﴿ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ صمد کے اس مفہوم کو ''بے نیاز'' کا لفظ کافی حد تک ادا کرتا ہے۔

آیت③ فائدہ① ﴿ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ ''نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا'' اس آیت میں عیسائیوں کا رد ہے، جو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ یہودیوں کا رد ہے، جو عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ مشرکین عرب کا رد ہے، جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے ہیں۔ فلاسفہ کا رد ہے، جو کہتے ہیں کہ عقول عشرہ اللہ سے نکلی ہیں اور اب کائنات کا نظام وہ چلا رہی ہیں۔ ہندوؤں کا رد ہے، جو کروڑوں کی تعداد میں مخلوق کو خدا مانتے ہیں اور ان مسلمان کہلانے والوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ اہل بیت، اللہ کے ذاتی نور سے پیدا ہوئے ہیں۔

فائدہ② اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے لیے اولاد کی نفی کے بہت سے دلائل بیان فرمائے

ہیں ان میں سب سے واضح چار ہیں:

پہلی دلیل یہ ہے کہ اولاد لازماً باپ کی جنس سے ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جنس ہی نہیں۔ اس آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے: ﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ﴾ (المائدہ : ٧٥) ''نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، اس سے پہلے کئی رسول گزر گئے اور اس کی ماں صدیقہ ہے۔ وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے''۔

یعنی مسیح ابن مریم سے پہلے کئی رسول گزرے، وہ پہلے نہیں تھے پھر پیدا ہوئے، وہ حادث تھے جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے۔ باپ اور اولاد کی جنس ایک ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور عیسیٰ علیہ السلام حادث ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کھاتا نہیں اور وہ دونوں کھاتے تھے۔ جنس ایک نہ رہی اولاد کیسے بن گئی؟

دوسری دلیل یہ کہ والد اولاد اس لیے حاصل کرتا ہے کہ وہ اس کا محتاج ہوتا ہے اور اللہ کو کسی کی کوئی حاجت نہیں۔ اس آیت میں یہی فرمایا ہے: ﴿ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ هُوَ الْغَنِيُّ ﴾ (یونس : ٦٨) ''انہوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد پکڑی ہے۔ وہ پاک ہے وہی تو غنی ہے''۔ یعنی وہی تو ہے جو غنی ہے جسے کسی کی حاجت نہیں وہ اولاد کیوں بنائے گا؟

تیسری دلیل یہ کہ تمام مخلوق اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور بندہ ہونا بیٹا ہونے کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا: ﴿ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۝ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا ﴾ (مریم : ٩٢، ٩٣) ''اور رحمان کے لائق ہی نہیں کہ وہ اولاد پکڑے، آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے رحمان کے پاس بندہ (غلام) بن کر آنے والا ہے''۔

یعنی رحمان کی اولاد کس طرح ہوسکتی ہے؟ جب کہ زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام اور بندہ بن کر پیش ہونے والا ہے۔ بیٹا ہو اور غلام بھی، ممکن ہی نہیں۔

چوتھی دلیل یہ کہ اولاد اسی کی ہوتی ہے جس کی بیوی ہو اور اللہ تعالیٰ کی بیوی ہی نہیں تو اولاد

وَلَمْ يَكُن لَّهُۥ كُفُوًا أَحَدٌۢ ۝٤

اور نہ کبھی کوئی اس کے برابر کا ہے۔ ④

کیسے ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُۥ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُۥ صَٰحِبَةٌ ﴾ (الانعام : ۱۰۱) ''اس کی اولاد کیسے ہوگی؟ جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں''۔

فائدہ ③ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم نے مجھے جھٹلا دیا حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا۔ مجھے جھٹلانا تو اس کا یہ کہنا ہے کہ جس طرح اس نے مجھے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے، دوبارہ نہیں بنائے گا۔ حالانکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا مجھے دوبارہ بنانے سے آسان نہیں ہے اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے اولاد بنائی ہے حالانکہ میں احد ہوں، الصمد ہوں، میں نے نہ کسی کو جنا، نہ کسی نے مجھے جنا اور نہ ہی کوئی میرے برابر کا ہے۔ (صحیح بخاری، تفسیر قل هو الله احد)

فائدہ ④ ﴿ وَلَمْ يُولَدْ ﴾ ''اور وہ جنا نہیں گیا'' یعنی کسی نے اس کو نہیں جنا، اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کے سوال کا جواب ہے جنہوں نے کہا تھا ہمیں اپنے رب کا نسب بیان کیجیے کیونکہ جو پیدا ہوگا وہ حادث ہوگا، ہمیشہ سے نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ)) ''اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی۔'' (بخاری، کتاب التوحید، باب ۲۲ حدیث ۷۴۱۸)

معلوم ہوا، جو ولادت کے مرحلے سے گزرا ہو یا خلق کے مرحلے سے گزرا ہو، وہ اللہ نہیں ہوسکتا۔ غلط کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے اور ازلی (یعنی ہمیشہ سے) ہے۔ یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور سے جدا ہوئے ہیں، مگر درحقیقت وہی ہیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ جو پیدا ہوا وہ ہمیشہ سے کیسے ہوگیا؟

آیت ④ ﴿ كُفُوًا ﴾ ہم مثل، جوڑ، جو برابر کا ہو۔

تنبیہ ①: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کہنے سے اولاد اور کفو کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے مگر ان کو پھر الگ بھی ذکر فرمایا، جیسے: ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ ... الخ﴾ ''جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہو تو بلاشبہ اللہ سب کافروں کا دشمن ہے۔'' میں ملائکہ میں شامل ہونے کے باوجود جبریل اور میکائیل کو الگ ذکر فرمایا ہے۔ اس کا پہلا فائدہ ہے کہ دوبارہ ذکر کر کے اس کی طرف خاص توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مزید وضاحت اور تفصیل ہو جاتی ہے ممکن ہے ایک شخص کو صرف: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کہنے سے ان دونوں باتوں کی طرف توجہ ہی نہ ہوتی یا توجہ ہوتی بھی تو وہ اتنی وضاحت سے نہ سمجھ سکتا۔ جتنی وہ انہیں الگ ذکر کرنے سے سمجھا ہے۔ علم بلاغت میں اسے تجرید کہتے ہیں۔ (التسهيل لابن جُزّی)

تنبیہ ②: رسول اللہ ﷺ نے اس سورہ کو قرآن کا ثلث قرار دیا ہے۔ یہ قرآن کا ثلث کس طرح ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خود اس کی وضاحت نہیں فرمائی، اہل علم نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کی توجیہ فرمائی ہے۔ بعض نے اس سے مراد ثواب لیا ہے۔ بعض نے فرمایا: قرآن مجید کے تین ثلث ہیں ایک ثلث احکام، دوسرا وعد و وعید اور تیسرا اسماء و صفات۔ اس سورہ میں اسماء و صفات بیان ہوئے ہیں۔ بعض نے اللہ کی معرفت، آخرت کی معرفت اور صراط مستقیم کو قرآن کے تین ثلث قرار دے کر اللہ کی معرفت کو ثلث قرار دیا۔ بعض نے توحید، رسالت اور آخرت کو تین حصے قرار دیا اور اس سورہ کو توحید کی جامع ہونے کی وجہ سے ثلث قرآن قرار دیا۔ یہ اختلاف خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہر ایک نے اپنے ذہن سے ایک بات سوچی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے اس کی وضاحت نہیں آئی، ورنہ سب اس پر متفق ہو جاتے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس بات پر ایمان رکھا جائے کہ یہ سورہ قرآن کے ثلث کے برابر ہے اور یہ بات اللہ کے سپرد کر دی جائے کہ ثلث کے برابر کس طرح ہے؟

تنبیہ ③: رسول اللہ ﷺ صبح کی سنتوں میں: ﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ اور ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ

﴿اَحَدٌ﴾ پڑھا کرتے تھے۔(مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب رکعتی الفجر)
﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ توحید عملی کی جامع ہے کہ میں اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتا ہوں، نہ کروں گا، نہ یہ ممکن ہے کہ میں کسی اور کی عبادت کروں اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ توحید علمی کی جامع ہے کہ اللہ کے متعلق عقیدہ وعلم کیا ہونا چاہیے۔(ابن قیم فی زاد المعاد)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور معوذتین کی فضیلت وخصوصیت

کسی بھی قسم کے شر سے اللہ تعالی کی پناہ مانگنے کے لیے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس جیسی کوئی چیز نہیں۔ ان سورتوں میں تمام جسمانی و روحانی آفات سے بچانے اور انہیں دور کرنے کی زبردست تاثیر موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سورتوں کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔خصوصًا پناہ کے باب میں ان کو بے مثل قرار دیا ہے۔ یہاں چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

① عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے وہ آیات نہیں دیکھیں جو آج رات نازل کی گئی ہیں؟ جن کی مثل کبھی دیکھی ہی نہیں گئی، وہ: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ ہیں۔(مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قراءۃ المعوذتین)

عقبہ رضی اللہ عنہ ہی سے دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بہتر وہ چیز نہ بتاؤں جس کے ساتھ پناہ پکڑنے والے پناہ پکڑتے ہیں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں؟ فرمایا: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾۔
(نسائی، کتاب الاستعاذۃ حدیث ۵۰۲۰ وصححہ الالبانی)

① عبداللہ بن حبیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم ایک بارش اور اندھیرے والی رات میں نکلے، ہم رسول اللہ ﷺ کو تلاش کر رہے تھے تاکہ آپ ہمیں نماز پڑھائیں، چنانچہ ہم آپ سے جا ملے۔ آپ نے فرمایا: کہو!، میں نے کچھ نہ کہا، آپ نے پھر فرمایا: کہو تو میں نے کچھ نہ کہا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: کہو میں نے کہا: یا رسول اللہ! (ﷺ) کیا کہوں؟ فرمایا: کہو: ﴿قُلْ

﴿هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اورمعوذتین ''صبح وشام تین مرتبہ'' تمہیں ہر چیز سے کافی ہو جائیں گی۔
(ترمذی، نسائی ، سنن ابی داؤد۔ ترمذی نے فرمایا حدیث حسن صحیح)

② ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنوں سے اور انسان کی نظر سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ جب معوذتین اتریں تو آپ نے ان دونوں کو معمول بنالیا اور ان کے علاوہ کو چھوڑ دیا۔ (ترمذی ، نسائی، ابن ماجه، ترمذی نے اسے حسن صحیح اور البانی نے صحیح کہا ھے)

③ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معوذتین کے متعلق پوچھا۔ عقبہ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ سوال کیا تو آپ نے ہمیں ان دونوں سورتوں کے ساتھ صبح کی جماعت کروائی۔ (نسائی، کتاب الاستعاذة و صححه الالبانی) اس سے معلوم ہوا کہ ان کا نام معوذتین معروف تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے لمبی سورتوں کی جگہ انہیں کافی قرار دیا۔ (ترمذی، باب ما جاء فی الرقیة بالمعوذتین)

④ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات جب اپنے بستر پر آتے تو دونوں ہتھیلیوں کو جمع کرتے پھر ان میں پھونکتے، دونوں میں ((قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ)) پڑھتے، پھر دونوں ہتھیلیوں کو اپنے جسم پر جہاں تک ہوسکتا پھیرتے، پھیرنے کی ابتدا سر اور چہرے اور جسم کے سامنے والے حصے سے کرتے۔ آپ اس طرح تین مرتبہ کرتے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب المعوذات)

⑤ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوتے تو اپنے آپ پر معوذات پڑھ کر پھونکتے تھے۔ جب آپ کا درد بہت بڑھ گیا تو میں آپ پر پڑھتی اور آپ ہی کا ہاتھ اس ہاتھ کی برکت کی امید سے (آپ کے جسم پر) پھیرتی تھی۔ صحیح البخاری (حوالہ سابقہ)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ان تینوں سورتوں کو مذکورہ اوقات میں روزانہ پڑھنا چاہیے یہ ہر قسم کی روحانی اور جسمانی بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتی ہیں اور شیاطین الانس والجن کے شرور و آفات سے بھی اللہ کی پناہ میں رکھتی ہیں۔

فائدہ ① جب ہم اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ معوذات پڑھتے ہیں تو ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبان سے یہ لفظ ادا کر دیے جائیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ تمام خیالات، خواہشات اور اعمال ترک کرنے کی کوشش کی جائے جو شیطان کو پسند ہیں، جس طرح کسی شخص پر کوئی درندہ حملہ آور ہو تو اس کا صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میں فلاں قلعہ میں پناہ لیتا ہوں، بلکہ اسے اس قلعہ میں پہنچنے کی جدو جہد بھی کرنا ہو گی۔ اسی طرح دشمن کے حملے سے اللہ کی پناہ طلب کرنے والے اور اس پر فتح و نصرت کی دعا کرنے والے کے لیے پناہ اور دعا کے الفاظ ہی منہ سے ادا کر دینا کافی نہیں بلکہ دشمن کے خلاف تیاری، میدان میں نکلنا اور قتل و قتال کے لیے تیار رہنا بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ دعا بھی کی جائے تو واقعی اللہ تعالیٰ کی پناہ بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کی حفاظت بھی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عملاً تو ہر بات میں شیاطین الانس والجن کی پیروی کرے، مگر منہ سے اللہ کی پناہ طلب کرتا رہے تو یہ پناہ طلب کرنا اسے شیاطین سے اور ان کے وسوسوں سے نہیں بچا سکتا۔ اس کی ایک جامع مثال یہ ہے کہ ''لا الہ الا اللہ'' کہنے والا شخص یقیناً جنت میں جائے گا، اس پر جہنم کی آگ حرام ہے مگر کیا صرف یہ الفاظ ادا کرنے والا جہنم سے اللہ کی پناہ میں چلا جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ وہ جو ''صَادِقًا مِنْ قَلْبِہٖ'' سچے دل سے صرف اللہ کو معبود برحق مانے، اسی کی عبادت کرے، اس کی یہ فضیلت ہے۔ اگر وہ کسی غیر کو یا اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنا لے تو پھر کروڑ دفعہ بھی لا الہ الا اللہ پڑھتا رہے تو جہنم سے نہیں بچ سکتا۔ (ملخص از قاسمی)

رکوعہا ۱ (۱۱۳) سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَكِّيَّةٌ (۲۰) اٰیاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝

تو کہہ میں مخلوق کے رب کی پناہ پکڑتا ہوں۔ ①

تفسیر سورہ الفلق

آیت ① فائدہ ① پناہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کسی چیز سے خوف محسوس کرے اور سمجھے کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس سے بچنے کے لیے وہ کسی دوسرے کی حفاظت میں چلا جائے یا کسی چیز کی آڑ لے لے۔ ظاہر ہے پناہ اسی کی لی جاتی ہے جس کے متعلق سمجھا جائے کہ اس خوفناک چیز سے وہ بچا سکتا ہے۔ پناہ بعض اوقات ایسی چیزوں کی لی جاتی ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے بعض خوفناک چیزوں سے بچنے کا سبب بنا دیا ہے۔ مثلاً دشمن سے بچنے کے لیے کسی قلعہ یا خندق یا مورچے وغیرہ کی پناہ لینا۔ کسی ظالم سے بچنے کے لیے کسی طاقتور آدمی یا قوم کی پناہ لینا اور بعض اوقات یہ سمجھ کر پناہ لی جاتی ہے کہ وہ خطرات جن میں دنیا کے بچاؤ کے تمام ذرائع و اسباب بے کار ہو جائیں، ان میں فلاں ہستی بچا سکتی ہے۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں جس پناہ کا ذکر ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں جہاں بھی اللہ سے پناہ مانگی گئی ہے، اس سے مراد پناہ کی دوسری قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے سے یہ پناہ مانگنا شرک ہے۔ مشرک لوگ اپنے تحفظ کے لیے اللہ کو چھوڑ کر دیوی دیوتاؤں، جنوں، فرشتوں یا پیروں، پیغمبروں کی پناہ لیتے اور ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں تعلیم دی کہ ایسے تمام خطرات سے بچنے کے لیے میری ان صفات کی پناہ لو جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ ایسے تمام خطرات سے میں ہی تمھیں بچا سکتا ہوں۔

﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝﴾

اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔ ②

فائدہ ② ﴿بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ فَلَقَ يَفْلِقُ فَلْقًا (باب ضرب)۔ پھاڑنا۔ یہاں مصدر (فَلْقٌ) مفعول (مَفْلُوْقٌ) کے معنیٰ میں ہے۔ اس کی تفسیر میں معتبر اقوال دو ہیں، پہلا یہ کہ فلق کا معنیٰ صبح ہے، کیونکہ صبح رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَالِقُ الْإِصْبَاحِ﴾ (الانعام : ۹۶) ''یعنی وہ رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح لانے والا ہے۔'' صبح کے رب کی پناہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ جو رب، رات کی تاریکی کو دور کر کے صبح روشن لانے والا ہے، میں ساری مخلوق کے شر سے اس کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ جب وہ رات کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے جس میں بے شمار شرور پائے جاتے ہیں تو اس کے لیے دوسرے شرور کو دور کرنا اور ان سے بچانا تو معمولی بات ہے۔

دوسرا یہ کہ فلق سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو پھاڑ کر نکالا ہے، مثلاً زمین سے نباتات، پہاڑوں سے چشمے، بادلوں سے بارش، رحم مادر اور انڈوں سے حیوانات۔ ان کے علاوہ جہاں بھی پیدائش کا معاملہ ہے اکثر انشقاق (پھٹنے) کا سلسلہ موجود ہے۔ گویا فلق کا معنیٰ مخلوق ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں ساری مخلوق کے مالک کی پناہ پکڑتا ہوں تاکہ وہ مجھے اپنی مخلوق کے شر سے بچالے یہ معنیٰ زیادہ جامع ہے۔

آیت ② فائدہ ① ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ ''اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی''۔ اس میں ہر مخلوق کے ہر شر سے پناہ مانگ لی گئی ہے۔ کوئی نقصان، تکلیف یا پریشانی باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آ گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پناہ مانگنے کے لیے یہ بہت ہی جامع سورہ ہے، کیونکہ جب بندہ ساری مخلوق کے ہر شر سے بچنے کے لیے اس کے رب کی پناہ میں چلا گیا تو پھر مخلوق میں سے کون ہے جو اسے نقصان پہنچا سکے؟ اور اگر وہ مالک ہی اپنی مخلوق کو نقصان پہنچانے سے نہ روکے تو مخلوق کے شر سے کون بچ سکتا ہے؟

وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾

اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے۔ ③

فائدہ 2 اس آیت میں مخلوق کے اس شر سے بھی پناہ مانگ لی گئی جو پہنچ چکا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اسے دور کر دے اور اس سے بھی جس کا خوف ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

آیت ③ فائدہ 1 اگرچہ ساری مخلوق کے شر سے پناہ مانگنے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہی، جس کے شر سے پناہ مانگی جائے مگر مخلوق میں سے چند چیزوں کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کا سبق دیا گیا، کیونکہ یہ بہت ہی خوفناک ہیں اور ان کے شر سے پناہ مانگنے کی تو بہت ہی ضرورت ہے۔

فائدہ 2 ﴿غَاسِقٍ﴾ کا معنیٰ ہے تاریک، سخت اندھیرے والی۔ قاموس میں ہے ''غَسَقَ اللَّيْلُ: اشْتَدَّتْ ظُلْمَتُهُ'' یعنی ''غَسَقَ اللَّيْلُ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ رات کی تاریکی بہت سخت ہو گئی۔

سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ﴾ ''یعنی رات کے سخت تاریک ہونے تک۔'' ﴿وَقَبَ﴾ (باب ضرب) داخل ہونا، غائب ہونا۔ فراء نے: ﴿غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ کا معنیٰ کیا ہے ''اللَّيْلُ إِذَا دَخَلَ كُلَّ شَيْءٍ وَأَظْلَمَ'' (رات جب ہر چیز پر چھا جائے اور تاریک ہو جائے) تاریک رات کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کی تلقین اس لیے کی گئی ہے کہ اندھیری رات میں بے شمار شرور وخطرات ہوتے ہیں اکثر مجرم، چور، ڈاکو، زانی، قاتل، شبخون مارنے والے رات ہی کو نکلتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو رات ہی میں قتل کرنے کے منصوبے بنائے گئے تاکہ نہ آپ بچاؤ کر سکیں، نہ قاتل کا پتا چل سکے۔ جنگلی جانوروں مثلاً شیر، چیتے، بھیڑیے وغیرہ اور حشرات الارض مثلاً سانپ، بچھو وغیرہ کا خطرہ رات کو زیادہ ہو جاتا ہے مچھر، کھٹمل وغیرہ رات کو جو تکلیف دیتے ہیں، سب جانتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق اکثر بیماریوں کے جراثیم اندھیرے میں پیدا ہوتے ہیں اور سورج کی روشنی میں

وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۙ

اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے۔④

ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اندھیرے میں وہمی چیزوں کا خوف مزید بڑھ جاتا ہے۔ ان سب پر مزید یہ کہ یہ سب شرور اندھیرے میں واقع ہونے کی وجہ سے انسان ان سے اپنا بچاؤ بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے اندھیری رات کی برائیوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی۔

فائدہ③ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند دیکھا تو فرمایا: اے عائشہ! اس کے شر سے پناہ مانگو، کیونکہ یہی : ﴿غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ ہے۔ (ترمذی، تفسیر المعوذتین وصححه الترمذی والالبانی)

اس صورت میں غاسق کا معنی اندھیرے والا اور: ﴿اِذَا وَقَبَ﴾ کا معنی ''اذا غاب'' ہے یعنی جب غائب ہو جائے۔ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ہے: ''اور برائی اندھیرا کرنے والے کی سے، جب وہ چھپ جائے'' یعنی چاند غروب ہو کر اندھیرا پھیلا دیتا ہے۔ بعض مفسرین نے : ﴿غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ سے سورج مراد لیا ہے۔ کیونکہ سورج غائب ہو کر سخت تاریکی پھیلنے کا باعث بنتا ہے۔ بہرحال ان تفسیروں اور پہلی تفسیر میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ مراد تاریکی کے شر سے پناہ مانگنا ہی ہے۔

آیت④ ﴿النَّفّٰثٰتِ﴾ نَفَّاثَةٌ کی جمع ہے۔ نَفَثَ يَنْفُثُ نَفْثًا (باب نصر وضرب) پھونک مارنا، جس کے ساتھ تھوڑی سی تھوک ہو۔ ﴿نَفَّاثَاتٌ﴾ بہت پھونکیں مارنے والی عورتیں یا جماعتیں۔ اگر نَفَّاثَةٌ میں تا عَلَّامَةٌ کی طرح مبالغہ کے لیے ہو یا نَفَّاثَاتٌ سے مراد نفوس ہوں تو عورتوں کے علاوہ بہت پھونکیں مارنے والے مرد بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

﴿الْعُقَدِ﴾ عُقْدَةٌ کی جمع ہے ''گرہیں'' ابن جریر اور مفسرین سلف کے مطابق گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں سے مراد جادو کرنے والی عورتیں یا لوگ ہیں، کیونکہ انھوں نے جس پر جادو کرنا ہوتا ہے اس کے بال یا کوئی چیز حاصل کر کے اس پر جادو کرتے ہوئے، کسی

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔⑤

تانت یا دھاگے میں گرہیں ڈالتے جاتے اور منتر پڑھ پڑھ کر ان میں پھونکیں مارتے جاتے ہیں۔ ان کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کی تلقین اس لیے کی گئی کہ وہ چھپ کر وار کرتے ہیں، آدمی کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ اسے تکلیف کیوں ہے؟ وہ بیماری سمجھ کر علاج معالجہ میں لگا رہتا ہے اور تکلیف بڑھتی جاتی ہے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ گرہوں سے مراد مردوں کے پختہ عزم اور ارادے ہیں اور نفث سے مراد یہ ہے کہ جس طرح تھوک کے ساتھ رسی کی گرہیں نرم کی جاتی ہیں اس طرح عورتیں اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مردوں کے پختہ ارادوں کو بدل دیتی ہیں۔ اس آیت میں ان عورتوں کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی۔ یہ معنیٰ پر لطف ہونے کے باوجود سلف کی تفسیر کے خلاف ہے اور اکثر یہ معنیٰ کرنے والے وہ لوگ ہیں، جو جادو سے نقصان پہنچنے کے قائل نہیں اور انہیں اپنے اس موقف پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ صحیح بخاری و مسلم اور حدیث کی بہت سی دوسری کتابوں میں مروی حدیث کو ماننے ہی سے انکار کر دیتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ لبید بن اعصم نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا تھا اور آپ اس جادو کی وجہ سے کچھ عرصہ بیمار اور پریشان رہے تھے۔ (دیکھیے بخاری، حدیث نمبر ۵۷۶۵، ۶۳۹۱)

آیت⑤ فائدہ ①: حسد کا معنیٰ ہے کسی شخص پر اللہ کی نعمت سے جلنا کہ یہ نعمت اسے کیوں ملی؟ اور اس کے زوال کی تمنا کرنا۔ پھر خواہ یہ خواہش یا کوشش ہو کہ وہ حسد کرنے والے کو ملے، یا نہ ہو۔ قباحت کے لحاظ سے حسد کے کئی درجے ہیں سب سے بدتر یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت دی ہے، اس سے چھن جانے کی تمنا کے ساتھ ساتھ یہ قول و عمل کے ساتھ کوشش بھی کرے کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے۔ پھر بعض کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے اور بعض کو اس سے غرض نہیں ہوتی بلکہ وہ اسی پر خوش ہوتے ہیں کہ اس کے پاس یہ

نعمت نہیں رہی۔

دوسرا یہ کہ عملی طور پر تو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے لیکن دل میں یہ خواہش رکھے کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے۔ یہ دونوں صورتیں حرام ہیں۔

فائدہ ② سوال پیدا ہوتا ہے کہ حاسد کے شر سے پناہ مانگتے وقت (جب وہ حسد کرے) کی قید کیوں لگائی؟ جواب یہ ہے کہ حاسد کے حسد کا نقصان دوسرے شخص کو اسی وقت ہوتا ہے، جب وہ اپنے حسد کے تقاضے کے مطابق قول یا فعل سے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے یا حسد کے تقاضے کے مطابق یہ خواہش رکھے کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے۔

حسد کی ایک صورت یہ ہے کہ دل میں خیال آتا ہے کہ فلاں شخص کو یہ نعمت کیوں ملی؟ مگر آدمی اس خیال کو ہٹا دیتا ہے، نہ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، اور نہ ایسا ارادہ یا خواہش رکھتا ہے کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے، اس پر مؤاخذہ نہیں۔ ایسے خیالات آ ہی جاتے ہیں کیونکہ انسان کی طبیعت میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا کوئی ہم جنس کسی خوبی میں اس سے بڑھ کر ہو تو جو شخص حسد کے تقاضے پر عمل نہ کرے، بلکہ ایسے خیال آنے پر انہیں دور کرنے کی کوشش کرے، اور محسود کے ساتھ احسان کرے، اس کے لیے دعا کرے، اس کی خوبیاں عام بیان کرنا شروع کر دے تاکہ دل میں اس بھائی کے ساتھ حسد کی بجائے محبت پیدا ہو جائے تو اس کے شر سے پناہ مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا حسد کے تقاضے پر عمل کرنے کی بجائے اس سے مقابلہ کرنا اور اسے دور کرنے کی کوشش کرنا تو ایمان کے اعلیٰ درجہ کی علامت ہے اور حسد سے نجات پانے کا طریقہ بھی یہی ہے۔

فائدہ ③ حسد کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حاسد دراصل اللہ تعالیٰ پر ناراض ہوتا ہے کہ اس نے اسے وہ نعمت کیوں دی؟ پھر بندے پر اس کے کسی جرم کے بغیر ناراض ہوتا ہے، کیونکہ اس نعمت کے حصول میں اس کا کچھ اختیار نہیں، تو حاسد دراصل اللہ کا بھی دشمن ہے اور

اللہ کے بے گناہ بندوں کا بھی۔

فائدہ 4 حسد کا علاج یہ ہے کہ بندہ سوچے کہ حسد کا نقصان دین و دنیا میں حسد کرنے والے ہی کو ہے۔ محسود کو کوئی نقصان نہیں، نہ دنیا میں، نہ دین میں، بلکہ اسے دین و دنیا میں حاسد کے حسد سے فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ دین میں فائدہ یہ ہے کہ وہ مظلوم ہے خصوصاً جب حاسد قول یا عمل سے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ قیامت کو اسے ظلم کا بدلہ ملے گا اور ظالم حاسد نیکیوں سے مفلس رہ جائے گا اور دنیاوی فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے دشمن غم ،فکر اور عذاب میں مبتلا رہیں اور حاسد جس عذاب اور مصیبت میں گرفتار ہے، اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہوسکتی ہے؟ وہ ہر وقت حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے اور اطمینان اور دلی سکون سے محروم ہوتا ہے۔

فائدہ 5 حسد آدمی کو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے، اہل علم فرماتے ہیں: آسمان میں اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی نافرمانی حسد کی وجہ سے واقع ہوئی کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور زمین پر پہلی نافرمانی یعنی قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے کا باعث بھی یہی حسد تھا۔ برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام اور ان کے والدین پر جو ظلم کیا، اس کا باعث بھی حسد تھا، یہودی لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں، ایمان نہ لائے تو اس کا باعث بھی یہی حسد تھا اور یہی حسد تھا جس کی بنا پر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا۔ گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر کے پیچھے بھی عموماً حسد ہی کا جذبہ چھپا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے شر کے بعد حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی۔

فائدہ 6 بعض اوقات حسد کا لفظ غِبطہ یعنی رشک اور ریس کے معنی میں بھی آ جاتا ہے، یعنی کسی شخص پر اللہ تعالیٰ کی نعمت دیکھ کر یہ خواہش کرے کہ مجھے بھی یہ نعمت مل جائے لیکن یہ خواہش نہ ہو کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے، یہ حرام نہیں، مگر صرف دو چیزوں میں ریس کرنا پسندیدہ ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حسد (ریس کرنا) نہیں

مگر دو چیزوں میں۔ ایک وہ آدمی جسے اللہ نے قرآن دیا تو وہ رات کی گھڑیوں اور دن کی گھڑیوں میں اس کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا ہے تو وہ رات اور دن کی گھڑیوں میں اس سے خرچ کرتا رہتا ہے۔ (متفق علیه)

رکوعھا ۱ (۱۱۴) سُوْرَۃُ النَّاسِ مَکِّیَّۃٌ (۲۱) اٰیاتھا ۶

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾

تو کہہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب کی۔ ①

تفسیر سورہ الناس

آیت ① فائدہ ﴿1﴾ پناہ کا مطلب پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے۔ آدمی جب کسی سے خطرہ محسوس کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے کسی مربی (پرورش کرنے والے) مثلاً ماں یا باپ کی پناہ لیتا ہے، ان سے چمٹ جاتا ہے تاکہ وہ اسے بچالیں۔ اگر وہ کمزور ہوں اور نہ بچا سکتے ہوں تو بادشاہ سے بچانے کی درخواست کرتا ہے اور اس کی پناہ لیتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ اپنی قوت اور فوج کے ذریعے اسے بچا سکتا ہے۔ اگر نظر آ رہا ہو کہ اس خطرے سے بچانا بادشاہ کے بس کی بات بھی نہیں تو پھر اس ہستی کی پناہ لیتا ہے جسے وہ غیبی قوتوں کا مالک سمجھتا اور جس کی عبادت کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیوی اسباب ختم ہونے کے بعد اسے اس کے علاوہ کہیں سے پناہ نہیں مل سکتی۔

اس سورہ میں وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ لینے کے لیے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ساتھ پناہ پکڑنے کی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر اپنے کسی پرورش کرنے والے کی پناہ پکڑنا چاہو تو بجائے اس کے کہ کسی ایسے شخص کی پناہ پکڑو، جو کسی ایک آدھ یا چند آدمیوں کی پرورش کر رہا ہو اور حقیقت میں وہ خود محتاج ہو، اس کی پناہ پکڑو جو سب لوگوں کا رب اور سب کی پرورش کرنے والا ہے، جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں اگر کسی صاحب قوت بادشاہ کی پناہ پکڑنا چاہو تو بجائے اس کے کہ ان بادشاہوں کی پناہ پکڑو جو فوجوں کے محتاج

ہیں، جن کا اقتدار محدود اور عارضی ہے اور جن کی اپنی زندگی اور اپنا نفع ونقصان ان کے ہاتھ میں نہیں، تم اس کی پناہ پکڑو جو تمام لوگوں کا بادشاہ ہے اور اس کی قوت اور بادشاہی کسی فوج یا سپہ سالار کی محتاج نہیں اور اگر کسی ایسی ہستی کی پناہ لینا چاہو جسے غیبی قوتوں کا مالک ہونے کی وجہ سے تم عبادت کا حق دار سمجھتے ہو تو وہ صرف اور صرف ایک ہی ہے، جو تمام لوگوں کا معبود برحق ہے اور صرف وہی تمھیں ان خطرات میں پناہ دے سکتا ہے جن کے سامنے تمام مربی اور تمام بادشاہ بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نہ کوئی غیبی قوتوں کا مالک ہے، نہ کائنات کی کسی چیز میں کسی دوسرے کا دخل ہے اور نہ کسی کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

فائدہ 2 سورۃ الفلق میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ﴿ رَبِّ الْفَلَقِ ﴾ کے ساتھ ساری مخلوق کے شر سے عموماً اور مخلوق میں سے تین چیزوں کے شر سے خصوصاً پناہ مانگی گئی ہے (یعنی اندھیری رات، گرہوں میں پھونکنے والیوں اور حاسد کے شر سے) اس سورت میں صرف ایک چیز یعنی ہٹ ہٹ کر وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ساتھ پناہ مانگی گئی، کیونکہ پہلی تینوں چیزیں انسان کے جسم و جان کو نقصان پہنچانے والی ہیں، جب کہ وسوسہ اس کے ایمان کو نقصان پہنچانے والا ہے اور ایمان کی حفاظت کی فکر جسم و جان سے بھی اہم ہے۔

فائدہ 3 پہلی تین آیات میں الناس کا لفظ بار بار لایا گیا ہے حالانکہ ﴿ رَبِّ النَّاسِ ﴾ کے بعد والی آیات میں النَّاسِ کی ضمیر بھی لائی جا سکتی تھی۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم) کہ لوگوں کے وسوسے کا شر اتنا خوفناک ہے کہ بندہ بار بار اس کا حوالہ دیتا ہے کہ یا اللہ! لوگوں کا رب بھی تو ہے، لوگوں کا بادشاہ بھی تو ہے لوگوں کا الٰہ بھی تو ہے، اس لیے لوگوں سے پناہ بھی تو ہی دے سکتا ہے۔ اس سورہ میں ان تینوں صفتوں کی پناہ پکڑتے وقت ضمناً بھی بار بار لوگوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے، پھر ﴿ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ... الخ﴾ کے ساتھ صاف لفظوں میں بھی لوگوں کے وسوسے کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ تفسیر قاسمی میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ ناصر سے ایک اور حکمت نقل کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پناہ مانگنے والے بھی

مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾

لوگوں کے بادشاہ کی۔ ② لوگوں کے معبود برحق کی۔ ③ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو ہٹ ہٹ کر آنے والا ہے۔ ④

چونکہ لوگ ہیں، اس لیے پناہ مانگتے وقت بار بار ان نسبتوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے درمیان اور لوگوں کے درمیان موجود ہیں کہ یا اللہ! تو لوگوں کا رب بھی ہے، لوگوں کا بادشاہ بھی اور لوگوں کا معبود برحق بھی، تو جب لوگوں کا سبھی کچھ تو ہی ہے تو تیرے علاوہ انہیں پناہ دینے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ (قاسمی)

آیت ④ فائدہ ① ﴿اَلْوَسْوَاسِ﴾ واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو (وِسْوَسَ يُوَسْوِسُ) کا مصدر ہے (وسوسہ ڈالنا) جیسے زلزال (زا کے کسرہ سے) سخت ہلانا (زمخشری) یہاں وَسْوَاس واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ مصدر نہیں بلکہ صفت ہے، یعنی اسم فاعل کے معنیٰ میں ہے۔ وسوسہ ڈالنے والا، جس طرح ثَرْثَار بہت باتیں کرنے والا، دَحْدَاح بہت چھوٹے قد والا، وغیرہ (تفسیر ابن قیم رحمہ اللہ)

فائدہ ② ''وَسْوَاس'' مضاعف رباعی ہے اس کے مفہوم میں تکرار (بار بار وسوسہ ڈالنا) شامل ہے، جس طرح زَلْزَلَ کے مفہوم میں بار بار ہلانا اور ثَرْثَرَ میں بولتے چلے جانا شامل ہے۔ وسواس کا معنیٰ وسوسہ ڈالنے والا جو بار بار وسوسہ ڈالتا ہے۔

فائدہ ③ وَسْوَسَۃ کا اصل معنیٰ وہ ہلکی یا دبی ہوئی حرکت یا آواز ہے، جو عام طور پر محسوس نہ ہوتی ہو۔ اس سے مراد وہ بات بھی ہوتی ہے، جو بالکل آہستہ آواز سے کسی کے کان میں کہی جائے اور صرف اسی کو سنائی دے اور وہ بھی جو آواز کے بغیر کسی کے دل میں ڈال دی جائے۔ جیسے شیطان انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

فائدہ ④ ﴿اَلْخَنَّاسِ﴾ خَنَسَ يَخْنِسُ (باب ضرب ونصر) پیچھے ہٹنا، ہٹانا۔ سورۃ التکویر میں ستاروں کو ﴿اَلْخُنَّسِ﴾ فرمایا ہے، کیونکہ وہ روزانہ مغرب میں غروب ہوتے ہیں، پھر پیچھے

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿۵﴾

وہ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ ﴿۵﴾

ہٹتے ہوئے دوبارہ مشرق سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ ﴿اَلْخَنَّاسِ﴾۔ مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی بہت پیچھے ہٹنے والا۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ ایک دفعہ ہی وسوسہ ڈال کر پیچھے نہیں ہٹ جاتا بلکہ بار بار وسوسہ ڈالتا، بار بار پیچھے ہٹتا اور پھر ہٹ ہٹ کر وسوسہ ڈالتا ہے۔

شیطان کو ﴿الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ آدمی کے دل میں برے خیالات ڈالتا ہے، جب وہ اللہ کا ذکر کرے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے، جب ذکر سے غافل ہو تو دوبارہ لوٹ کر وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب نماز کے لیے اذان ہوتی ہے شیطان گوز مارتا ہوا پیٹھ دے کر بھاگ جاتا ہے، تاکہ اذان نہ سنے۔ جب اذان پوری ہوتی ہے تو آ جاتا ہے، جب نماز کی اقامت ہوتی ہے چلا جاتا ہے، جب اقامت مکمل ہوتی ہے تو واپس آ کر آدمی اور اس کے دل کے درمیان خیالات ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے فلاں چیز یاد کر، فلاں چیز یاد کر، وہ چیزیں جو اسے یاد نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ آدمی کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب فضل التاذین)

معلوم ہوا آدمی نماز میں دل سے حاضر نہ ہو تو شیطان اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ وہ صرف اس ذکر سے پیچھے ہٹتا ہے، جس میں زبان کے ساتھ دل بھی شریک ہو۔

آیت ﴿۵﴾ فائدہ ﴿1﴾ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات سے اللہ کی پناہ مانگے کہ وہ اس کے دل میں کوئی وسوسہ ڈال دے اور اسے راہ حق سے ہٹا دے اور اس بات سے بھی کہ وہ اس کے خلاف لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر انہیں بھڑکا دے، جس کے نتیجے میں دین پر عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے کے راستے میں وہ اس کے لیے رکاوٹ بن جائیں۔ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ ہی اس کے شر سے بچا سکتا ہے۔

اس لیے اسی کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

فائدہ ② آدمی کوئی نیکی کرے یا برائی، اس کا آغاز دل میں اس کا خیال پیدا ہونے سے ہوتا ہے، خیال جما رہے تو وہ خواہش کو ابھارتا ہے، خواہش سے ارادہ بنتا ہے، ارادہ پختہ ہو جائے تو عزم بنتا ہے، عزم نیت کا باعث ہوتا ہے، نیت اعضا کو عمل کے لیے حرکت میں لے آتی ہے اور آخری مرحلہ اس نیکی یا بدی پر عمل کا ہوتا ہے۔ دل میں پیدا ہونے والا یہ خیال، اگر نیکی کا ہو تو رحمان کے مقرر کیے ہوئے فرشتے کی طرف سے ہوتا ہے اور الہام کہلاتا ہے۔ اگر بدی کا ہو تو وسوسہ کہلاتا ہے اور شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ ان دونوں کا فرق اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ خیال کتاب و سنت کی رو سے نیکی کا کام ہے تو الہام ہے، ورنہ وسوسہ۔ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم اس لیے دی گئی کہ جہاں سے برائی شروع ہوتی ہے، وہیں تم اللہ کی پناہ میں چلے جاؤ تاکہ اللہ تعالیٰ شروع ہی میں تمھیں اپنی پناہ میں لے لے۔ جس سے نہ وہ وسوسہ دل میں جگہ پکڑے گا، نہ بعد کے مراحل کی نوبت آئے گی۔

فائدہ ③ وسوسہ ڈالنے والوں کا شر صرف ایک ہی قسم کا نہیں بلکہ وہ کئی طرح سے آدمی کو راہ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم نے اس کی کئی صورتیں بتائی ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ آدمی کو صریح کفر و شرک اور اللہ اور اس کے رسول کی بغاوت اور دشمنی پر آمادہ کرتے ہیں۔ اگر اس میں ناکام ہوں اور آدمی ایمان پر قائم رہے تو وہ اسے دوسرے شر یعنی بدعت میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدعت میں مبتلا کرنا انھیں آدمی کو بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا کرنے سے بھی زیادہ پسند ہے، کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جسے آدمی نیکی سمجھ کر کرتا ہے۔ اگر وہ سنت پر قائم رہے تو اسے کسی نہ کسی کبیرہ گناہ سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خصوصاً اگر وہ دینی عالم ہو، تاکہ بدنام ہو کر دین کا کام نہ کر سکے۔ اگر اس میں بھی کامیاب نہ ہوں تو چھوٹے گناہوں کی رغبت دلاتے ہیں تاکہ وہ معمولی سمجھ کر ان کے بوجھ میں دب جائے، یہ بھی نہ کر سکیں تو نیکی کے کاموں سے ہٹا کر ان کاموں

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶

جنوں اور انسانوں سے۔⑥

میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں، جن میں نہ ثواب ہے نہ عذاب اور اس طرح اس کی عمر برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر وہ اپنے وقت کو بے کار کاموں میں لگانے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوتو نیکی کے بڑے کام سے ہٹا کر چھوٹے کام میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً دعوت و جہاد سے ہٹا کر نفلی نماز روزے میں لگا دیتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو دل میں ریا یا اپنے عمل پر غرور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی صورت ان کے قابو میں نہ آئے تو شیطان اور اس کے وہ چیلے بیشمار طریقوں سے اسے بدنام کرنے اور تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ نہ ہو سکے تو اسے غصہ دلا کر فہم وشعور سے بیگانہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت بھی اگر وہ اللہ کی پناہ میں چلا جائے تو ان کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ﴾ (الاعراف: ۲۰۰) ”اور اگر تجھے شیطان کی طرف سے کوئی چوکا لگے (یعنی شیطان تجھے غصہ دلائے) تو اللہ کی پناہ مانگ“ غرض موت تک یہ دشمن اپنی دشمنی سے باز نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آخر وقت تک اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین!

آیت⑥ لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالنے والے شیطان جن بھی ہوتے ہیں اور انسان بھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ ..... الخ﴾ (الانعام: ۱۱۲) ”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو دشمن بنا دیا“۔

اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے ساتھ ایک جن شیطان اور ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے شیطان کا کام برائی کا وسوسہ ڈالنا اور فرشتہ کا کام بھلائی کا الہام کرنا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنوں میں سے اس کا ایک قرین (ساتھی) مقرر کر رکھا ہے۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! (ﷺ) اور آپ

کے ساتھ بھی وہ مقرر ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں میرے ساتھ بھی ہے مگر وہ تابع ہو گیا ہے مجھے خیر کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیتا۔ (صحیح مسلم،کتاب صفة القیامة، باب تحریش الشیطان ......الخ) صحیح مسلم کی اسی حدیث کی سفیان کی روایت میں ہے کہ (ہر آدمی کے ساتھ) جنوں سے اس کا قرین (ساتھی) اور فرشتوں سے اس کا قرین (ساتھی) مقرر کیا گیا ہے۔(مسلم حواله سابقه)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان انسان میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الاحکام) شیطان اور اس کا جنی قبیلہ انسانوں کی نگاہوں سے مخفی رہ کر فتنہ انگیزی کرسکتا ہے اور کرتا ہے (الانعام :۲۷) رہے انسانی شیطان تو وہ ہمیشہ چھپ کر تو حملہ آور نہیں ہو سکتے، مگر اپنی باتوں اور طرز عمل سے وسوسہ ڈالتے اور دل میں برائی کا بیج بو دیتے ہیں۔

دوسرے وسوسہ ڈالنے والوں کے علاوہ انسان کا اپنا نفس بھی وسوسہ ڈالتا ہے۔ اس کی غلط خواہشات اور بد اعمالیاں اسے برائی کے لیے اکساتی اور ابھارتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ﴾ (ق : ١٦) ''ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو کچھ اس کا نفس وسوسہ ڈالتا ہے''۔رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے: «وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا» (نسائی، النکاح حدیث : ١١٠٥ وصححه الالبانی) ''اور ہم اپنے نفس کی برائیوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں''۔ان تمام وسوسہ ڈالنے والوں سے خواہ وہ شیاطین الجن ہوں یا شیاطین الانس یا خود آدمی کا نفس ہو، اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے کیونکہ وہی ان کے شر سے بچا سکتا ہے۔